

۱۹۴۵ء کے

بہترین افسانے

انتخاب
سید قاسم محمود

الیاں

پبلیکیشنز • لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اول ۱۹۶۶ء

طابع : اشرف پریس ، لاہور

ناشر : محمد حنیف رامے

البیان ، چوک انارکلی ، لاہور

ترتیب

- ۷ دیباچہ، سید قاسم محمد،
- ۱۔ نیم کے پتے، آغا بابر، ۹
- ۲۔ بڑا تعجب، احسن فاروقی، ۲۱
- ۳۔ گلہ ستر خار، احمد ندیم قاسمی، ۲۷
- ۴۔ اعتراف، اشفاق فاطمہ، ۵۵
- ۵۔ ۳۱ مارچ، انشطار حسین، ۷۵
- ۶۔ مجازی خدا، بانو قدسیہ، ۹۱
- ۷۔ چٹان، حجاب امتیاز علی، ۱۲۱
- ۸۔ سواری، خالدہ اصغر، ۱۳۹
- ۹۔ راستہ، خدیجہ مستور، ۱۶۱
- ۱۰۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، راجندر سنگھ بیدی، ۱۸۱
- ۱۱۔ دل دریا، شردن کمار ورما، ۲۱۱
- ۱۲۔ میٹھا کڑوا جھوٹ، علی عباس حسینی، ۲۲۹
- ۱۳۔ جب سوز عشق جاگا، عنایت اللہ، ۲۵۲
- ۱۴۔ تجرتا، کرشن چندر، ۲۹۵
- ۱۵۔ راضی نامہ، مسعود مفتی، ۳۱۱

پیش لفظ

۱۹۶۵ء کو یک عجیب سال تھا۔ کم از کم اردو افسانے کے لحاظ سے۔ یہ بجائے بارہ ماہ کے آٹھ ماہ پر مشتمل تھا۔ باقی کے چار ماہ (دسمبر تا دسمبر) اُس جنگ کی نذر ہو گئے جو اُن دو ملکوں میں لڑی گئی جہاں اردو افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ ان چار ماہ کی جھڑپوں شدید اور پرحمہ زندگی اپنی صورت افسانے کے آئینے میں نہ دیکھ سکی۔ شاید ۱۹۶۶ء میں دیکھ لے یا ۱۹۶۷ء میں دیکھ لے۔ سال یہ جنگ اور افسانے کے اُتھتہ تعلقات پر کچھ کو بنا بھی قبل از وقت ہے۔ ہم تو صرف یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ۱۹۶۵ء کے صرف آٹھ ماہ کے اُن مختصر افسانوں کا انتخاب ہے جو پاکستان اور بھارت کے اُن ادبی رسائل میں طبع ہو کر منظر عام پر آئے جن کے مطالعے کے بغیر افسانوں کا کوئی انتخابی مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

نذیری لاہور نقد، لاہور سوربرا (لاہور) ساقی (کراچی)
 انوار (کراچی) سیپ (کراچی) نیا دور (کراچی) شاعر (پٹی)
 تلاش (دہلی) شاہکار (لاہور) ادب (لیٹ لاہور)
 (اگست کے بعد سلسلہ ڈاک منقطع ہو جائیگی جب سے بعد اسی رسائل پاکستان نہ آسکے، اس لیے اُن کا مطالعہ نہ کیا جاسکا)

انتخاب کے لیے دو طریقے اختیار کیے گئے

پلا واسطہ: مرتب نے تمام دستیاب ادبی رسائل میں چھپے ہوئے تقریباً ۲۵۰ افسانے کا فرداً فرداً مطالعہ کر کے بعد میں فہرست تیار کی جو ۲۴ افسانوں پر مشتمل تھی۔ نظر ثانی کے بعد دوسری فہرست بنانے کا وقت آیا تو ۱۱ افسانوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور انتخاب سے دستبردار ہو گئے۔ ۲۵ افسانوں کا ایک جلد میں سامنا دھما رہا تھا، اس لیے تیسری فہرست بنانا ضروری ٹھہرا۔ یہ تیسرا مرحلہ تھا۔ سبھی افسانے اپنی کسی نہ کسی انفرادی خصوصیت تک پہنچے تھے۔ ہم رتبہ تھے۔ ایک کو دوسرے پر اس انداز میں ترجیح دینا کہ ایک کو نظم زد کرنا پڑے، مرتب کے لیے سخت نفسیاتی آزمائش بن گیا۔ منتخب افسانوں کا مزہ تو بہت زیادہ غور و خوض سے مطالعہ کیا گیا اور انتہائی دقت اور مصلحتی کے احساس کے ساتھ دس افسانے مناسب ضخامت

ہر قربان کر دیئے گئے، جہی کے نام یہ ہیں :-

داردات (طراح میزا) - زمین کا ورد (اقبال متین) - رنگیں باویں کا پنگ
 (کرتار سنگھ ڈگل) - کرب (نجمہ محمود) - اکیلی اور غریب (عمر انجاری) - گنبد
 (احمد شریف) - لابیہم (المرحوم) - ڈانٹ (نگہت مرزا) - بوڑھا اور لڑکا
 (فہیدہ ریاض) - ہاتھ (میزنا ریاض) -

بالواسطہ :- ادبی رسائل کے مدیران گرامی اور افسانہ نگاروں کے علاوہ پنجاب
 یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے، ایم اے اردو کے اُن طلباء و طالبات
 سے انتخاب میں مدد لی گئی جس کے خصوصی مطالعے کا موضوع افسانہ ہے۔ سب نے بڑے
 خلوص سے میری رہنمائی کی اور دوبارہ رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی اپنی فہرست سے
 لوازا۔ ان فہرستوں سے اپنی فہرست کا موازنہ کرنے سے انتخاب کی صحت کا یقین ہوا اس
 سلسلے میں سر سہیب (شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے خاص طور پر میری مدد کی اور
 انھوں نے اپنا کافی وقت اس کام میں صرف کیا۔

انتخاب کے دونوں طریقے استعمال کرتے وقت ایک بات واضح طور پر مرتب کے
 پیش نظر رہی ہے کہ یہ انتخاب کسی ایک مکتب فکر یا ایک نسل کا ترجمان بن کر نہ رہ جائے۔
 اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ فکر کا کوئی ترجمان جس نے فنی صورت اختیار کر لی ہے
 اسے فروغ نہیں ہونا چاہیے اور ایک طرف روایت، اور دوسری طرف روایت کے
 سامنے میں جو نئے نئے ترجمانات خیر محسوس طور پر ابھر رہے ہیں، ان سب کا اس
 انتخاب کو آئینہ ہونا چاہیے۔

آخر میں ایک ضروری فرض سے بگڑوش ہونا چاہتا ہوں جہی افسانہ نویسوں کی۔
 تحریریں اس مجموعے کی زینت ہیں، میں ان کا شکریہ ادا اور احسان مند ہوں۔

سید قاسم محمود

نیم کے پتے

یہ بات تو اس پر واضح تھی کہ محنت کئی تہ ہوتی اور سچ و سچ گفتاریوں سے
 بنی ہوئی ہے مگر یہ کہ عورت پہلے لڑے، پھر کوسے پھر طعنے دے، پھر طرائف کو جنگ
 میں تبدیل کر دے اور مرد پر اتنے دستی ہم بھینکے کہ اُس کی روح کے پیچھے سے
 اُڑا اُڑ کر ماضی حال اور مستقبل کی کھونٹیوں پر لٹک جائیں اور جب ان میں سے
 قطرہ قطرہ ہو کر حسرتوں کا خون ٹپکنے لگے تو مجبور و مقہور مرد سے پھر وہ پت لپٹ
 کر شروع سے اخیر تک پورا پورا کماٹے اور پھر اس طرح سکون سے سوجھنے
 جیسے ان دونوں میں ٹھنی نہ ہو۔ اس کا اُسے علم نہ تھا۔

طوفان گزرنے کے بعد ابڑے ہوئے اُشیالے کو بنا نا خود اعتمادی
 کا عزم ان جوتا ہے مگر جب بار بار سیلاب اور آندھیاں آکر دیواروں کو
 گرائیں اور سامان بہا لے جائیں تو آدمی تھک بار کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا ہے
 ہریداکئی مہینوں سے عثمان کے پرنے سے اُڑا رہی تھی بھینیں وہ پھر جوڑ لیتا
 یہ اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ ہریداکسے اندر بڑی اور غصے کی چنگاریاں بھری
 رہیں مگر عثمان سرسرمقاہمت بنا رہتا۔

کچھ اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے ہریداکو امن اور راحت کی

خاطر ملتا مگر ہر دیا گھر پہنچتے پہنچتے آگ بگولا ہو جاتی غصے کی چنگاریاں چھپا
 لیتی جورات کو تار بن کر پھوٹتیں اور خطرناک بارود کے پٹاخے اور ٹوٹکے بن
 کر عثمان کے مردانہ وقار اور انا کے لیے خطرہ کھڑا کر دیتیں۔ وہ اس دم دم
 بھڑکنے والی آگ سے اپنی رُوح کے جلے کو بچانے کی بار بار کوشش کرتا
 مگر پے در پے دھماکے اُسے عاجز کر دیتے ایک چنگاری ایسی لگتی کہ جلد ہی
 کر رکھ ہو جاتا۔

”تمہارا شمشاد کی بیوی سے تعلق ہے۔ میں نے اُس کی شہرت بھی سنی
 آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ افضال کی بیوی تمہارے ساتھ اتنی بے تکلف کیوں
 ہے؟ تم کسی کو تو چھوڑ دو۔ دائی بھی چار گھر چھوڑ دیتی ہے۔ عثمان کی رُوح کے
 پُڑے سے اُڑتے، گھر کو آگ دکھا دی جاتی۔ احساسات اُلجھنے لگتے۔ مجبور اور
 دیوانی پر چھائیاں رُوح کے گرد ناچنے لگتیں۔ وہ اپنے مردانہ وقار پر ان حملوں
 کی تاب نہ لا سکتا۔ اُس کی سوچ جواب دے جاتی۔ اس کا ذہن رُک جاتا۔
 وہ نڈھال اور بے بس ہو کر کرسی پر گر پڑتا۔ اُس کی جھولی میں مڑھلے ہوئے
 بچوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ بے بسی سے ستاروں کو دیکھتا، رات کے
 ستارے کو سنا۔ اس کے اندر زخم کھاتے ہوئے سانپ کا انتقام جاگتا پھر
 اس کا بیچ و تاب اور اضطراب دیکھنے کو کبکشاں کی چڑ سکون جھللا ہٹ بیسے
 اُس پر ٹھیک جاتی۔

صفائی کی گواہیاں شہادتیں اور بیانات تکلان سے چور چور ہو کر گر

پڑتے۔

”تمہیں مجھ سے پیار نہیں رہا“

”کون کہتا ہے؟“ عثمان ہویدا پر جھک جاتا۔ کبکشاں کہہ سکا کہ وہ وہیں اپنی جگہ جا کر مسکرانے لگتی۔

رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہوتے بہت گہرا ہو جاتا۔ پھر صبح کا ستارہ نمودار ہوتا تو پھول اور کاٹا ایک جان ہو گئے ہوتے۔

ہویدا عثمان کے بازوؤں میں بڑے سکون سے سوئی پڑی ہوتی۔

جب سے عثمان کی جھولی میں شمشاد اور افضال کی بیویوں کو ڈال دیا گیا تھا۔ اُن عورتوں سے عثمان کے لیے نگاہ ملا۔ مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کہیں دیکھ لیتا تو نگاہیں دوسری طرف پھر لیتا۔ اُس نے ہویدا کی خوشی کے لیے شمشاد اور افضال سے ملنا ترک کر دیا مگر ہویدا اب بھی مطمئن نہ تھی ہر عورت اس کی بیرنگی جس جگہ جا۔ نے وہ عثمان پر نگاہ رکھتی کہ وہ کسی عورت سے دو باتوں سے تیسری بات نہ کرنے پائے اور اگر کسی سے ذرا لمبی بات ہو باقی تو عثمان کی شامت آجاتی۔ کیا کہتی تھی؟ تم نے کیا کہا؟ تمہیں کیا ضرورت تھی اُس سے بات کرنے کی؟

مسز مرزا ہویدا کی نئی دوست بنی تھی۔ ایک پارٹی پر عثمان نے اس سے اتنا پوچھ لیا ”مرزا کہاں ہیں؟“
”کراچی“

”کب آئیں گے کراچی سے؟“

اُس دن تاروں بھرے آسمان کے نیچے دونوں اپنی اپنی آرام کرسیوں

پراس طرح مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے جیسے بڑا سخت رن پڑنے والا ہو۔
 ہریدانے حملہ کیا، ہتھیں کیا ضرورت تھی ذہل و معقولات کی مرزا کہاں
 ہیں اور کراچی سے کب آئیں گے۔ کیا تم مرزا کی عدم موجودگی میں مسز مرزا کا خاوند
 بننا چاہتے ہو؟

عثمان کے انا کی گردن ٹوٹنے ٹوٹتے پتی۔ حملہ آور خود کرسیوں پر نہ بیٹھے
 ہوتے تو کرسیاں پل باتیں۔

”دیکھ ہویدا زبان قابو میں رکھ۔“

”تم دونوں بھائی حرامزادے ہو۔“

عثمان تڑپ اٹھا۔ اُس کا ہاتھ ٹماچے کے لیے ہوا میں لہرا کر رک گیا۔ مگر
 عثمان کا گریبان ہویدا کے ہاتھ میں آکر چری جی ہو گیا۔

وہ عثمان کے کتنی قریب ہو کر کتنی دُور ہو گئی تھی عثمان نے اپنے ننگے سینے
 کے ساتھ اُسے چٹالیا۔ غصے اور زہر کی چنگاری پر روت لڑ گئی۔ وہ سسکیاں
 بھر کر رونے لگی۔ ایکایک چاند پر بدلی کی جھال لٹک گئی۔ نسوانیت کے ابریشمی
 پر تو کے بند کھل گئے۔ پھر عثمان کی مجروح اور لنگڑی رُوح اُس سے ریلنے
 چلنے میں لگ گئی۔

وہ اپنی چار پائی پریسٹ کر جذبات کے اس ٹولیدہ و پیچیدہ سد و جزر
 کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا جو اس کے فہم و ادراک سے ماوراء تھا۔ اس
 اُد پر سے ٹھونسے ہانے والے میکائلی انداز محبت سے اُس کی روح کا
 تمام حفاظ اور ص کی تمام حلاوت رخصت ہو چکی تھی۔ مجروح جذبات کے

ہونے ہوئے محبت اُن کو کیسے آئے؟ یہ کڑی آزمائش اُس کے لیے سوا اب نہ
ہو گئی تھی جیسے شکستہ پاغزال سے کوئی شقی القلب چو کڑیاں بھرنے کو کہلا
غزال کی آنکھوں میں بے بسی اور مجبوری جھانکنے لگے۔

وہ سوچنے لگا، کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ شہرِ حرن کی بیویاں
دوسروں سے لڑتی جھگڑاتی ہوں گی مگر اپنے خاوندوں سے صلح رکھتی
ہوں گی۔

”میں کہتا ہوں یہ صاحب کا حوصلہ ہے۔ اپنی جبر و ایسی ہو تو گردن
کاٹ کے رکھ دوں، سات سلام ہوں ایسی نوکری کو“ ڈرامہ نویس نے روز کی
تناہی دیکھی تو نوکری چھوڑ کر چل دیا۔

ایک روز عثمان باغیچہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ہویہ پاس آکر بیٹھ
گئی۔ ایک لمحہ کے لیے عثمان خوش ہوا کہ زندگی کتنی اچھی ہے ہویہ نے نظر
گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور بولی:

”اچھا مالن کو دیکھ رہے ہو۔“

”کیا؟ عثمان بھونپکا رہ گیا۔

”وہ سامنے بیٹھی بچے کو چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے، حرامزادی
کے لیے جیسے یہی جگہ رہ گئی تھی۔“

عثمان نے ہڑٹ کر دیکھا۔ دُور پردوں کے پیچھے مالن گدی میں بچے کو
یہ بیٹھی تھی۔ مگر اسے یہ اب معلوم ہوا تھا۔

ہویدا اُٹھ کر نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل دی۔ عثمان نے دل میں کہا ہویدا کی چال کتنی اچھی ہے۔ پھر قوموں کی چاپ سن کر اُس نے اخبار پھرے کے سامنے سے بٹایا تو ہویدا اور مالن اُس کی طرف چلی آ رہی تھیں مالن کی قبض پر جہاں اُس کی دودھ سے اُبلتی چھاتیوں کی اکڑا ہٹ تھی گیلے دودھ کے دھتے تھے جیسے وہ بچے کے منہ سے دودھ کھینچ کر چلی آئی ہو۔

”میرے میاں تیرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے پاس بیٹھ جا۔ کرسی پر بیٹھ۔“

ہویدا کی زبان میں سخت زہر بھرا ہوا تھا۔

مالن عاجزانہ طور سے عثمان اور ہویدا کی طرف تتر بتر دیکھ رہی تھی عثمان کے جذبات ایک دم بھڑک اُٹھے۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر مالن کے سامنے ہویدا کے منہ پر دو تین جڑ دے کہ لوہے ہوتا ہے نتیجہ مرد کے انا کا بار بار پتی بسوں سے داغنے کا۔ مگر اس کلنراج بھروسے کی دھجیاں جوڑنے اور غصہ پی جانے کا کارنامہ سراسر انجام دے گیا۔

اگلے روز صبح صبح مالی اُٹھ کر اُس کی بیوی نے کوارٹر خالی کر دیا۔ مالی کے چلے جانے سے ہویدا کو کوئی تکلیف نہ ہوئی مگر ڈر اور کور کے چلے جانے سے بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ پردوں کی کوٹھی کا ڈرائیو ایک جان پہچان واسے کو لے آیا۔ اور بولا: بیگم صاحب، دلاور خاں ایک انگلش کمپنی میں ملازم تھا بڑی اچھی گاڑی چلاتا ہے مگر اب بُرے دن آ پڑے ہیں۔ آپ جو تنخواہ دیں گی اُسے منظور ہوگی۔“

ہویدانے پہلے گاڑی چلا کر دیکھی پھر سو روپے تنخواہ مقرر ہو گئی۔ لانے والے نے کہا: اس کی بیوی بچے کسی پرانے گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر اسے ملازموں کے گوارٹروں میں جگہ مل جائے تو بے فکری ہو جائے گی۔

”ہاں کیوں نہیں۔“

دلاور خاں بیوی اور چار بچوں کے ساتھ کوارٹر میں رہنے لگا۔ کپڑے بچوں کے تن پر کہاں تھے۔ دو بڑے گندے سے پتھر سے پہنے پھرتے۔ دو چھوٹے ننگے دھڑنگ پھر کرتے۔ بیوی برقع پہنتی اور سخت پردہ کرتی عثمان دورے سے آیا تو اس نے کوٹھی کے احاطے سے گزرنے والے ان گورنرے گورے گر میل سے اٹھے بچوں کو دیکھ کر پوچھا: ”یہ کون ہیں؟“

”ڈرائیور کے بچے ہیں۔ آپ کے پیچھے میں نے ڈرائیور رکھ لیا ہے۔“

”گاڑی ٹھیک چلاتا ہے؟“

”جی ہاں۔“

ڈرائیور نے آکر سلام کیا۔ عثمان نے اس کی پہلی نوکریوں کا آگلا بچپا پوچھا پھر لائسنس دیکھ کر بولا:

”تمہارے بچے بہت ہیں، انہیں صاف رکھا کرو کیا تمہارا کوئی بچہ منہ نہیں دھوتا بڑے گندے رہتے ہیں۔“

”نہیں صاحب اب صاف رہیں گے۔ اصل میں غربت بڑی رہی ہے سرکار۔ بڑا لڑکا گیارہ بارہ برس کا ہے۔ اگر اسے کہیں نوکری دلا دیں تو دعائیں

دوں گا۔

”کرادیں گے۔ جاؤ گاڑی صاف کرو۔“

دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی ہویدا کے سونے کے کمرے کے رخِ مخی۔
جب عثمان کے دستِ چپے جاکے بعد کھلتی تو گوری چٹی عورت نظر آتی، جس کا
لباس اکثر شرخ ہوتا جس میں وہ سونے کی طرح دھکتی رہتی۔
ایک دن کار میں ہویدا نے دلاور خاں سے کہا، ”ڈرائیور تمہاری
بیوی بڑی خوبصورت ہے۔“

”جی ہاں بیگم صاحب، پانچ بچے پیدا کرنے پر بھی اُس کی کاٹھی بڑی
مضبوط رہی ہے۔“

”تمہارے چار بچے ہیں یا پانچ؟“

”جی ایک مر گیا تھا۔“

دُھوپ کا رنگ اب زرد ہو گیا۔ اور تیزی بھی کم ہونے لگی تھی۔ رات
کو خشکی ہو جاتی۔ کوئے درختوں اور منڈیروں پر کائیں کائیں کرتے پھرتے
ایک دن عثمان اور ہویدا برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ہویدا اُڑنکوں میں سے
گرم کپڑے نکال نکال کر دیوان پر رکھ رہی تھی، جن میں سے اتکا دکھائی دے
کی گویاں نیچے گر رہی تھیں اور بچے سال بھر آنکھوں سے اوجھل بند
رہنے والے کپڑوں کو دیکھ دیکھ کر اٹھا اٹھا کر خوش ہو رہے تھے۔
کچھ پشکل مال ہویدا نے ایک طرف ڈھیر کر دیا۔ عثمان کا ایک پرانا کٹ

جیسے پٹناروہ ترک کر چکا تھا اُس نے اُٹھا کر پوچھا: یہ تو آپ نہیں پہنتے
ڈرائیور کو دے دیں۔

”دے دو۔“

اُس نے ڈرائیور کو بلوا کر کہا: ڈرائیور یہ ہمارے بچوں کے کپڑے ہیں
تمہارے بچوں کو آجائیں گے۔ یہ کوٹ تمہارے لیے ہے۔

ڈرائیور گھڑا اُٹھا کر دعائیں دیتا چلا گیا۔ کوارٹر کی طرف سے بچوں
کا شور سنائی دیا جو خوشی سے بے چین تھے۔ پھر ڈرائیور کی آواز سنائی
دی: ”او کیٹنوں ابھی رہنے دو جب سردی شروع ہوگ پھر پٹناروہ۔“

گھٹنوں چلتا کود کا نتیجہ پودوں کی اوٹ سے باہر نکل آتا تو اُسے اُٹھانے
کو جب لپکتی تو ڈرائیور کی بیوی کی بھلک دکھائی دیتی۔ ایک روز سیریا
نے دیکھا کار میں بیٹھتے وقت عثمان کی نگاہیں کوارٹر کی طرف اُٹھی تھیں۔ پھر یہ
واقعہ ہوا کہ عثمان دفتر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا کہ ادھر کھڑکی کا
پردہ اُٹھا ہوا تھا ادھر دلاور خاں کے کوارٹر کی کھڑکی کے پٹ کھلے تھے۔

”میں اس حوالہ دے دو تو آج ہی نکال باہر کرتی ہوں۔“

”کس کو عثمان نے شیشے میں نکلتا باندھتے ہوئے پوچھا۔

”جس کو آپ دیکھ رہے ہیں جس نے کھڑکی کھول رکھی ہے۔“

ہویدا ایک دم سے باہر چلی گئی اور اس نے تنگ آکر آواز دی: ”ڈرائیور
ادھر آؤ۔“

دلاور خاں جو گاڑی صاف کر رہا تھا جی کہ کر لپکا۔ ہویدا نے اس سے

کہا، میں نے پہلے روز کہہ دیا تھا کہ یہ کھڑکی صاحب کے دفتر جانے کے بعد کھلے گی، کرا تھا نا۔ ابھی صاحب دفتر نہیں گئے۔ تمہاری بیوی نے یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے؟

اُس نے جا کر کچھ کہا۔ کھڑکی کھٹ سے بند ہو گئی۔

عثمان کو جب گاڑی چھوڑ آئی تو ہویڈا بازار پر چلی گئی۔ جب آئی تو سکول کا وقت ہو گیا تھا اس نے ڈرائیور کو بچوں کو لینے سکول بھیج دیا۔ ملازم کو دلاور خاں کی بیوی کو بلانے بھیجا اور خود برآمدے میں بیٹھ گئی۔ لوگرنے آکر کہا، وہ کہتی ہے مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

”اچھا یہ بات ہے۔“ ہویڈا غصے میں اُٹھی اور دو قدموں میں ملازموں کے کمرہ وڑوں تک جا دھمکی۔ دلاور خاں کی بیوی برتن دھو رہی تھی میں نے تمہیں بلا بھیجا تھا۔ تم نے کہا مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی نواب زادی ہو تم مجھے پتہ نہ تھا اگر اتنا پتہ ہے کہ تم وقت بے وقت کھڑکی کھول کر اپنا حجب میرے بیاں کو دکھاتی رہتی ہو۔ میں نے سوچا تھا صاحب سے آج تمہاری ملاقات کرا دوں، دونوں کی جھڑپنی دُور ہو جائے۔“

دلاور خاں کی بیوی کا رنگ لمحہ بھر کے لیے پیلا پڑ گیا۔ وہ ہاتھ دھو کر اُٹھ بیٹھی اور بولی، میرے خاوند کو تو جو بن دکھاتی پھرتی ہے، تیری بے چینی دُور ہو جاتی ہے جب کندھے سے کندھا ملا کر میرے خاوند کے ساتھ پڑھ بیٹھتی ہے گاڑی میں اور گھومتی پھرتی ہے اکیلی۔“

ہویدا کو شسوس ہوا جیسے اُس نے غلط عورت کو ہاتھ ڈال دیا۔ زیادہ بات کی تو زبان کھینچا دوں گی۔

”چنے چنے منہ دھو کے آ۔“ دلاور کی بیوی نے ہوا میں ہاتھ پچائے۔
 ”بڑی احسان فراموش ہو کیسبی میں نے رحم کھا کر تیرے بچوں کو کپڑے دیے۔ ہویدا فزائرم ہو کر پینترا بد لئے گی۔

”میرے بچوں کو! اپنے یار کو کوٹ دینے کی خاطر دیے ہوں گے۔ پر تمہیں بتا دوں تیرے اوپر حقو کے گلابھی نہیں میرا خاوند۔ اپنا سینہ دیکھ دلا ہوا لوگر مال اور سہ دیکھ روٹی کا کالا۔“

اُس نے سینہ چھلکایا۔ پھر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ ہویدا کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ بڑی جرات کر کے کہہ سکی۔ ”بے حیا۔“
 ”بے حیا تم۔ اپنی کھینچی ہوئی کانیاں دیکھ۔“

ہویدانے عاجزی سے نظر پھرا کر دیکھا۔ بھنگی بادرچی اور مشاپچی سب باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہویدانے مشاپچی سے کہا، ”تجارت واپس کو بلا لاؤ اس کیسبی کا دماغ ٹھیک کرادوں۔“

”بلاؤ جلدی بلاؤ۔ میں کہوں گی میرے خاوند سے تعلق ہے تمہارا اور تمہارا کپڑوں کا احسان۔“ چنے۔

اُس نے کپڑوں کو دھیر کیا۔ مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگادی۔ خود حقے میں آگ بگولا بنی پاس یوں کھڑی ہو گئی۔ جیسے بے نیام تلوار خدا کے میرے بچے ننگے پھرے پر تم جیسی کا دیانہ پنیں۔“ کپڑے بٹیر بٹیر جلنے لگے اور وہ کوک بھرے

کھلونے کی طرح بولتی رہی۔

دلا درج سب سکول سے بچوں کو لے کر آیا تو تانگے میں کہا رخانہ لدر رہا تھا وہ اپنی بیوی کے گستاخانہ سلوک کا سہ کر بڑے غصے میں اپنے کواڑ کی طرف بڑھا جیسے بیوی کو آج پیٹ ڈالے گا۔ مگر ٹھنڈے قدم واپس آکر بولا۔ آپ نے میری بیوی کی عزت پر الزام لگایا ہے۔ یہ مجھ صاحب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔
 تانگہ ہویدا کے سینے پر مونگ دنا، کوٹھی کی بھری کو چراتا ہوا نکل گیا۔ بچے ہویدا کا منہ کھٹنے لگے۔ جسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تانگے میں اُس کی عزت کا دیوار پٹ کر نکل گیا۔

عثمان آیا تو ہویدا چُپ چُپ بیٹھی تھی۔ عثمان نے ہویدا کے اتارے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔ تم اس طرح چُپ چُپ کیوں بیٹھی ہو؟
 ہویدا کی آنکھوں میں نم آگیا۔ اس نے سارا واقعہ سُنا ڈالا۔
 ”اوریہ لوکر کھڑے اُس عورت کا منہ دیکھتے رہے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔“
 ہویدا رو ہانسی جو کر بولی۔ کچھ نہیں۔“

اُس نے ہویدا کو سینے سے لگایا اور نگاہ اس کی اُس راکھ پر جا پڑی جہاں سے جیتھرے کے سگنے سے کالے دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لیکر اوپر کو اٹھ رہی تھی جسے دیکھ کر عثمان کے پیٹ کی گٹھری میں سے خوشی کا ایک بیٹھا بیٹھا سا بدلا اچھا وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ پھر اس نے ہویدا کا سر چوم لیا اور بولا۔ دفع کرو۔ تم سمجھو کوئی بات نہیں ہوئی۔“

بڑا تعجب

مجھے خود بڑا تعجب ہے کہ سب کچھ کیا ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سب کچھ خواب میں ہو گیا، مگر سب کچھ حقیقت ہے، ہاں سب بالکل حقیقت ہے۔ دو بچے جو چکے تیسرا بیٹ میں ہے۔ میں اب ڈاکٹر سٹھ برس کا ہو جاؤں گا اور وہ کوئی سو لہ کی ہوگی۔ مگر یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ بعض وقت سوچتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ سب چیزیں حقیقت ہیں۔ میری پہلی بیوی کے بچے — اور اُن کے بچے — یہ گھر وہی ہے جس میں ہمیشہ رہا یہیں سے سب بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ یہیں سے پہلی بیوی کا مُردہ اُٹھا اور یہیں وہ خواب کا عالم طاری ہوا جواب تک جاری ہے۔

وہ میری سب سے چھوٹی سالی کی سب سے چھوٹی لڑکی ہے! بڑے تعجب کی بات — وہ میرے بڑے لڑکے کی بڑی لڑکی سے چھوٹی ہے، مگر وہ میرے ساتھ رہی ہے، بڑی خوش ہے۔ دھڑا دھڑا بچے ہو رہے ہیں کوئی سال نالی نہیں گیا ہے۔ کیا میری سچ سچ اس سے شادی ہو گئی ہے۔

کیا میرے یہ بچے ہیں؟ کیا میں زندہ ہوں یا کسی اور دنیا میں ہوں کیا میں

سور ہاہوں اور جب جاگوں گا تو یہ سب خواب کی طرح بے حقیقت نظر آئے گا۔

دائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کر دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہاں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ساری زندگی خواب تھی جو اس تعجب نینر خواب کی طرف اُرسی تھی۔ اس کی ماں کوئی پہنچ یا سات برس کی ہوئی جب میری شادی ہوئی۔ وہ مانجھلے کر آئی تھی۔ گوری گوری گول منہ کی لڑکی کار چوہی کپڑوں میں دہی جا رہی تھی اس نے چھوٹے سے ہاتھ سے میرے اٹن لگائی اور شراگمی میری بہری نے کوئی بارہ تیرا برس چھوٹی بتائی جاتی تھی۔ مجھ سے کوئی پندرہ برس چھوٹی ضرور ہوگی۔ مانجھے کے دن لوگوں نے کہا کہ یہ منہ کی لڑکی ہے اور بیوی مرحوم سے وہ بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ شادی کے بعد وہ برابر اپنی بہن کے پاس آتی رہی بہن کے بچوں کو کھلاتی رہی۔ جب بہن زچہ خانے میں جوتیں یا زیار جوتیں تو سارا گھر سنبھال لیتی۔ میری ساس مرحومہ کہا کرتی تھیں، "بڑا بہنوئی باپ کی جگہ ہوتا ہے۔" اور میں نے ہمیشہ اپنے کو اس کے باپ کی جگہ سمجھا۔ ایک دن اس کو گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ وہ برقہ اوڑھے پیچھے پیچھے تھی میں آگے آگے میرا ایک دوست گرومن تھا، راستے میں ملا۔ بولا بھابی ہے ساتھ۔ میں نے کہا، نہیں اس کی بہن ہے۔ کہنے لگا، میاں یہ سالی بانی ٹھیک نہیں۔ میں نے ڈانٹ دیا، کیا بکتا ہے۔ اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ غیر میں نے اسے ہمیشہ لڑکی ہی سمجھا اس کی شادی کی، اس کے بچے ہوتے رہے

میرے بچے اس کے بچے سب بڑھتے رہے ساتھ کھیلتے رہے قرون کی باتیں ہیں۔ پوری زندگیوں کے حال ہیں۔ ایک بات بونو کوئی کہے۔ داستان کی داستان ہے مگر اس داستان کا یہ رُخ بدلنا۔ ات، ات کیسا عجیب، کیسا تعجب انگیز، بڑا تعجب ہے۔

خیر میرے بچوں، بچوں کی شادیاں ہوتیں۔ بیوی بھی مرحوم ہو گئی۔ اس کے بھی چار بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ وہ بھی مر گئی۔ ایک یہ لڑکی کوئی چھ برس کی چھوٹی گئی۔ اس کا باپ بھی عزیز ہی ہوتا ہے اور وہ بھی ٹھیک ہی آدمی تھا۔ سال بھر تک وہ اس لڑکی ہی کی دیکھ بھال کرتا رہا مگر ایک دن معلوم ہوا کہ اس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا تھا وہ بند ہو گیا تھا۔ ہے کہ میری عزت داری تو کسی سے تھی ہی نہیں۔ سالی کے بچے تھے۔ مجھے خالو کہتے تھے۔ ہم زلف تھے۔ بھائی کہتے تھے۔ وہ لائے نئی ٹوپی لڑکی، تو ٹھہر سے پردہ کرانا لازمی تھا، رہی اُن کی لڑکی وہ مجھ سے مانوس ہو گئی تھی میرے سب بچے اپنے اپنے ٹھکانے تھے۔ ان کے بھی۔ بس یہ آٹھ برس کی لڑکی رہ گئی تھی۔ یہ اپنے بھائی بہنوں کے یہاں بھی کبھی کبھی چلی جاتی مگر اسے رہنا تھا اپنی سوتیلی ماں ہی کے پاس۔ میں نے دیکھا کہ سوتیلی ماں اس پر زبردستیاں کرنے لگی، وہ میرے پاس آ جاتی اور رو رو کے بیان کرتی۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ اسے پڑھو اور وہ ٹال گئے۔ میں نے کہا آخر چہ میں وہ لگاؤ راضی ہو گئے۔ میں نے اُسے لے جا کے اسکول میں نام لکھوا دیا اور سب خرچ پڑھائی کے دیتا رہا۔ وہ اسکول سے زیادہ تڑا دھری آ جاتی میرے

گھر کو اپنا گھر سمجھتی گھر کے کام کرنے لگتی۔ اکثر یہیں رہ جاتی۔ مگر پھر سی خیر کی بچی
بھئی۔ باپ کے گھر ہی رہنا تھا اسے۔

چار برس یوں ہی گٹ گٹ۔ پڑھنے میں وہ زیادہ اچھی نہ نکلی۔ بہر حال
ساتویں درجہ میں آگئی۔ جوان ہو رہی تھی اور اب اس میں تعجب انگیز تبدیلیاں
ہونے لگیں۔ پہلے پہلے کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ جوان ہوتے ہی سب
لڑکیاں اپنے تئیں سجانے بنانے لگتی ہیں۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ مگر وہ مجھ
سے ایک خاص طریقے پر شرمانے لگی۔ یہ شرماسٹ عجیب تھی۔ مجھ سے شرمانا
اس کی ماں کبھی نہیں شرمائی اس طرح، مگر اس کے شرمانے میں ایک عجیب
معشوقانہ اداسی تھی جس پر مجھے تعجب ہوتا تھا میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کے
دل میں کیا ہے اور پھر میرے دل میں عجیب گدگدائی ہوتی تھی مرد کو عورت
کی طرف فوج ہوتی ہی ہے اور میں عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں تو بند نہیں کر
لیا کرتا تھا مگر کم سن لڑکیوں کو میں اپنی لڑکیوں کی طرح سمجھنے کا قائل تھا۔
جوان عورتوں میں کبھی کوئی بہت اچھی ہوتی تو آنکھ جبر کے دیکھ لیا۔ اس سے
زیادہ کبھی سروکار نہ ہوا۔ بیوی کو مرے ہونے کوئی پندہ برس تو ہو گئے ہوں گے
کبھی دوسری کرنے کا خیال بھی نہ ہوا۔ ساٹھ سے اوپر سن بھی آگیا تھا۔ بچوں کے
پچھے ہو رہے تھے۔ کبھی اگر کوئی بھولے بھٹکے خواہش بھی ہوتی تو یہی کہتا کہ
اب بڑھاپے میں کیا بڑھ چس لگے گی۔ مگر اس کا خاص طریقہ پر شرمانا اور
میرے دل میں خاص قسم کی گدگدائی ہونا بڑی تعجب انگیز باتیں تھیں میں
اکیلا تھا۔ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا یہ کیا ہو رہا ہے اور بڑا تعجب ہوتا

کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اسے میرے اشد یہ کیا ہو لے دالا ہے۔

میں نے یہ عسوس کیا کہ اس کی ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کا سارا بار بچہ پر پڑ جائے۔ پڑھائی لکھائی کے غمچوں کے علاوہ جو ان ہوتی ہوئی لڑکی کو کڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سنگھار کی چیزوں کی بھی۔ وہ سب کچھ مجھ سے مانگنے لگی۔ مجھے ساتھ لے کر بازار لے جاتی اور یہ لے دیکھے اور وہ لے دیکھے، ہر قسم کا سامان لے آتی۔ سوتیلی ماں کے پاس یہ سب سامان لے جانے کو برا سمجھتی۔ میرے ہی گھر رکھ جاتی۔ صبح ہی آتی ناشتہ تیار کرتی، سنگھار کرتی رہتی اور یہیں سے اسکول جاتی۔ میں اپنے اس باہر کے حقے میں بیٹھا رہتا تھا، کرتی یا دوست آ گئے اُن سے باتیں کرنے لگا کبھی اُٹھ کر کسی کے یہاں چلا گیا پھر آ گیا کبھی کوئی کتاب و کتاب پڑھتا رہتا، جب نیند آتی سو جاتا۔ اندر کے گھر کا سارا کام ایک بڑھیا کے سپرد تھا۔ اپنے گھر کی پرانی لونڈی تھی وہ رنگ رنگ کر سب کام کرتی اور کام بھی کیا تھا۔ میرا کھانا پینا اور حقہ بھر کر یہاں رکھ جاتا۔ سدا گھر خالی ہی تھا۔ بڑھیا ایک کونے میں پٹری کھانستی رہتی۔ وقت پر اُٹھ کر کام کرتی پھر پڑ رہتی۔ میں بھی ادھر یا ہر پڑا ہی رہتا۔ مجھے کوئی کام ہی نہیں تھا دینا کا۔

مگر کچھ دنوں کے بعد مجھے عسوس ہوا کہ اس لڑکی نے میرے گھر کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اپنی ساتھنوں کو اسکول سے یہیں لاتی۔ اس کی ہم سن لڑکیاں میرے سامنے سے گزرتی ہوئی اندر جاتیں پھر کچھ دیر کے بعد نکل جاتیں میرے پچھے۔ سب اور شہروں میں ملازم ہیں۔ ان میں سے کوئی بال بچوں سمیت آ جاتا تو وہ

اپنے باپ کے گھر نہ جاتی، ان کی زبان داری بالکل اسی طرح کرتی جیسے اس کی نانا مراد کرنا کرتی تھی۔ آخر وہ سب اُس کے خالہ زاد بھائی بہن تھے ہی۔ جب وہ لوگ چلے جاتے تو وہ بھی اپنے باپ کے گھر چلی جاتی، مگر روز صبح آنا، کہیں تیار ہونا، یہیں سے اسکول جانا اُس کا ورد ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سوتیلی ماں اس کی کھٹکی چوٹی سے بچھڑاتی تھی۔ گھر کا کام کرنا پابندی تھی، بچے کھلوانا پابندی تھی، مگر بھر بھی سیدھی نگاہ دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ باپ نوپل بیوی ہیں ایسے عمو ہوتے کہ اس بیسیر لڑکی کو بھول ہی گئے تھے۔ یہ تو کہیے کہ میں نے پڑھنے میں لگوایا تھا نہیں تو نہ معلوم اس کا کیا سال ہوتا۔

خیر جب وہ اسکول جانے لگتی تو میاں ایک لمحہ کے لیے ضرور دکتی میرے سامنے نقاب اٹھ کر کھڑی ہوجاتی۔ کبھی کہتی آج چار آنے کی ضرورت ہے کبھی آٹھ آنے کی میں نکال کر دے دیتا۔ میں دیکھتا کہ اس کے بال نہایت عمدہ طریقہ سے سجے ہوتے، مُنہ پر سفید اور سُرخ لوڈر مناسب طریقہ پر لگا ہوتا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سرخی لگی ہوتی مگر اس کا مجھے دیکھنے کا انداز عجیب ہوتا۔ نگاہ میں عجیب شرماسٹ کے ساتھ ساتھ ڈھیٹ پن بھی نظر آتا۔ عجیب مشاہدہ تھا بیان کرنا مشکل ہے۔ دن دن بھر سوچا کرتا کہ یہ دکھائی کیسی ہے۔ اللہ میں نے تو کبھی کسی عورت کو اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا۔ آخر اس لڑکی کے دل میں کیا ہے اور پھر بڑے عجیب کے ساتھ مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ پُر اسرار دکھائی میرے دل میں بھی عجیب کیفیات جگا رہی تھی۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے نڈر نہ کر دیکھتی ہوتی باہر کے دروازے تک جاتی پھر رقع کی نقاب چہرے پر

ڈالتی اور غائب ہو جاتی۔

میرا عجیب عالم رہنے لگا۔ اس کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کبھی پہلے کسی لڑکی کی طرف اس طرح توجہ نہیں ہوئی تھی۔ نگاہ ضرور لڑی تھی، مگر وہاں ہوتے ہی شادی ہو گئی تھی۔ پھر بیوی ہی میں غور ہو گیا۔ بال بچوں میں پڑ گیا۔ لڑکیاں بڑی ہوتیں، اگر کسی جوان لڑکی پر نگاہ پڑ بھی گئی تو یہ محسوس ہوا کہ میری بہو بیٹیوں کی طرح کی ہے۔ مگر یہ لڑکی تو میرے سر پر سوار ہوئی جا رہی تھی لاکھ کوشش کرتا، دھیان مٹاتا اور کاموں میں دل لگانا مگر جب دیکھو اس کا چہرہ اور اس کی مخصوص دکھائی آنکھوں کے سامنے اس کی خال ادیاں دونوں گوری پتیلیں مگر اس کا باپ سا نولہ تھا، اس نے اس کی رنگت چھپی سی تھی۔ پوڈر سے اور بھی کھل جاتی تھی۔ یہ رنگت عجیب طرح دل میں گھسنے لگی۔ میں نے کبھی پہلے کسی عورت کی رنگت پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ رنگت گھنٹوں توجہ کا مرکز رہتی۔ سوچنے لگا کہ ایسی دلکش رنگت کبھی دیکھی نہ سنی۔ یہ حسن کا کیا کرشمہ ہے یہ کیا جادو ہے۔ پھر چونکتا اور کہتا کہ مجھے یہ کیا ہوا جا رہا ہے۔ میرے خیالات کہ دھڑکے جا رہے ہیں۔ جی چاہتا کہ اپنا حال کسی سے کہوں، میرے ساتھ بیٹھنے والوں میں میرے ہم سن ہی لوگ تھے مگر ان سے ذکر کرنا میری عجیب سبکی محسوس ہوتی۔ میرے ایک ہم سن نے جوان لڑکی سے شادی کر لی تھی میں نے ان کو بار بار یاد دہاتے ہوئے کہا تھا۔ خوب بڑھ چس لگی ہے۔ اب لوگ یہی بات میری بابت بھی کہیں گے اور پھر سالی کی چھوٹی لڑکی۔ اسے تو اسی بڑی کے برابر مجھ کو باپ نہیں ماننا سمجھتی ہوگی اور میں اس عالم میں بڑا تعجب

ہوتا۔ میں اپنے تئیں سنبھالتا۔ نہیں۔ میں بلند سے بلند اس کی کہیں شادی کر لوں گا۔ مگر نہیں۔ محسوس ہوتا کہ جیسے میں اپنے دل کو نکال کر پھینک دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے کے ساتھ اس کی شادی کے خیال سے عجیب رقابت محسوس ہوتی۔ میں دن بھر اپنے جذبات سے لڑا کرتا۔ سہ پہر کو وہ پھر جاتی اور پھر اپنی خاص ادا سے دیکھتی اور پھر سب کاٹے ہوئے جذبات اُجھرتے وہ تھوڑی دیر اندر آرام کر کے اپنے باپ کے گھر چلی جاتی جاتے وقت پھر اپنی مخصوص اداؤں سے مجھے دیکھتی جاتی اور یہ ادائیں رات بھر کی کشمکش کا سامان پھر مہیا کر جاتیں۔

کبھی کبھی میں یہ بھی قیاس کرنے لگتا کہ اس کے دل کا کیا عالم ہو گا۔ اس کی میری طرف اس طرح فوج پر مجھے بڑا تعجب تھا۔ اس کی دکھائی عجیب غریب تھی۔ مجھے یاد آتا کہ میری مرحوم بیوی جوانی میں سنگھار و نگہار کر کے ایسی ہی اداؤں سے مجھے دیکھا کرتی تھیں اور ان کی ان اداؤں پر جیسے میرا دل ٹوٹنے لگتا تھا کچھ ویسی ہی کیفیت اب بھی دل میں محسوس ہوتی تھی۔ مجھے تعجب ہوتا کہ یہ تیرہ چودہ برس کی لڑکی مجھ ساٹھ سینٹھ برس کے بڑھے کو ایسی کو بھادنی لگا ہوں گے کیوں دیکھے۔ اس کے دل میں کیا ہے؟ ہزاروں اس کے ہم سن اس سے کچھ بڑے جوان دنیا میں پھر رہے ہیں۔ اسکول آتے جاتے ہیں۔ سہیلی ساتھنوں کے گھر دلیں آتے جاتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ برقع کی نقاب قلمایک رکھی سی چیز ہو گئی ہے۔ اعتراض کرنے والوں کو اتنا دیکھ کر ڈال لی جاتی ہے۔ آتے جاتے اس کا چہرہ کھلا ہی رہتا ہو گا اور ہزاروں نگاہیں اُس

پر پڑتی ہوں گی۔ آنکھ ناک کی بہت اتھنی نہ سہی مگر ایسی مری بھی نہیں ہے۔ لاکھوں
 دنوں کو بھائی نے کے لیے تو صورت کافی اچھی ہے اور پھر کھلتی ہوتی کلی ہے اس
 کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھ جاتی ہوگی۔ باپ کو کوئی پروا نہیں۔ سوتیلی ماں
 چاہتی ہے کل کی جاتی آج جائے۔ اگر کسی کے ساتھ بھاگ جائے تو وہ لوگ
 اچھی خوش ہوں کہ عذاب کٹا۔ مگر یہ مجھ بڑھے مٹرے ہوئے پھونس کو
 کیوں بھجوا رہی ہے۔ کیا پچھ بھجوا رہی ہے یا میرا تیاں ہے بعض دیم
 ہے میں اور غور سے اس کی دکھائی اور اس کی اداؤں کا مطالعہ کرتا گیا۔
 اور مجھے زیادہ سے زیادہ تعجب ہوتا گیا۔ اس لڑکی کے اندر کوئی عجیب
 غریب ادواج تھی اور یہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مجھے گھسیٹ لینا
 چاہتی تھی میں باوجود اپنے بڑھاپے اپنی کمزوری، اپنے تجربے کے اس کی
 طرف کھینچا جاتا تھا۔ صاف یہ محسوس ہوتا کہ یہ مجھ سے دیر کچھ چاہتی تھی جو
 اس کی موجودہ حالہ جوانی میں سنگھار کرنے کے بعد چاہا کرتی تھی۔ اس کی ماں
 نے ایسا کچھ بھی نہیں چاہا۔ یہ عجیب لڑکی ہے۔ شاید یہ سب لڑکیاں ایسی
 ہی ہوں مگر اس قسم کی تجربہ اپنے ہم عمروں سے کرتی ہوں گی۔ نانا دادا کے برابر
 بڑھوں کی طرف سے یہ خیال عجیب چیز تھی۔ مجھے بڑا ہی تعجب ہوتا۔

ساتھ ساتھ مجھے یہ محسوس کر کے بڑا تعجب ہوتا کہ میں اب تک جوان ہوا
 ہی نہیں اور اب جوان ہو رہا ہوں۔ عرصے سے دنیا کچھ بھیجی سی معلوم
 ہوئے لگی تھی مگر اب پھر نئے طریقے سے زندہ نظر آئی۔ میں قریب قریب کہ
 کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ مگر اب بازار میں جانا اور خلق خدا پر نظر ڈرانا اچھا

معلوم ہونے لگا تھا۔ دنیا کے کنارے لہروں کا ٹکٹ لینا۔ بانگوں میں پڑوں کے
میچے لیٹ جانا اچھا لگتا۔ مافظ کا یہ شعر یاد آتا اور میں اس پر ہر دھنسا

رونی محمد شباب است دگرستان را

می رسد ثرود گل بلبل خوشن لحان را

جمال میں کچھ شاعری سے بھی شوق ہوا تھا۔ استاد آرزو کے سامنے زانوئے
تلمذ بھی طے کیا تھا مگر پھر گھر کے دھندھوں میں پڑ کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک
برہانے کس میں جس پر اپنی اپنی دھول جم گئی کچھ کاغذات رکھے ہوئے تختے ان
میں پڑتی بیاض بھی یاد آتی اس کو نکالا اور شعر کہنے لگا۔ اب مجھے اس لڑکی سے
کچھ شرم سی آنے لگی جب وہ سامنے آتی اور اپنی خاص ادا سے مجھے دیکھتی
تو محسوس ہوتا کہ جیسے وہ بالکل غریباں ہو کر سامنے آگئی اور لا شعوری طور پر
میری نگاہیں ٹھجک جاتیں۔ میرا منہ پھر جاتا۔ اس پر بھی طبعاً تعجب ہوتا عجیب
جذباتی کشمکش۔ معلوم ہوتا کہ قروں کا وطن کیا ہوا مرده زندہ ہوا ہے، مگر
اس کا گلا ہوا جسم اسے اٹھنے نہیں دیتا۔ کہ نہیں سکتا کہ کوئی شیطان میرے
اندہ سمارتا تھا یا پھر یہ قدرت کا کوئی کرشمہ تھا۔ کوئی ناجائز قوت تھی۔ شاید جس
چیز کو بڑھوس کہا جاتا ہے وہی ہو۔ یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ کسی سے دریافت
کرنا چاہیے مگر کسی سے کہنے کے خیال سے بڑی شرم آتی۔ کیا کہے گا کوئی۔
کیا کیا ہنسی نہ اڑے گی۔ اسے یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ اور اس سب کو سوچا
کر میں بڑے تعجب کے عالم میں آجاتا۔

اس سال اس کے اسکول میں گرمیوں کی چھٹی ہوئی تو وہ دس دن بھر

میرے گھر میں ہی رہنے لگی۔ میں اندر کے حصہ میں برسوں سے نہ گیا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس عالم میں ہے۔ ایک دن نہ معلوم کیا ہوا کہ اندر پہلا گیا۔ دیکھا کہ وہ اسی تخت پر بالکل اسی طرح بیٹھی ہے جیسے اس کی خالہ بیٹی رہتی تھی۔ مگر ہر طرح صاف شفاف سمجھا سچایا تھا تمام چیزیں باقاعدہ کی تھیں۔ بڑھیا باورچی خانے کی کوٹھڑی میں پوری کھانسی رہتی تھی۔

اُس نے اپنی کشیدہ کاری سے نگاہ اٹھا کر مجھے اسی طرح دیکھا جیسے کہ میری حور میری دیکھا کرتی تھیں اور پوچھا آپ کھانا کھائیں گے۔ میں نے تیار کر دیا ہے۔ بڑھیا کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ آپ کہیں تو کھانا لاؤں؟

میں نگاہیں جھکائے ہوئے ایک آدھ دُور دیدہ نگاہ اس کے چہرہ پر ڈالتا ہوا سفار ہا اور ہاں بھوک تو لگی ہے کہ کرچروں کی طرح واپس آگیا۔ یہ بھی میرے لیے ایک تعجب کا عالم ہے۔ دوسرا مگر سمجھا لے ہوئے تھی اور خوش تھی۔ اس نے میری ہیری کی جگہ شوق سے لے لی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا مجھے اس پر بڑا تعجب تھا۔

وہ میرے لیے سستی میں کھانا لگا کر لاتی، میں کھانا کھاتا رہا وہ سامنے بیٹھی ایک رسالہ پڑھتی رہی۔ کھانا بڑھالے گئی احمقہ لگا گئی۔ میں بیٹھا حقہ پیتا رہا مگر میرا عجیب عالم تھا۔ میرے اندر عجیب جذبات کا غلبہ تھا، عجیب خوش طاری ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوں نیچے ٹہنی گہری وادی ہے اور میں گہرے ہی والا ہوں۔ اس دن وہ کئی کئی دفعہ اندر سے باہر آکر اُدھر سامنے بیٹھی اور رسالہ پڑھتی گئی۔ میرا ہول بڑھنا گیا۔ میں نے سوچا کہ

میں کسی لڑکے کے یہاں چلا جاؤں بلکہ ایک بچے سے دوسرے کے یہاں ہوتا
پھروں۔ دس دس پانچ پانچ دن ہر ایک کے یہاں رہوں جب تک یہاں
بند ہیں۔ پھر دیکھا جائے گا اور میں نے اس سے کہا بھی "میں سوچتا ہوں
تھارے بھائی بہنوں کو دیکھ آؤں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" وہ بولی۔

"تم یہاں اس گھر میں رہنا۔"

"یہاں اکیلے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ بڑھیا بھی اپنے گھر جانے کو کہتی ہے۔"

اب کہتی ہے وہ لڑکے کے پاس رہے گی۔ اب اُس سے کام نہیں ہوتا۔

"نہیں وہ ٹھیری رہے گی۔ میں اس کے لڑکے کو بلا دوں گا۔ وہ بھی یہیں ٹھہر

جائے گا۔"

"مگر مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ کسی رات مرگئی اور بھتی بن کر میرے سر پر

سوار ہو گئی تو؟"

مجھے خدمت سے محسوس ہوا کہ وہ مجھے چنی طرح جکڑے ہے اور میں اس

سے الگ نہ جو پاؤں گا۔ میں نے کہا۔ خیر سفر تکلیف دہ ہی ہوتا ہے اور آج

کلی گری میں ہیں نہ جاؤں گا۔"

اب وہ روز میری اسی طرح خدمت کرتی رہی۔ میر خوف کم ہوتا گیا۔ وہ بھی

اور زیادہ ڈری سے میرے قریب آتی گئی۔ اس کے چہرہ کا عالم عجیب عجیب تر

ہوتا گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بھوک

ہے مگر عزت کے مارے کہ نہیں سکتی۔ اور میرے خیالات میں بھی عجیب عجیب

تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ میں نے یہ سنے کہ رات کو بھی وہ یہیں رہا کرے۔
گمراہ تھے بڑے گھر میں اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپا کے یہاں وہ سب بہت
تو ہے۔ رات بھر خود آپا کی آہٹ رہتی ہے۔ باتوں کی گھسٹ بھسٹ سنائی دیتی
ہے اور بچوں کے رونے کی آوازیں آ جاتی ہیں۔ دن میں ہاں وہ چھوٹی اماں کھا
جاتی ہیں اس لیے میں ان سے الگ ہو جاتی ہوں۔ رات میں جا کر پڑ جاتی ہوں۔
یہ سب اس نے عجیب حسرت سے کہا صاف معلوم ہوا کہ جیسے وہ بالکل
میرے پاس رہنا چاہتی ہے۔ میں کہتا کہ میں بھی اندر رہا کروں گا مگر مجھے اس
کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے سے بڑی خطرہ محسوس ہوا جیسے کہ میں پارک
کی چوٹی سے کھڑی میں پھانسی جاؤں گا اور کڑے کڑے ہو جاؤں گا۔

ایسے ہی نہ معلوم کیا کیا ہوتا رہا۔ میں سب سوچ سوچ کر تعجب میں آ
جاتا ہوں اور تمام واقعات بھول جاتا ہوں ان کی ترتیب بھول جاتا ہوں۔ کبھی
کچھ یاد آتا ہے کبھی کچھ۔ سب بڑا ہی گڑبڑ سرٹ ہے۔ بالکل خواب کی طرح بے ربط
اور نہایت تعجب انگیز.....

ہاں سب سے زیادہ تعجب انگیز واقعہ۔ میں کیا کہوں۔ کیسے بیان کروں
حلق خشک ہوا جاتا ہے۔ دماغ چکراتا ہے۔ ہنسی بھی آ جاتی ہے کہ یہ سب کتنا
مضحک تھا۔ مگر یہ سب ہوا۔ خیر ایک رات میرے یہاں سے یہ گھر گئی اور پھر
واپس آ گئی اور کہنے لگی۔ کھر میں قفل لگا ہے۔ وہ لوگ سینما گئے۔ میری سمجھ میں
نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد بولی آپ مجھے بھی سینما لے چلیے۔
پھر اس کے میرے ساتھ اکیلے ہونے سے پریشانی پھر رہی تھی۔ میں نے سوچا

کہ چلو سینا میں دقت کٹ جائے گا۔ میں جلدی سے تیار ہو کر اس کے ساتھ سینا گیا۔ جیسا کہ یہ سینا بڑی ہی اشتعال انگیز چیز ہے۔ بڑا ہی عجیب اثر رکھتی ہے عشقی معشوق کے قہقہے۔ جہان حسین لڑکیاں نہایت تھکرتی دماغ خواب کر دیتی ہیں۔ اب میں بڑھا ہوا کر گیا کہوں کہ اس فلم نے مجھے مست کر دیا۔ اور اس کے اوپر بھی جواڑ ہوا ہر گاہ وہی جانے۔ آئندہ جہان تھی، مجھ کو تھی، خیر جو بھی ہوا ہو۔ اس رات کو یاد کر کے میں بڑے ہی تعجب میں آجاتا ہوں..... معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں بے بس تھے۔ کوئی عجیب طاقت سیلاب کی طرح ہم کو بہا لے لیے جا رہی ہے۔ ہم دونوں بہہ گئے.....

صبح کو میری آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ پاس ہی پٹنگ پر سو رہی تھی۔ خواب کیسے تھا، سب حقیقت تھی۔ کئی دن تک اس خواب نے حقیقت کا عالم طاری رہا۔ ہم دونوں خواب ہی کی دنیا سے گزرتے رہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر گئی ہی نہیں اور نہ وہاں سے کوئی پوچھنے آیا۔ چوتھے دن میں یہاں باہر بیٹھا تھا۔ برق اوڑھے ایک عورت اندر آگئی اور ایسے ندر در سے باتیں کرنے لگی کہ مجھے صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”ہاں وہ کہتی ہیں خالو ہے تو کیا ہوا۔ کوئی ناجائز تو نہیں ہے۔ اور بیٹھے کو کہہ تو کیا سب کو جہان ہی تو مل جاتے ہیں، جیسے یہ آوارہ گردی کب تک نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی سوتیلی ماں کی رائے ہے جو یہ لو کو کافی شاید کوئی

تھے والی کہنے کو بھیجی گئی ہے۔ بہر حال میرے اس کے ساتھ نکاح میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ باپ بالکل راضی تھے۔ نکاح ہو گیا۔ اس کے بھائی بہن اور میرے بچے تعجب کر کے رہ گئے۔

اس نے پڑھنا بھی جاری رکھا۔ انٹرنس پاس کر لیا ہے اور انٹر کی تیاری بھی کرتی ہے۔ بچے بھی دیکھتی ہے، گھر بھی دیکھتی ہے، میرا بھی ہر خیال رکھتی ہے مگر یہ سب مجھے بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جو جو سوچتا ہوں وہ وہ تعجب میں آجاتا ہے، تعجب بڑا تعجب !!!

نقوش:



گلدستہ خار

میں غصا سے دیکھا۔ میں نے ذرا سا سوچا، روہینہ کے ہاں چند گھنٹے کے قیام میں مجھے چند بار اس کا خیال سا آیا، مگر جب میں گھر واپس آئی تو میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا کہ میرا سب کچھ اس کی گرفت میں چلا گیا ہے۔ تب میں نے اپنی اس حماقت پر ہنسنا بھی چاہا مگر اس کوشش میں میرے آنسو ٹپک پڑے۔

روہینہ کے ہاں جانے سے پہلے میں حیران ہوتی تھی کہ ہماری پرانی کمائیاں اور ناولوں میں عشق ایک دم سے کیسے ہو جاتا ہے! میں نے ایسی ناولیں اور داستانیں بھی پڑھی تھیں کہ طرفین نے ایک دوسرے کو اٹکے بھر کر بھی نہ دیکھا۔ بس ادھر سے چلن ذرا سی تھی، ادھر کو چھ میں سے گزرتے ہوئے فوجوان کی نظریں ذرا سی اٹھیں اور قصہ تمام ہو گیا۔ فوجوان پورے قد سے گر اور لڑکی نے چلن سے ہٹتے ہی ہائے وائے عجاذی کہ اس کا سر درد سے پٹھا جا رہا ہے۔ پھر فوجوان کو ٹھٹھکا یا گیا اور لڑکی کے مندل لگائی گئی۔ اور دغیرہ دغیرہ اور دغیرہ دغیرہ۔ مارے مہنسی کے میں بے حال ہو جاتی تھی۔

سیلیاں مجھ سے پرچتی تھیں کہ جب تمہیں یہ ناولیں اور داستانیں اتنی بے جھڑکتی ہیں تو ہم انہیں پڑھتی ہی کیوں ہیں اور میں کہتی تھی، مجھے لطیفوں سے رنجیت ہے شیخ پیل کے لطیفے نہ پڑھو، یہ کتابیں پڑھ لیں۔ بات ایک ہی ہے۔ میں انہیں بتاتی تھی کہ جہاں لکھنے والا پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنسو لٹا پاتا ہے وہاں میں مسکراتی ہوں۔ جہاں وہ رقت طاری کرنا چاہتا ہے، وہاں مجھے گدگدی سی ہونے لگتی ہے اور پھر جب خفیہ ملاقات میں، بیرونی شعروں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وہاں تو کچھ پوچھ نہیں میں اپنا کمرہ بند کر کے اور لحاف اوڑھ کر خوب خوب ہنستی ہوں کہ جانے اس زمانے میں ہمارے ادب کو کیا ہو گیا تھا۔

میں ایک سوجا سمجھا عشق بھی کر چکی ہوں۔ مگر لکھنا پردے کا سخت پابند تھا مگر جانے آج بھی کو کیا سوچتی کہ انھوں نے اپنے ایک دوست کے بیٹے انور کو یہ کہہ کر ہم سب کے سامنے بلایا کہ اپنا بیٹا بھی ہے۔ شاید اس لیے کہ بیٹی جب ایک خاص عمر کو پہنچی ہے۔ والدین کو اس کا بڑا ہونڈنے کے لیے اپنے اونچے اونچے اصولوں کے تحت پر سے اُترا آنا پڑتا ہے۔ یہ تو خیر میں آج کہ رہی ہوں مگر اس وقت آج بھی کی دریا دلی دیکھ کر مجھے ان پر سخت پیار آیا تھا۔ یہ مری کا واقعہ ہے اور مری کے سے مقامات پر پہنچ کر ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے عام دھڑے سے ہٹ کر کوئی بات کرے میں اس دھڑے سے ہٹ کر بھی کیا کرتی کہ میں تو پردے میں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی کہ ایک اور ناول پڑھ کر ذرا سا ہنس لوں۔ مگر پھر

آجی انور کو اندر لے آئے اور دو ہفتے کی مسلسل ملاقاتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ انور مجھے چاہتا ہے۔ چند دن بعد مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں بھی انور کو چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم میدانوں میں اتر کر کبھر گئے۔ اور مجھے یاد بھی نہ رہا کہ انور نے میرے دل میں ذرا سی چٹکی لی تھی۔ کوئی مہینہ بھر بعد انور کے آبا کا میرے بآجی کے نام خط آیا کہ انور کی شادی ہو رہی ہے اور ہم سب کو اس میں شامل ہونا ہو گا۔ مجھے ایسا لگا جیسے انور نے اپنی جیب الٹ کر اس میں میلا جھاڑ دیا ہے۔ سارا دن میں لمے منہ سو رہے رکھا۔ رات نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی صبح کہ ہماری بلی کے پنجے میں کاٹا چھریا گیا۔ جب تک کاٹا نکل نہ گیا اور بلی میری گود میں خورنے نہ لگی۔ میں نے اتنی بے چینی محسوس کی کہ پہلے شاید ہی کبھی کی ہو۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے انور سے کہیں زیادہ اپنی بلی پیاری تھی۔ یوں میرا پہلا عشق انجام کو پہنچا۔ مگر کیا وہ عشق تھا؟ میں تو سمجھتی ہوں وہ صرف ایک انگریزی تھی جو لوہنی بے معنی طریقے سے آتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

ویسے کئی بار ایسا بھی ہوا کہ راہ چلتے برقعے کی جالی میں سے میری نظر کسی ایسے نوجوان پر پڑتی کہ مجھے یونانی دیوتاؤں کے مجسموں کی تصویریں یاد آگئیں اور میرا جی چاہا کہ میں ایک کرباؤں اور اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور اسے چپ چاپ جی بھر کر دیکھوں اور اس کے چہرے کو اسگوں کے رستے پی جاؤں، مگر پھر ایک اور چہرہ نظر آ گیا جس میں اس سے زیادہ کشش تھی۔ پھر ایک اور چہرہ، پھر ایک اور چہرہ۔ مجھے اپنی حماقت پر ہنسی

آجاتی۔ آخر میں کس کس سے عشق کرتی پھروں گی۔ اور پھر عشق کی میعاد ہی کتنی ہوگی۔ لاجول ولاقوہ۔

کبھی کبھی میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں کہ آخر خدا انسان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا اور میں کہتی تھی کہ ابھی انسان نے انسان ہی کو کب سمجھا ہے کہ وہ خدا کو سمجھے۔ انسان کو تو اپنے اندر جذب بھی کر تو جب بھی کم ہی سمجھ میں آئے گا میں سمجھتی تھی میں نے انور کو سمجھ لیا ہے مگر کیا پیرام میں نے اسے سمجھ لیا تھا؟ انسان جب اتنی بڑا سراسر چیز ہے تو ہمارے ہاں جانے کیسے چلن کے ذرا سا اٹھتے ہی فریضہ ہو جانے کا ڈھکوسلا چلتا رہا۔ دیکھنا تو انسان کی صرف ایک ہی حس ہے اور عشق کرنے کے لیے تو اس غمہ کو مستعد ہونا پڑتا ہو گا جب تک دوسرے انسان کو دیکھنے کے علاوہ اسے سنا نہ جائے، اسے سونگھا نہ جائے، چھو نہ جائے، چکھنا نہ جائے اس سے تعارف ہی کہاں مکمل ہوتا ہے۔ پھر جب تک اُسے بڑا نہ جلتے وہ کسی کی سمجھ میں خاک آئے گا۔

میں رو مینہ کے بھائی کی شادی پر سیالکوٹ گئی تو بظاہر وہ خوب ہی ٹھنی بیٹھی تھی مگر بڑی اداس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اُسے الگ لے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے ایک چچیرے بھائی کے ساتھ کل اُس کی مگنی طے ہو گئی ہے اور — اور بھائی جان ویسے تو بڑے ہیٹھ سم ہیں اور انگلیڈ سے بھی ہوئے ہیں اور ان کے پاس جو ٹیبلو کار ہے اس پر سے اب تک لندن کا نمبر بھی نہیں اتر ہے مگر نگہت۔ مجھے ان سے محبت ہی نہیں ہو پاتی۔

میں کل سے ان کی تصویر جیسے میں چھپائے پھرتی ہوں۔ میں نے ان کی ہلک ہلک
 کو غور سے دیکھا ہے۔ وہ ناک نقشے کے قریب اچھے ہیں مگر ان کو دیکھ کر
 میرے اندر کچھ ہوتا ہی نہیں۔ میں نے ایک بار لاہور کے چڑیا گھر میں سائیر یا کا
 سفید ریکچر دیکھا تو وہ کجست مجھے کئی دنوں تک یاد آتا رہا اور ادھر بھائی جان
 ہیں کہ تصویر واپس چھپیں رکھ لوں تو بھول جاتے ہیں۔ پھر مجھے کسی اور
 سکرچی محبت نہیں ہے۔ ایک بار محلے کا ایک لڑکا مجھے ذرا سا اچھا لگا
 کئی دن تک میں اسے ایک نظر دیکھنے کے موقعے نکالتی رہی اور وہ مجھے اچھا
 ہی لگتا رہا۔ پھر ایک روز جب اس نے پہلی بار سیدھا میری طرف دیکھا
 اور مجھے اپنی طرف دیکھتا پایا تو کہنے لگا مجھے آنکھ ماری۔ ایسا لگا کہ ایک
 اس کا سارا لباس اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ مجھے ایسا بڑا لگا جیسے
 کبھی اچھا لگا ہی نہیں تھا۔ تم اتنا بہت سا پڑھتی رہتی ہو تاؤ میں کیا کروں
 میں نے اسے مشورہ دیا، تم لوں کرو گرا اپنے عجیبے بھائی جان سے شادی
 کر لو اگر وہ سچ کا اچھا آدمی ہو تو سال آدھے سال میں تمہیں اس سے
 عشق ہو جائے گا۔ اگر بڑا ہو تو لوں سمجھ لینا کہ تم بھی پاکستان کی بچاؤ فیس
 بیویوں میں سے ایک بیوی ہو۔ خدمت کرو اور اجرت لو اس سے آگے
 کچھ نہیں۔

روہینہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے افلاطون کو اس کے شاگرد دیکھتے
 ہوں گے۔ میرے اس مشورے سے وہ بہت نیچے شین جھڑوں کی طرح گڑا گئے۔
 واپس مل گیا ہے اور اسے اپنے منگیتر سے میں دوسروں پر ملتی تھی اب اتنی بے

جا بیٹھے تو وہ چپکے لگی، جیسے بھائیوں کی شادیوں پر نہیں چپکتی ہیں۔
 یہ رسم بھی عجیب ہے کہ شادی کے چمکے میں پردہ نشین لڑکیاں غیر محرموں
 کے سامنے کسی قسم کی تعجب کی بغیر آ جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ بٹے بوڑھے
 بھی اس پردہ دری کی کوئی خناس پروا نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ قدری
 لڑکیوں اور شہزادوں کی لپٹو کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ سو جب روایتی اپنے بھائی کے
 سہرا باندھنے چلی اور ہم بہت سی لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہوئیں تو میں نے
 دیکھا کہ جس کمرے کے وسط میں بھائی دو لہا بنا بیٹھا تھا، وہاں اور بھی بہت
 سے فوجوان موجود تھے اور۔۔۔

— اور ان میں سے ایک فوجوان بڑا عجیب سا فوجوان تھا۔ اس کا پہرہ
 ان پہروں میں شامل تھا جن کے بارے میں ہم سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ زندگی میں
 پہلی بار دیکھا ہے اور پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ ہم نے خوابوں میں ہزار
 بار دیکھا ہے۔ بڑا اجنبی سا۔ بڑا جانا پہچانا سا چہرہ!

میں نے اس قسم کے کتنے ہی چہرے دیکھے ہوں گے جو راہ چلتے دیکھنے
 والوں کو ٹھٹھا کر چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر یہ چہرے پھر بھول بھی تو جاتے ہیں اور
 ایک یہ چہرہ تھا کہ واپس لاہور روانہ ہونے سے پہلے مجھے بار بار یاد آیا جب
 رات واپس آئی اور ہم لڑکیاں کھڑکیوں میں سے اور عورتوں پر سے رات
 کا تماشہ دیکھنے لگیں تو اس وقت بھی مجھے محسوس ہوا کہ میں اس ہجوم میں
 انگلیٹ سے بھی ہوا آئے ہیں آؤں۔ رات کا وقت تھا۔ بجلی کی روشنیوں میں سب
 ایک لندن کا نمبر بھی نہیں لگتا ہے مگر نگاہ سے تھے اور مجھے ہر فوجوان پر اسی کا گمان

ہوتا تھا۔ دوسرے روز دیکھ میں مردوں خوردقوں کا الگ الگ انتظام تھا اور شام سے پہلے میں لاہور واپس چلی آئی۔

جب میں آیا اور آبی سے مل کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور کپڑے بدلنے کے لیے چٹکنی چڑھائی تو ایک دم وہ چہرہ میرے کمرے کی دیواروں میں سے کھڑکیوں میں سے کتابوں میں سے، چھت میں سے اور فرش میں سے میری طرف ٹھٹھکی باندھ کر دیکھتا نظر آیا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے پہلے یہاں چلا آیا ہے اور میرے انتظار میں یہاں چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور اب میں آئی ہوں تو ہر طرف سے پھوٹ نکلا ہے۔

میں سنگار میز کی طرف بڑھی کہ کم سے کم مجھے اپنا ہی چہرہ نظر آئے تو اس چہرے کا عناصر ختم ہوا اور میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا بھی، مگر چہرہ صرف ایک پل کے لیے میرا رہ سکا اس کے بعد میرا چہرہ بھی اس کے چہرے میں بدل گیا۔ اور میں ڈر کر ہٹ گئی اور مجھے یوں نا آگیا اور جب تک آئینے میں ایک بار بھی میں نے اس کا چہرہ نہ دیکھا، میں بوقت ہی رہی۔

یوں مجھے باقاعدہ عشق ہو گیا۔ میں نے اُسے صرف ایک بار دیکھا تھا اور اگرچہ اس ایک بار میں بھی مسلسل دیکھا تھا مگر نہ تو میں نے اُسے بولنے سنا تھا نہ چلتے دیکھا تھا۔ اُسے چھو نے یا برتنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ میں نے اپنا جی بھلانے کے لیے پرانی ناویں اور داستانیں نکال لیں مگر انھوں نے مجھے نالا لادیا۔ ان کے بے معنی شعر میرے سینے میں خجروں کی طرح گڑا گئے۔ میں جو دیکھتے ہی عشق ہو جانے کے سلسلے میں دوسروں پر ہنستی تھی، اب اتنی بے

بس تختی کہ اپنے آپ پر سنبھل بھی نہیں سکتی تھی۔ جانے وہ کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کہاں سے آیا تھا؟ وہ کہاں چلا گیا؟ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ چڑھ رہا ہوگا؟ سو رہا ہوگا؟ سوچ رہا ہوگا؟ کس رخ سے بٹھا ہوگا؟ دھوپ کس زاویے سے اس پر چڑ رہی ہوگی؟ ممکن ہے اب اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ بھیرا ہو انکن ہے اب وہ انگڑائی لے کر چھت کو گھورنے لگا ہو؟ وہ جب چائے پیتا ہوگا تو کیسے لگتا ہوگا؟ بولتا ہوگا تو اس کے ہونٹ کیسے الگ ہوتے اور ملتے ہوں گے؟ کہیں اس وقت وہ کسی لڑکی کو چوم نہ رہا ہو؟ اور کیا اس وقت میں اسے یاد آ رہی ہوں؟ کیا میں اسے یاد آ سکتی ہوں؟ کیا اس نے میری طرف دیکھا بھی تھا؟ میں تیس چالیس لڑکیوں میں ایک لڑکی تھی تو کیا اس نے صرف میری طرف دیکھا تھا؟ مگر دیکھا بھی تھا کہ نہیں؟

روینہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور سے اپنا جینز خریدنے آئی تو میرے ہاں ٹھہری۔ اس نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا کہ تمہیں کیا روگ لگ گیا ہے؟
”تمہاری آنکھیں پہلے بھی جھپکتی تھیں اور اب بھی جھپکتی ہیں مگر پہلے ان میں مسکراہٹ کی چمک تھی، اب آنسوؤں کی چمک ہے۔ ایسا کیوں ہے نگہبت؟“
— اور میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے عشق ہو گیا ہے۔ پھر میں نے اسے ساری تفصیل بتائی مگر وہ میری کوئی مدد نہ کر سکی۔ میری طرح وہ بھی پردہ کرتی تھی اس روز اس نے بھی پہلی بار اتنے بہت سے لڑکے دیکھے تھے اور ان میں اس کے رشتے دار بھی تھے اور اس کے بھائی کے بہت سے دوست بھی تھے اور گل محلے کے بھی بہت سے نوجوان تھے۔ نام مجھے معلوم

منیں تھا اور جب میں نے اپنے تئیں اسے اپنے محبوب کی سب سے بڑی نشانی بتائی کہ وہ بے حد حساب، شدید حد تک، ناقابل یقین حد تک خوبصورت تھا تو روئینہ ہنسنے لگی اور بولی۔ اری کہیں تم میرے چہرے بھائی جان صاحب پر تو نہیں مریٹیں۔ اس وقت تو میری نظر میں دنیا کا خوبصورت ترین فوجی رہی ہے۔ اس نے تو مجھے صرف چھڑا تھا مگر میں بڑی طرح چوٹ لگی۔ پھر اس نے پرس میں سے اپنے منگیتر کی تصویر نکال کر مجھے دکھائی اور اب مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ نہیں بی بی۔ نہ تو اس کا چہرہ اتنا لمبوتر تھا اور نہ اس کی آنکھیں اتنی گول تھیں اور نہ اس کے ہونٹ اس زنا زد حد تک پتلے تھے۔ بل کر روئینہ نے مجھ سے تصویر چھین لی اور اس کے سبب اکوٹ جانے کے بعد بھی میں سوچتی رہی کہ روئینہ اتنی بد ذوق کب سے ہو گئی ہے؟ آخر اس کے چہرے بھائی کے چہرے میں ایسی خصوصیت ہی کون سی ہے کہ اس کے عشق کیا جانے کسی تنگ میں چلے جاؤ تو وہاں اس صورت کے ایک سوکرک میٹھے مل جائیں گے تو کیا تم بیک وقت سب پر خدا ہو جاؤ گی؟

کبھی کبھی مسکون کے کسی لمحے میں، خوب سو لینے یا خوب کھا لینے کے بعد میں سوچتی تھی کہ آخر یہ کیا حاکت ہے۔ نام پتا کچھ بھی معلوم نہیں۔ یقین نہیں کہ اس نے بھی ایک نظر مجھے دیکھا ہو گا۔ پھر بھی سڑکوں پر بازاروں میں، غلم کے پردے تنگ پر مجھے اسی چہرے کی جستجو رہتی ہے۔ یہ توصات پاگل پن ہے۔ مگر میں اتنی پاگل نہ ہوتی تو اب تک کتنی بے وقوف، کتنی بدحواسی لڑکی ہوتی!

ایک روز گھر میں کچھ مہمان آئے۔ دن بھر کھسکھس کر کی سی فضا قائم رہی اور شام کو اتنی نے میرے کمرے میں آکر مجھے بتایا کہ میری منگنی ہو گئی ہے اور لڑکا لائل پور کا رہنے والا ہے اور وہیں کسی ٹی بیں دو ہزار ماہانہ کما تا ہے اور نام سرفراز ہے۔

مجھے عرصے سے معلوم تھا کہ میرے ساتھ یہی ہو گا۔ عام حالات میں مجھے اپنے والدین کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر ان خاص حالات میں مجھے شدید اعتراض تھا، البتہ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس اعتراض کا اظہار کر سکتی۔ میں رونے لگی اور اتنی ہنستی ہوئی واپس چلی گئیں کہ نگہت نے یہی حرکت کی جو انھوں نے اپنی منگنی کا شن کے کی تھی۔ اس پر میں نے آبا کی بھی ہنسی کی آواز سنی۔ یوں میرے آنسوؤں نے میری منگنی طے کر دی۔

میں اب تک صرف محبت کرتی آئی تھی مگر اس روز پہلی بار میں نے نفرت کا ذائقہ چکھا۔ مجھے لائل پور سے، دو ہزار کی آمدنی سے، سرفراز کے نام سے نفرت ہو گئی۔ ایک بار تو میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے اتنی اور اس سے بھی نفرت ہو گئی ہے مگر پھر جب اتنی بڑے چاؤ سے میرا جہیز جمع کرتی نظر آئیں اور آبا مجھے دیکھتے ہی میری جدائی کے تصور سے پیلے پڑ گئے تو مجھے ان کی مصیبت پر ہمارا آگیا بھلا ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔ ماں باپ کے دل میں تو صرف عزت ہوتی ہے نا۔ اور پھر خود مجھے بھی تو معلوم نہیں کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔

اور نہ پہلے یہ سرفراز صاحب کیسی مخلوق ہوں گے، بھلا یہ سرفراز بھی کوئی

نام ہے جب لوگ سرفیلک اور سربر آوردہ قسم کے نام نہیں رکھتے تو سرفراز کو کیسے قبول کر لیا گیا ہے! اور یہ سرفراز صاحب لائل پور کے قصبے میں میٹھے کیا کر رہے ہیں؟ لاہور کیوں نہیں آتے یا کراچی کیوں نہیں چلے جاتے؟ خاصے بدذوق معلوم ہوتے ہیں کہ کچھ دیکھنے سے بغیر شادی پر رضامند ہو گئے، یا ممکن ہے، سنا ہو کہ میرے آباؤں کے گھر میں دو بنگلے بنوائے ہیں اور منگھری میں ان کے ماٹھے اور کتوں کے باغ ہیں اور انھوں نے اپنی بڑی بیٹی کے جہیز میں دو لاکھ روپے کا چیک بھی دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو سخت پردے میں رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی بیٹی نے اب تک کسی سے کیا محبت کی ہوگی!

ان سرفراز صاحب پر کبھی تو مجھے رحم آتا کہ ممکن ہے میری طرح ماں باپ کی سعادت مند اولاد ہوں اور ان کا غرور قائم رکھنے کے لیے مجھ سے شادی پر رضامند ہو گئے ہوں! کبھی غصہ آتا کہ ممکن ہے میری بجائے ایک بڑے باپ کی بیٹی کو بیاہنے فخریہٹ ہے۔ رہے ہوں کیونکہ آج کل بعض شوہر اپنی بیویوں سے تو پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان کی یہ سازش کس بُری طرح خاک میں مل جائے گی جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میں تو کسی اور سے محبت کرتی ہوں! اس سے جس کا مجھے نام بھی معلوم نہیں اور جانے زندہ ہے کہ مر چکا ہے۔ ہائے میں مر جاؤں۔ میں یہ کیا پاک دی۔ جب مجھے مایوں بٹھایا گیا تو ایک بار میں نے سوچا کہ موقع اچھا ہے اس وقت خود کشی کر دینی چاہیے۔ پھر میں نے دیکھا کہ حسد کی خوشبو ہے

بسی ہوتی لاش پر چمکی ہوئی ٹھنڈی سیسے کسی کو راستہ دینے کے لیے ایک کھونٹ
ہٹ گئیں اور وہ پکا پلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
تھا اور اس کے چہرے پر زردی کے سوا کوئی رنگ نہ تھا اور اس کے ہنٹ کانپ
رہے تھے اور وہ مچر مچر جھکا ہوا پرچھو رہا تھا۔ بس اتنا ہی حوصلہ تھا کہ بس
اتنی ہی دوستی تھی؟

سو میں نے یہ سوچ کر مرنے سے انکار کر دیا کہ ایک انسان اپنی زندگی
میں کوئی ایک لاکھ انسانوں کا راستہ تو ضرور کاٹتا ہو گا۔ پھر کیا عجب کہ ان لاکھ
چہروں میں مجھے وہ چہرہ نظر آجائے جو میرے حواس پر کھد کر رہ گیا تھا۔

جب برات رخصت ہونے لگی اور مجھے تمام کار ایک بچوں لدی کار
تک لے جایا گیا تو میں نے آنکھیں سو سے ادھر ادھر رایتیوں کے چہرے دیکھ کر
کی کرشمش کی مگر ادھر بادامی رنگ کا برقع تھا اور نیچے سرخ رنگ کا گھونگھٹ
تھا اس لیے مجھے صرف ایک رنگیں غبار سا نظر آیا جیسے میں آنکھیں بند
کر کے سورج کی طرف گھوم گئی ہوں اور دھوپ میرے پوٹوں کا خون بن
گئی ہے۔

مجھے جب کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور دو عورتیں میرے دائیں بائیں
ٹھنکس کر بیٹھ گئیں تو کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کار کے اندر کچھ شوش
کی فضا ہے۔ پھر میں نے کار کے آس پاس بڑی غماطہ سرگوشیاں سنیں اور میں
نے اندازہ لگا لیا کہ رسم کے مطابق تو دو رہا کہ اس کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا
تھا مگر وہ کسی کی مانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں اپنے دوستوں میں بیٹھوں گا۔

”دہن کیا کہے گی! میرے ایک طرف بیٹھی ہوئی عورت نے جو بعد میں میری بڑی زند نکلی، بہت مہینے مرگوشی میں کسی سے پوچھا۔

اور میں نے دل میں کہا۔ ”دہن خدا کا شکر بجالائے گی اور کیا کہے گی۔“
پھر کار چل پڑی اور میں نے سوچا کہ اگر میں نے خود کشی کر لی ہوئی تو جس طرح اس وقت میری برات جا رہی ہے، اسی طرح اس وقت میرا جنازہ جا رہا ہوتا، اور اسے ہوتا کا فرجیرو لیے میرے سامنے رہا تھا، پتا بھی نہ پتا کہ میں نے اس کے لیے جان دے دی۔ مگر اسے اب بھی کیسے پتا چلے گا کہ میں نے اس کے انتظار میں زندہ رہنے کی سزا قبول کر لی ہے۔ اور اگر کبھی وہ مجھے دکھائی بھی دے گیا تو میں اسے کیسے بتا سکوں گی کہ میں نے اس کے لیے کیا کچھ محسوس کیا ہے اور اگر میں نے کسی طرح کہ بھی دیا اور میری حماقت کا قصہ سن کر اس کی ہنسی نکلی گئی تو پھر کیا ہوگا۔

”پھر کیا ہوگا؟ میں کچھ ایسی کھو گئی تھی کہ اپنے آپ سے پوچھ بیٹھی۔

اور میری زندہ ہنسی پڑی۔ ”کیا ہونا ہے میری جان!۔“ اس نے کہا۔
”سو نے میں لدی ہو۔ پھولوں میں تلوگی۔ اور کیا ہوگا۔“ پھر اس نے میرے دوسرے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت سے کہا: ”قربان جاؤں تقدیر کے۔ دنیا کی ہر دہن کے دل میں شادی کے پہلے دن یہی سوال پیدا ہوتا ہے۔“
میں وہ کرب کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے لائل پور کے ایک بنگلے کے صحرے کے کھلے کمرے کی تنہائی میں محسوس کیا میں نے سوچا، میں تو خیر خود کشی نہ کر سکی مگر آج میری محبت کی خود کشی کی رات آگئی ہے۔ ہائے یہ کتنا

بے سنی مگر کتنا پیارا جذبہ تھا۔ اس کے چہرے کے تصور میں میری نہیں کس کس طرح کھینچی ہیں، میرا گلا کیسے کیسے رندھا ہے اور جب میں اپنی بے بسی کے دکھ سے رو دی ہوں تو میں نے کیسی نشے کی سی کیفیت محسوس کی ہے جیسے میں خدا کے حضور کھڑی ہوں اور اس سے ڈر بھی رہی ہوں اور اسے پوچھ بھی رہی ہوں جب مجاہد راہِ خدا میں لڑتے ہوئے زخمی ہو جاتے ہوں گے تو موت کو قریب آنا دیکھ کر ان کو اسی طرح سرشار کر دینے والے درد کا لطف آتا ہو گا۔ تو کیا میں جس لطیف جنون میں مبتلا رہی ہوں، وہ آج رات ختم ہو جائے گا اور کیا وہ چہرہ اس کے بعد بھی تصور میں آ سکے گا؟ اور اگر آیا تو کیا میں اس سے آنکھیں چار کر سکوں گی؟ میں کتنی شرمناک حد تک بے وفا ہوں! کیا میں اس شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی؟ یہی ہوتا نا کہ اتنی اور ابانجھ پر برستے اور مجھے واسطے دیتے اور کچھ روتے اور کچھ طیش میں آتے مگر پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا۔ اور میں انتظار کرتی رہتی۔ کیا میں اتنی کم ظرف ہوں کہ ایک برس یا دس برس یا پچاس برس تک بھی مجھے اس کی راہ تکٹے رہنے کا حوصلہ نہ تھا؟ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار خیال آیا کہ میں بد چلی ہوں! بے وفائی سے بڑی بد چلی اور کیا ہو سکتی ہے؟

پھر میں نے سنا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا ہے، آہستہ سے جھکنی لگی ہے اور دروازے وقفے کے بعد کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے اس طرف چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ سرفراز صاحب تھے۔ بے چارے جی میں برک

خوش ہوں گے کہ خوب میدان مارا ہے مگر انھیں کیا تپا کہ میں اپنا دل مر کر بھی ان کے حوالے نہیں کر دوں گی۔ دونوں کے سودے یوں آسانی سے تو نہیں ہو جاتے کہ نکاح کر لیا اور محبت ہو گئی۔ مگر سرفراز صاحب اس طرف کیوں نہیں آتے؟ اتنی دیر گزر گئی ہے اور وہ کہیں ادھر ہی جم کر رہ گئے ہیں؟ آخر یہ صاحب بار بار میری تنگ پر کیوں تل گئے ہیں؟ پہلے انھوں نے دلہن کی کار میں ٹھیننا گوارا نہ کیا اور پھر سے مجمع کو متاثر دیا کہ انھیں دلہن کی کچھ ایسی پروا نہیں ہے۔ اب وہ یہاں آئے ہیں تو رسم کے مطابق مجھے منہ دکھائی کا کوئی تحفہ کیوں نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں رنج ہی انھیں سب کچھ بتا دوں۔

بڑی احتیاط سے کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے اپنے لمبے گھونگھٹ میں سے اس طرف دیکھا جہاں پہنچ کر سرفراز صاحب کے قدموں کی آواز رک گئی تھی۔ گھونگھٹ میں سے مجھے صرف یہ نظر آیا کہ وہ دیوار سے ٹکی ہوئی ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے ٹیبل لمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہے ہیں روشنی کے پس منظر میں مجھے ان کا صرف سلوٹ نظر آیا، مگر آخر انھیں شادی کی پہلی رات کو لکھنے کی کیا سوجھی! کہیں وہ شاعر تو نہیں ہیں! مائے کہیں وہ شاعر نکلے تو پھر کیا ہو گا۔ شاعر تو سنا ہے بڑے آوارہ اور بے ہدایت ہوتے ہیں اور ان کا دل ان کے سینے کی بجائے ان کی پتیلی پر رکھا رہتا ہے۔ وہ بے چارے اس دنیا کے آدمی تو ہوتے ہی نہیں۔ مگر وہ جو بھی مخلوق ہیں، سامنے تو آئیں۔ کیا میں اتنی ہی بے حقیقت ہوں؟ میں خود

ان سے کیوں نہ پوچھ لوں کہ میرے لیے کیا حکم ہے ؟

مگر اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں پلٹ کر اور سر جھکا کر بیٹھ گئی
اتنی وحشت سے میرا دل اس وقت بھی نہیں دھڑکا تھا، جب میں نے
اپنے میکے کے گھر کی دبلز پر سے آخری قدم اٹھایا تھا۔ یا جب ابھی
سرفراز صاحب نے آمہتہ سے دروازہ کھول کر چٹکنی لگائی تھی۔ وہ اسی رفتار
سے جس رفتار سے وہ دروازے سے میز تک گئے تھے، میری طرف آ رہے
تھے۔ ان کے ایک قدم اٹھانے کے بعد دوسرا قدم رکھنے تک ٹھہر پوری
صدی گزر جاتی تھی۔ پھر وہ میرے قریب آ کر رُکے اور میں دکے رہ گئی
اور تب مجھے ایسا لگا کہ میرا خون میری کنپٹیوں کو پھاڑ کر فوارے کی طرح بہنے
لگے گا۔

پھر انھوں نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بہت آمہتہ سے
بولے "آسے پڑھ لیجیے۔" یہ کہ وہ اسی رفتار سے واپس چلے گئے۔
جب ان کے قدموں کی چپا پ رُک گئی تو میں نے وہ کاغذ اٹھایا۔ روشنی
ویسے ہی مدھم تھی اور اوپر سے گھونگھٹ کا سایہ تھا، اس لیے میں نے
میز کی طرف پیٹھ کر کے گھونگھٹ الٹ دیا اور پڑھنے لگی :

نگھٹ صاحبہ ! آج سے مذہب، قانون اور معاشرے
کے اصولوں کے مطابق آپ میری بیوی ہیں، مگر میں چاہتا ہوں
کہ ہماری زندگی کا آغاز بددیانتی سے نہ ہو میں آپ کے
سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے محبت

نہیں کرتا۔ والدین کے مجبور کرنے پر میں نے آپ سے شادی کی ہٹاؤ
بیوی کی حیثیت سے میرا سب کچھ آپ کا ہے، مگر میں معذرت کے ساتھ
عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کو ایک چیز پر مجبور نہیں دے سکوں گا اور وہ
میرادل ہے۔ مرد ہو کر بھی مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں آپ کے سامنے
اپنی زبان سے یہ اعتراف کر لیتا۔ مجبوراً قلم کا سہارا لینا پڑتا ہے
آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب سمجھیں تو ممکن ہے زبانی بات
کرنے میں آپ کو بھی میری طرح جھجک محسوس ہو، اس لیے میری
طرف تشریف لے آئیے۔ آپ پلنگ پر سے اٹھیں گی تو میں
ادھر دروازے کی طرف چلا جاؤں گا۔

سرفراز

شدید تنگ کے احساس کے ساتھ ہی مجھے شدید مسرت کا بھی احساس
ہوا کہ میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔ جو پتھر سرفراز صاحب نے میرے دل پر مارا ہے
وہیسا ہی پتھر میری مٹھی میں بھی ہے اور میرا نشانہ بھی خطا نہیں جائے گا۔ والدین
کی ساری تربیت اور رخصت ہونے سے پہلے اُمی کی ساری نصیحتیں بھول کر میں
تیزی سے اٹھی تو سرفراز صاحب دینر چھوڑ کر ایک طرف چلے اور میں یہ سوچے بغیر
کہ میری آواز اس پاس کے کمرے میں بھی گونج جائے گی، پکارنی نہیں سرفراز
صاحب وہیں ٹھہریے۔ لڑکی ہو کر بھی مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں سچی بات آپ
کے منہ پر اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہ سکوں۔ میں ننگے پاؤں سرفراز
صاحب کی طرف بڑھی۔ آپ کو تو مجھ سے صرف محبت نہیں ہے نہ سرفراز صاحب

مگر مجھے تو آپ سے نفرت ہے۔ مجھے دنیا میں صرف ایک شخص سے محبت ہے اور وہ آپ نہیں ہیں۔ مجھے آپ؟

پھر لمحہ بھر کے لیے میرا دل جیسے رُک گیا اور میرا خون جیسے جم گیا اور میرے چاروں طرف ہر طرف کے گالے سے تیرنے لگے اور میں گرنے لگی۔ میں کہیں نیچے ہی گرتی چلی گئی۔ تب میں نے گھبرا کر سرفراز صاحب کا سہارا لینا چاہا مگر وہ تو مجھ پر جیسے جھپٹ پڑے۔ مجھے اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے وہ میرا چہرہ ٹیبل لمپ کے نیچے لے آئے اور پھر وہ مجھے چھونے لگے۔ میرے چہرے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگے۔ اس وقت وہ رو بھی رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے اور کہتے جلتے تھے، تم تو وہی ہو نگہبت، مگر تم نگہبت کب سے ہو گئیں تھلا تو کروں نام نہ تھا! تمہارا کوئی نام نہیں ہونا چاہیے!

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ چہرہ ذرا سا بھی تو نہیں بدلا تھا، ذرا سا بھی تو نہیں! وہی اجنبی سا، وہی جانا پہچانا سا چہرہ! فرق صرف یہ تھا کہ اس کا ایک نام تھا۔

فنون:



اعتراف

بڈھی جھدارنی نے جب کلام چھوڑا اور اپنے پنڈو پس چلی گئی تو سکو نے غور ہی نہ کیا کہ اس کی جگہ کلام کس نے سنبھالا۔

اس کو تو اس کے جانے کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب سارے دن تجڑوں کے پھاڑے ہوئے کاغذ اور پھل ترکاری کے پھلکوں کے علاوہ برآمدے میں جگہ جگہ دھتے نظر آتے رہے تھے تو شام کو اتنی جاں چھڑی تھیں۔ تو دن ہو گئے اور دوسرا بہتر نصیب نہ ہوا۔

فلش دالے گھروں میں بھی تو ہوتا ہے کہ جھدار کا چلا جانا اس طرح نہیں کھٹکا کہ اس کے جاتے ہی آپادھانی پڑ جائے۔ اور کچھ نہیں تو کوئی شکر جھاڑتا جھدار پکڑ بلایا جائے، مگر اب یہ دوسرا وہی شروع ہو گیا تھا اور بہتر کی ضرورت تو فلش دالے گھروں میں بھی باقی ہی رہتی ہے۔

ہر طرف کی بھینکار کا سارا غصہ اتنی جان نے لال شاہ پر اتارا جس کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بن کے مہتر کا انتظام کرتا۔ تب الی کی جھنیں سن کر لال شاہ میز پر کی سنگ ہیں دم لگے برتن چھوڑ کر منہ پھلالتے مہتر کی تلاش میں نکل گیا۔ مگر سکو کو پتہ نہ چل سکا تھا کہ بڈھی جھدارنی کی جگہ کس نے پُر کی تھی اور

بڑھی جھجھکاری کی بات اور تھی، کئی برسوں سے وہ دونوں وقت گھر کے کرنے کو نہیں لگے تھے پھر تھی فخر آتی تھی اور صلہ کی فات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ نریندر لکھا، اچکی اچکی فیص پنے کف کھلے اس کو گڈیوں کے نیچے پگھلتے دیکھ کر ہنس ہنس کر کہتی "آگیا میرا دھوہا۔ وہ اس سے شادی کرنے کی دھمکیاں کئی سال سے دیتی چلی آئی تھی۔ اتنی کہ وہ اس سے شرمانے لگا تھا۔

اور جب سے صلہ اپنا پورا نقد نکال کر کالج میں داخل ہوا تھا تو اس نے یہ دھمکی دینا بند کر دی تھی اور اس کو دیکھتے ہی یوں کہا کرتی تھی "بیٹی جی! میں صلہ میاں کے بیاہ پر ریشمی جڑا لوں گی۔"

صلہ کی گردن لٹک جاتی تھی۔ پر بدستور اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ چلی گئی تو صلہ کو اس کی جگہ آنے نہ آنے والے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ پھر جب اس دن اس نے اتنی جان سے کہا تھا کہ کوئی جھجھکا رہ نہیں ملا تھا تو لال شاہ سے کہہ کر ہی کرو صاف کروا دیں تو اتنی جان اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نئی جھجھکاری کو تاباں ڈھنسنے لگی۔ "تو یہ لڑکے کا کمرہ ہر روز چھوڑ جاتی ہے۔ نا بھئی اس سے میرا گزر ہرگز نہیں ہونے کا۔ اور بھئی میں کہہ کر دھر جاؤں اتنا بڑا تو گھر ہے۔"

وہ سب کچھ بھول کر اپنی فرم داریوں کا ذکر کرنے لگیں اور صلہ کے کمرے کی صفائی کا معاملہ کٹھالی میں ڈھکیا گیا۔ البتہ دوسرے دن کالج سے واپس پر اسے احساس ہوا کہ کرو صاف ستھرا ہو گیا ہے۔ پھر تو اسے دن جب وہ اتنی جان کے پاس چکی پر بیٹھ کر لکھتے بیٹھا دس روپے کی خد کر رہا تھا تو چانک

ہی سرسرتی جھاڑ اس کی ٹانگوں میں لگی۔ اور وہ جھنجھلا کر لولا۔ مائی تجھے دکھائی نہیں دیتا ہٹ کر بیٹھ۔

اتنی جان منس پڑیں۔ کیسا باؤلا لڑکا ہے! ارے یہ مائی ہے تیرے نزدیک؟ وہ جھجلا گیا۔ ایک نوروز بچے نہیں دے رہی تھیں اور اب بیٹی اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ اس نے پھر بھی نہ دیکھا کہ وہ مائی نہیں تو پھر کیا تھی۔

جھاڑ وہیں اس کے پیروں میں ڈال پک کر وہ کمرے میں گھس گئی جہاں سسلی بیٹی ہوم ورک کر رہی تھی۔ بی بی جی اس کے کچھ اس انداز میں سرگوشیاں کہیں کر رہی بات صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ منگو صاحب تو جھجلا گیا ہے۔ یہ بھی بچی کو کہے منسی روکنے کی کوشش میں وہ فرش پر پوٹ گئی۔

”اے ہٹ کر بیٹھ!“ سسلی نے حاجی انداز میں اس طرح کہا کہ اتنی جان سن لیں اور پھر ڈرے اشتیاق سے بھائی جان کے جھلنے پن کی بات سننے کے لیے اس طرف منوجہ ہو گئی۔

”میں بو کر دیندی بی سی۔ پھر روکر کہے منسی کلا ایک تازہ قارہ اس کے منہ سے نکل کر بکھر گیا۔“ کیندا اے، مائی تجھے دکھائی نہیں دیتا۔“

سسلی بھی منس پڑی اور منگو کو غصہ آنے لگا۔ ایسی کیا بات ہو گئی۔ تو بہ! اور بگڑتے کتنے عقلمند ہیں۔

سسلی کو دو دو حو لیں لگانے کے خیال سے وہ تقنایا ہوا اندر گیا تو اس کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

نئی جمعدارنی تو ایک ذرا سی چھو کر ہی تھی جھلے ہوئے رنگ کے مسخرے

سے چہرے والی جس کا دہانہ قابلِ غور حد تک بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ جو ٹرے چھوڑ کر
دانتوں والی بتیسی ایک اشارے میں کچھ اس طرح باہر آجاتی کہ پچھلے ہونٹ پر
چھتر سا چھایا جاتا۔ سنسنے میں اس کے دونوں ہنسا روں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے
پڑھاتے تھے۔ وہ دہلی پتلی اور بے حد چھپوری سی لڑکی تھی۔

اور اب اگر اس کے سامنے وہ سہلی کر دھولیں لگانا تو حسبِ عادت
وہ اس سے زبانی چلاتی اور اس چھپوری سی لڑکی کے سامنے اس کی بے
عزتی ہوتی۔ جو پہلے ہی اس کو جھیلے کے لقب سے یاد کر چکی تھی۔ اور اب تو
دراصل اس کو قصہِ خود اپنے آپ پر آ رہا تھا کہ اس کو اتنی ذرا سی بات کا بھی نہ
پتہ چل سکی تھی۔ اصل میں اس کا اپنا کچھ ایسا تصور نہ تھا۔ یہ تو اس کی ٹھکر کی اس
منزل کا تصور تھا۔ جب لڑکے سال کے سوا دنیا کی ہر دوسری عورت کو دیکھ کر
سٹ پٹا جاتے ہیں اور خالوں، بھو بھویوں تک کے سامنے آتے ہیں قرآن
کی گردن آپ سے آپ لٹک جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ سٹ پٹا
کر باہر نکل گیا۔

اسے کلج جانے کی دیر ہو رہی تھی اور جوتوں پر پالش نہیں ہوتی تھی۔ وہ
خود اپنے جوتوں پر پالش کر لیتا، یہ تصور اس کے ذہن میں موجود ہی نہ تھا۔ نہ اسے
کسی کام کا ڈھب تھا۔ گھر سے ایک گلاس پانی لیتا تو وہ گلاس جھلکا
دیتا۔ بس اس کو تو اتنی جان کو بکھلانا آتا تھا۔

آری چھوڑ دے بھاڑو۔ انھوں نے ذرہ نہ کو بکھلایا۔ ذرا اس کے جوتوں
پر پالش کر دے۔

اور وہ بیچ برآمدے میں جھاڑو ڈال کر پالش کرنے بیٹھ گئی۔ وہ بچسکڑا مارے بیٹھی پالش کر رہی تھی۔ جوتے، پالش کی ڈبیا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھے تھے۔ ایک جوتا اس نے اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور بڑی محنت اور مشاقی سے برش چلا رہی تھی۔

”شیشے کے مانگ چمکادیاں گی۔“ اس نے نہ جانے کس سے کہا اور پھر ٹھک ٹھک کر کے جوتے پر تھوکا اور رگڑنا شروع کیا۔ بی بی جی، تھوک ٹال جوتا ٹاٹا چمک جاتا ہے۔“ یہ اس کی تھیوری تھی اور اب جو اس کا برش چلاتا رکھنے کا نام ہی نہ لیا۔ وہ ایک دھن کے ساتھ جوتے کو چمکاتے چلی جاری تھی۔

”کم بخت پاگلوں کی طرح جوتے کی جان کو آگئی۔ اب دے چک مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

اس نے جوتا بے نیازی سے صلو کے اگے ڈال دیا اور پھر جلدی جلدی اپنی مخصوص سنائی دینے والی سرگوشی میں بولی۔ بی بی جی! آج معلوم پڑ گیا، صلو صاحب بھی ٹیڈی صاحب اے۔ اک دم ٹیڈی! ”کیوں کیسے؟“ سنی کو بھی اسکول جانے کی جلدی ہو رہی تھی۔ ”جوتا دیکھو، کتنا لو کدار اے، بالکل ٹیڈی جوتا ہے۔“

صلو نے گھوم کر اس سنائی دینے والی سرگوشی کو سنا اور پھر ایک نظر اپنے جوتے کو دیکھا جو آئینے کے موافق چمک رہا تھا۔ جیب سے دوٹی نکال کر اس نے ذریعہ کے سامنے ڈالی اور سائیکل لے کر روانہ ہو گیا۔

ٹھٹھی صاحب داگھڑی والا ہاتھ کتنا شاندار معلوم ہوندا ہے۔ اس کی کالی کالی آنکھیں حجم چار ہی تھیں۔ اور دانتوں کا چھپر گلے ہونٹ پر گر رک گیا تھا۔ وہ جتنی کیلگی اور بے ساختہ تھی کام کے معاملے میں اتنی ہی حلیتی ہوئی۔ سامنے سامنے کی خوب صفائی کرتی تھی۔ بیگم صاحب واسے برآمدے میں ٹانگی لگاتے ہیں اور اندھا اندھ جاتی تھی اور فرش شیشے کی طرح چمکنے لگتے لیکن ادھر ادھر کونوں کھدوں میں کوڑا چھپا جاتی۔ سب سے زیادہ ناقابل اعتنا اس کے نزدیک صلہ کا کمرہ تھا اس لیے کہ بیگم صاحب ادھر بھی جاتی ہی نہ تھیں۔ صلہ کا شمار ان مردوں میں تو کیا نہیں جاسکتا جو کمر بند نہ ملنے پر بھجائے ہیں ٹانگی ڈال کر بڑے اطمینان سے گھومتے رہتے ہیں اور اچھی خاصی باجلی قیصوں سے جوتے پونچھ کر از فاش ہولے کھڑے ان کے گولے بنا کر پانگوں کے نیچے ٹھونس دیتے ہیں۔ اور کپڑے کا کونہ پکڑ کر کھینچ لینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ تو اچھا خاصا سلیقہ مند لڑکا تھا۔ پھر بھی مرد کی ذات آخر کتنا سلیقہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ صلہ کو بہت دن تک احساس ہی نہ ہوا کہ کمرہ سخت بے ترتیب ہونے کے علاوہ گرد و آلودگی ہو رہا ہے اور کونوں کھدوں میں کوڑا کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر فرش پر کاغذوں کی کترینیں اور رنگ برنگ کپڑوں کی چندیاں بھی بکھری ہوئی ہیں۔

لیکن اس روز اتھاروں سے چند روز پہلے وہ خلافت معمولی جلد گھر واپس آیا تو اس نے زمرہ کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ بڑے اطمینان سے

پاؤں پسلائے فرش پر بیٹھی تھی جھاڑو اس کے پیلوں میں پڑی تھی اور وہ کاغذ کی پھول
پتیاں کاٹنے میں منہمک تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو اس کا خون کھوں گیا۔ اتنی
نازک اور نفیس قہنجی جو اس کے ایک قلمی دوست نے کینڈا سے تحفہً بھیجی تھی۔
زرینہ کے ہاتھ میں تھی۔

کیمسٹری کے پریکٹیکل کی لمبی اور سخت کلاپی پورے زور سے اس کے سر پر چڑھ
بد ذات۔ صفائی کرنے کے بجائے اور کوڑا کر رہی ہے۔ پل اٹھ، اسمیٹ یہ سب
گند اور اب اگر میری قہنجی یا کوئی بھی چیز چھوئی تو باد رکھ، ہاں! اُس نے اپنا ایکٹرک
شیور، ٹھا کر دے دکھایا۔ اسی سے تیرا سر مونڈ دے گا۔ یوں سر در برابر بال کریں گے
اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

کالے سیاہ چہرے پر جی ہوئی گرد پر بستے ہوئے آنسوؤں سے کچڑھی اس
کے چہرے پر بہہ نکلی۔ اور وہ آواز نکالے بغیر روتی رہی۔ اور ایک دم ہی صلہ
اپنی نازیبا حرکت پر سٹ پٹا گیا۔ اس کو ہمیشہ سے لڑکیوں پر ہاتھ اٹھالے
کو منح کیا جاتا رہا ہے اور وہ تھا کہ..... خیر اب تو ہاتھ اٹھ ہی چکا تھا۔

اس نے خیب میں سے جو آن نکالی۔ اچھا، چل چپ کر رہے۔ اس کی آنس
کریم کھا لینا اور جلدی جلدی میرا کرہ صاف کر دے، میرے دوست آ رہے ہیں
پھر میں اور پیسے دوں گا۔

فوراً زرینہ کے آنسو خشک ہو گئے اور جھاڑو لے کر وہ صفائی پر پل پڑی۔
گرد سے اکا کر صلہ باہر نکل گیا۔ ابھی اس کو کئی اور کام کرنا تھے۔
پڑھائی کرتے کرتے جب لڑکے تھک کر چور ہو چکے تھے تو انہوں نے یہ

ملے کیا تھا کہ یار پھر ہوجائے نایک کو ک ٹیل پارٹی ساتھ میں ٹوسٹ بھی رہے۔
 اور واقعی راتوں اور دنوں کو بیٹھ بیٹھ کر پڑھ پڑھ کر صلہ کا ایک ایک جوڑ
 بند کر رہ گیا تھا۔ اس یہی جی چاہتا تھا کہ اتنے زور کی ایک انگڑائی تو کہ سارا
 دھودا دھرا اُدھر ہوجائے۔ اور ایسی ہیں یہ ٹوسٹ بھی کیا بڑا رہے گا۔ یہ
 بھی تو تھکے دل اور پیڑاری ہی کی ایک زوردار انگڑائی تھی اور اس کام کے
 لیے صلہ کا کمرہ ہی قرار پایا تھا۔ یہاں اس کے گھر میں ذرا ایسی باتوں پر اعتراض
 کم کیا جاتا تھا اور ہوتا بھی تو بہت ڈھیلے ڈھالے اور دبے ہوئے لہجے میں۔
 پھر یہ کہ فریج بھی اسی کے یہاں موجود تھا۔ بوتلیں تو وہیں ٹھنڈی کی جاسکتی
 تھیں۔

صلہ بوتلیں فریج میں لگا کر واپس آیا تو زربہ اس کو برآمدے میں ملی۔
 صاحب جی، میں نے ایڈری سوہنی صفائی کیتی ہے۔ اس نے بہت لک لک
 اور کھینچ کر بات شروع کی۔

”اچھا لے پھر۔“ صلہ نے ایک دو تہی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔
 اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

چاروں دوست اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تھے۔ صلہ نے ٹیپ ریکارڈ
 کسول لیا تھا اور اب میز پر رکھی ہوئی بوتلوں پر بوتلیں کھل رہی تھیں۔ تقویٰ
 آدھا جگ تو برف کے گوبوں سے بھرا ہوا تھا۔

سیون اپ، کوک، فینڈا، پیپسی کولا کے ملے جلے کوک ٹیل میں نیو اور
 روح افزا کے ساتھ ساتھ نمک نے وہ زور باندھا کہ ہر لڑکا جھوم رہا تھا قدم

مثال کہیں رہے تھے اور پڑ کہیں رہے تھے۔ صلوٰۃ کے غسل خانے کے پردے کے پیچھے چھپی زمین کے خشک اور گھر بھر کی گرد کھائے ہوئے گلے کو ایک عجیب مٹھاس، ٹھنڈک اور تسکین کا احساس ہوا۔

اور پھر اچانک ہی وہ خوف زدہ ہوئی۔ انہوں نے پیچھے شراب ہی نہ پی رکھی ہو!

بلیو جینز اور ٹیکس کے اودھم مچاتے، زمین آسمان ایک کرتے رکاوٹوں کی گت پر ان کے قدم اور دھڑکتی سڑک سے غرک رہے تھے۔ ان گانوں کے بول کیا تھے اور ان کو گانے والے کون تھے، وہ یہ کیا سمجھ سکتی تھی۔

اس کو تو پھر کی کے موافق ناچتے ہوئے یہ تبسم بہت دلچسپ نظر آ رہے تھے۔ خود بخود اس کے قدم ان کی تال پر تال دینے لگے۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ہل رہے تھے۔ ایڑی زمین سے ذرا اٹھی ہوئی تھی۔ پنجے اور تلوے کا اٹکا حصہ پھرتی سے ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کوئی تپتی لوک والا جوتانہ تھا اور پیروں میں کچھ بھری تھی۔ اس کا پنجہ اور تلوے کا اٹکا حصہ بھی جھل جھلانا لگا تھا۔ صلوٰۃ صاحب کے کمرے میں تو پنکھا چل رہا تھا۔ پر غسل خانے میں کوئی پنکھا نہ تھا۔ وہ پسینے میں تر تر تھی اس کے بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔ پھر بھی وہ بے اختیار ان کی تال پر گھوم رہی تھی جیسے یہ ہاتھ پیر اور جی اس کا اپنا نہ ہو، کسی اور کا ہو۔ اور صلوٰۃ اور اس کے ساتھی بھلا کس طرح جان سکتے تھے کہ سیاہ رنگت، چوڑے اور اونچے فائٹرز کے پو کے والی کوئی چھپو ری سی چھو کری منہ پر لٹوریاں بکھرا ہے ان کی نقل ٹری

ذہانت اور خوبی سے کر رہی ہے۔

ان کو تو اپنے سر پیر کی سوجھ بھجی تھی۔ تھکے اور گڑبڑائے ہوئے، جیسے ان کی رگ رگ لچھل رہی ہو اور انھوں نے یوگا کا کوئی ایسا ریاض کیا ہو جس میں انگ انگ کا ناطہ ذہن اور دل سے ٹوٹ چکا ہو۔

پھر شاید انہیں مزید تیز تیز غل مچاتے گانوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے اب ٹیپ ریکارڈ پر کلف کی ٹھیری ہوئی آواز گرجتی دن جاگل ان یو را دم۔

اس گانے والے نے کیا بول گئے تھے، اس کا کیا پتہ تھا مگر یہ آواز دھیمی تھی، پُر سکون اور غم انگیز تھی۔ رفتہ رفتہ کبھر اتنا انگ انگ ایک دوسرے سے ربط قائم کر رہا تھا وہ کھڑے سے زمین پر بیٹھ گئی اور ہلکے ہلکے ہانپتی رہی اور پھر بے خیالی میں با پھر جان کر فصل خانے کے ٹھنڈے اور سفید فرش پر اوندھی بیٹ گئی۔

بددے کے بچے حقے میں سے اب وہ لوگ فرش پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ان کے ادد گئی تہرے خاموش اور سنجیدہ تھے اور وہ سب کے سب اس کو بہت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اور ان سب کے درمیان صلو صاحب کا جانا پہچانا چہرہ۔ جیسے راجے کا بیٹا۔ اس نے سوچا اور زہنی پڑی رہی اور پھر ہانک اس کو خیال آیا۔ یہ صلو صاحب نے یہاں جیسے دیکھ دیا تو دہشت کے مارے وہ کچھلے دروازے سے بھاگ نکل۔ گندے پانی کی ہودی کے پاس کتنی ذریکھڑی وہ اپنی اکھڑی سالیسین درست کرتی رہی۔

اس شام زرنیہ نے سلی کو بتایا تھا: آج صلو صاحب نے پہلے مجھے
چوتی دتی فیروٹی۔ اب تاں میں جا کر ہیکو دی چوک بار کھاواں گی۔ پہلے میرے
سر آتے کاپی ماری، فیروٹی دتی۔ ہورڈھیر سارے ٹیڈی صاحب آتے
تھے۔ ایڈے سو پہنہ، ایڈے سو پہنہ۔ ”وہ سلی کو ہر پلارٹ بڑے
مہانے سے اور اتنا لچا کر دیا کرتی تھی کہ یوں لگتا تھا اسکول میں تو اس
کا دن یوں ہی ضائع ہو گیا۔

پھر اچانک ہی صلو کو محسوس ہوا کہ اس کا کمرہ اتنا صاف ستھرا
رہنے لگا ہے کہ شریف آدمی کو اس کی صفائی کھلنے لگے۔ اور جبہ ہرچہ
کرنے کے بعد واپس آکر وہ اسی جان کو خنجر سے دکھارہا تھا۔ اتنا درد ہے
ہاتھ پیروں میں کیا بتاؤں۔ ”تو اچانک ہی دو ہاتھوں نے پک کر اس
کے پاؤں دبانا شروع کیے۔

اس نے ایک نظر ڈالی، اور گھر کا چل بہٹ پاگل تو نہیں ہو گئی۔
بھئی عجیب بد تمیز لڑکی ہے۔ ”اور وہ فوراً ہی وہاں سے بہٹ گیا۔
”میں آبا کو بتاؤں گا، آبا کو بتاؤں گا۔“ اس کے بھائی اسد نے تالیاں
بجا کر کہا۔ تو وہ جھلا گیا۔

”کیا بتاؤ گے؟“

”میں آبا کو بتاؤں گا۔ بھائی جان نے اپنے کمرے میں صبحہ اور زبانی
کس کس کی تصویریں لگائی ہوئی ہیں۔“
”کیا کو اس ہے؟“ وہ بگڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اندرواغل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ موٹے موٹے چہرے والی دونوں ایکٹرسوں کی تصویریں عین اس کی رائیٹنگ ٹیبل کی ساتھ والی دیوار پر گوند سے چپکی ہوئی تھیں اور اس کی گوند دانی ساری گوند میں تھڑی پڑی تھی۔ اور اس دن دوبارہ اس نے زریںہ لوٹاٹا تھا، کم بخت، گنوار منٹ آیا کر میرے کمرے میں۔

اس لیے کہ اس نے قبول دیا تھا کہ کارروائی اسی کی تھی اور وہ تصویریں ساتھ والی کوٹھی سے ہانگ کر لائی تھی۔

”ایک تو خود اتنی غلیظ ہے۔ بال بکھرے، آنکھیں میچ جاتی، اوپر سے میری ساری دیوار اس کر دی۔“

وہ خاموش گردن جھکائے کھڑی رہی تھی اور اس دن خلافتِ عادت جلد جلد کام کر کے چلی گئی۔

اس شام کو سلی نے اس کو ٹوکا: ”آج تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔“

اس دن اس کے سر سے سرسوں کے تیل کے بھجکے بھی آ رہے تھے۔ خوب جھکا کر بنے ہوئے بالوں اور سرے سے کالی آنکھوں میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ مسخری نظر آ رہی تھی، جیسے کسی نے سوناگ بھرا ہو۔

اور اب صلو صاحب نے بھانے کو صبر کرنے لگا تھا۔ ادھر آیا ادھر نکلا۔ جانے کس چکی میں لگا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے سلی سے کہا: ”اب صلو صاحب بارہ ہرجا دے گا۔“

”بارہ کیا؟“ سلی نے پوچھا۔ ”آوارہ، تو بکر، کاہے سے تو نے کہا۔“

”میرا بھائی ایسے گھوڑا پھرواے۔ خدا دیر تو بھی گھر نہیں بیٹھا دیری
 اتنی کمندی اسے یہ بارہ ہو گیا۔“
 ”چل ہٹ۔“
 اور وہ ہٹ گئی۔

پھر اس نے ایک دن اپنی مخصوص باؤز سرگوشی میں سلنی سے پوچھا۔
 ”نسی ٹکٹیں جمع کرتی ہو۔ مجھ سے لوگی؟“
 ”کہاں سے لائے گی؟“
 ”بس لادیواں گی۔ پردوانی کے چار ملن گئے۔“

”اچھا پھر لادے۔“ سلنی تے ہوم درک کرتے ہوئے بے پروائی سے
 کہا۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ بڈھی جمہدارنی نے بھی ٹھا بھر ٹکٹ لادیئے
 تھے۔ سب بیکار۔ نرے پاکستانی ڈاک کے تھے۔ لیکن جب اس نے پرانے
 لغافے میں رکھے ہوئے ٹکٹ دیئے تو سلنی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
 یہ تو الجھن، یوگو سلاویہ، چین اور ترکی کے ٹکٹ تھے۔

دوسرے دن صلو نے گھر میں غدہ رچا دیا۔ دونوں بھائیوں کو مارا
 اور گھر بھر میں بڑبڑاتا پھرا۔ میری اہم کا ناس مار دیا۔ سارے اچھے اچھے
 ٹکٹ اکھاڑ لیتے ہیں۔

بھائی جان کے ٹکٹ کس نے اکھاڑے ہیں۔ یہ سلنی فوراً سمجھ گئی۔ لیکن
 وہ خاموش رہی۔ بات ہی تو ان سے اس کی لڑائی ہوتی تھی۔ اچھا ہے۔ اللہ
 کرے سارے ٹکٹ خراجاً کر بیچے۔

اور پھر دو چار دن بعد ایک دن صلوٰۃ نے ہنگامہ مچا دیا۔ اس کے لائحے
 ہوئے رسالوں میں سے ساری اچھی اچھی تصویریں کسی نے کاٹ لیں۔ کلفاؤ
 ایلبوس کی تصویریں سلی کے سوا کون چرا سکتا تھا وہ اس سے خوب لڑا۔ سلی
 چاہتی تو زینہ کا نام لے سکتی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر خاموش رہی۔

ہر روز کی طرح سارا کام ختم کر کے وہ صلوٰۃ کے کمرے میں پہنچی۔ طرح طرح
 کی چیزیں صلوٰۃ صاحب کی دور بین، کپڑے، شیو کا سامان، اتنی بہت
 کتابیں اور اکیلا کمرہ۔ یہ سب چیزیں مل کر اس کے ذہن میں اتنا دانگا کرتی کہ
 اس کے اندر کا سویا پڑا شیطان جاگ اٹھا کرتا۔ پھر وہ دہر دہر تک کپڑوں
 والی الماری کے شیشے کے سامنے مٹکا کرتی۔ وہ بھیک بھیک ناک، ہنسنے میں
 گڈھے پڑتا ہوا سیاہ نام چہرہ اور ذرا سی مسکراہٹ پر کھڑے کھڑے
 دانتوں کا باہر نکل آنے والا چوکا، صلوٰۃ صاحب کے ستھرے ستھرے آنیٹے
 میں کتنا مناسب اور نیک سک سے درست معلوم ہوتا۔ پھر وہ لڑتے
 ہاتھوں سے پوڈر کا ڈبہ اٹھا کر گلے کے پاس سے مسکی ہوئی سیلی بساندی
 قیض کا گریبان کھولتی اور پوڈر چمک لینے کے بعد آنیٹے کے سامنے سجدی
 شیشوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ ان کو سونگھتی اور ان کی مہک کے عید
 میں گم ہو جاتی۔ ان میں بڑے ہوتے خوشبو بھرے تیل اور نہ جانے کیا کیا
 اس کے اندر ایک آن جانی امید اور خوشی کو چھوڑ چھوڑ کر بگالتے اور بڑے
 اعتماد سے شیو کے بعد لگانے والے روشن کوبالوں میں چھپتی، شیمپو کو منہ
 ہاتھوں پر مل کر غسل خانے کی سفید چینی والی پمپی کے پاس کھڑی اس کے

نرم نرم جھاگوں سے کھیلا کرتی۔ اور یہ ریشمی جھاگ اس کی روح تنگ کو ریشم کی طرح ملائم کر دیا کرتی۔ پھر ٹپے ٹپے سے منہ دھونے کے بعد میلے میلے پلو سے منہ پونچھتی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر کلک بھور اسی مانگ پٹی سنوار سنوار کر نارنجی گلابوں اور ڈوڑوں کی شکل والے پیلے کلپ لگا کر اپنے سر پا کو سر جتی اور پھر ٹپے کا ٹیناں سے نکھکا کھول کر صفائی شروع کر دیتی۔ کھر کھر جھاڑو میں مار مار کر کوڑا میر کے اور کپڑوں کی الماری کے نیچے دھکیل دیتی۔ پھر لوں بھی ہوتا کہ کمرے کے عین وسط میں بھی ہوئی بھوری دری پر پڑ کر سو جاتی۔ یا پھر کتابوں کی تصویریں دیکھتی اور ان میں سے جو پسند آ جاتی وہ چپکے سے کاٹ بھی لیا کرتی۔

اور آج تو صلوا صاحب مری گیا ہوا تھا۔ کمرہ کتنا سونا سونا ہو رہا تھا جلدی میں صلوا اپنی تصویروں والی البم میز پر ہی بٹول گیا تھا۔ دری پر بیٹھ کر اس نے البم اپنے سامنے کھول کر پھیلائی اور ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے گروپ میں صلوا کاندھے پر ہاتھ رکھے اور اس کے بالکل قریب کھڑے سارچی اور ضلوا دوپٹے میں بلوس لڑکوں کے اس نے خوب منہ چڑائے۔ کبھی بکھساں لوں کھائی؟ اور پھر اودی پنسل کو تھوک لگا لگا کر اس نے دونوں کے چہروں پر گہری گہری مونچھیں بنائیں۔ البم کو ہاتھ سے دھکیلا پکھا بند کیے بغیر نکل آئی اور درمیک جامن کے پیر پر تنگی اودی اودی کھٹ مٹھی جامین کھا کھا کر اپنا خم غلط کرتی رہی۔

اس شام جب امی جان لے اسد کو ڈانٹا کہ بھائی کے کمرے کو الٹ پلٹ کر کے پکھا کھلا چھوڑ آئے تو زربینہ اپنے ہونٹوں اور ٹھوڑی پر پینسل کے ادورے نشانوں سمیت سر جھکائے بیٹھی ٹانگی لگاتی رہی۔

”اے بے کھر کیا بتوا چہ راہا ہو گیا۔ ادھر پیسے رکھے ادھر غائب۔ لال شاہ کے سوا ان کو ہر ایک پر شبہ تھا۔ کئی دن سے پیسے غائب ہو رہے تھے اور تپا نہیں چلتا تھا۔ وہ شخصے سے بھری ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو دیکھا زربینہ آئینے کے سامنے کھڑی لب اسٹک لگا رہی ہے۔ قدموں کی چاپ پر وہ چنگی اور لب اسٹک اپنی شلوار کے نیچے میں کھوس بی پھر جب ان کو اپنی لب اسٹک میز پر نظر نہ آئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ زربینہ نے جو لب اسٹک اپنے نیچے میں کھوسی تھی، وہی تھی۔

اور اب یہ بات سناں ہر چل تھی کہ سٹور کی قینچی کون لے گیا تھا۔ اور اس کی جیب سے پیسے کون نکال رہا تھا۔

وہ باہر نکل آئیں اور بہت دھیمی آواز میں اس سے بولیں۔ ”اری زربینہ کج شام اپنی ماں کو ساتھ لانا۔ مجھے اس سے ایک کام ہے۔“

زربینہ کی ماں اور ان کے درمیان بڑی نجی آواز میں بات ہوئی تھی لیکن انہوں نے سرگوشی کے انداز میں بات کی اور اس کی ماں نے پوری آواز اٹھائی۔ ”جی تم اس کو مارو، سر توڑ دو اس کا۔“

میں کس کس کو ماروں۔ اپنے تچے کم ہیں جو اس کے مارنے کا کام بھی اپنے ذمے لگاؤں۔ تو خود سمجھایا یعنی مار جو تیرا ہی چاہے کر۔“

دوسرے دن اس نے جھاڑ دیتے دیتے سلی سے بڑے فخریہ انداز میں کہا: آج میں جلدی جاواں گی۔
 ”کیوں؟“

”آج میری اتنی مینوں گلجے جاوے گی۔“

”گرچہ؟ کیوں؟“

”تم کو نہیں پتا، ہم کنفیسیں کرنے جائے گا۔ وہ ایک دم کھڑی بولی پر اتر آئی۔“

”کیا پتہ نہیں کیا بولتی ہے؟“ سلی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”بیڑا فادل ہوندا اے۔ اس کے سامنے کنفیسیں کو ہم تو سائی ہیں نا۔“

جیڑا کم خواب ہوندا اے اس کے پاس بولتے۔“

”اچھا کنفیسیں کے لیے جائے گی!“

”ہاں اور کیا۔ ہم تو سائی ہے۔ میرا اصل نام جریزہ شھوڑی ہے میرا نام

نوکر میں ہے۔“ وہ پھر اس انداز میں مٹکی کہ سلی کو ایک بار پھر اپنی کمتری کا احساس ہوئے لگا۔

سلی کی پھولدار پرانی قمیص، اچکی اچکی نیلی شلوار اور پیلا دھڑلہ اوڑھے

پٹیاں سنوارے وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے گرجا کی طرف چلی۔ وہ بار بار

اپنے ڈوڑوں کی شکل والے کلپ درست کر رہی تھی۔ اور جلی کھڑی جیسی سیاہ

انگلیوں کی نوکوں پر جیتے جیتے خون کے رنگ میں ڈوبے ناخنوں کو بار بار

دیکھ رہی تھی۔ بات بات پر باہر نکل آنے والا چوکا اس وقت بالکل اندر تھا۔

اور نیلے بونٹوں والا دہانہ ایک لمبی سی تپ کی شکل میں یہاں سے وہاں تک نہایت ذمہ داری سے کنچا ہوا تھا۔ وہ سُرخ و سفید لمبے چوڑے سفید بلبا اور کالی پٹی والے نادور کے سامنے جا رہی تھی جس سے وہ ہر چند وہ دن کے بعد امرکین دودھ کا ڈبہ لینے آیا کرتی تھی۔ اور اب ہر بات اسے سرخ پرک تا دینا تھی۔

مگر گرجا کے دروازے پر اس کو جونا در ملا وہ سُرخ و سفید بلبا چڑا نادور نہ تھا۔ اس کے بجائے وہ جس کے حوالے کی گئی تھی وہ چوڑے کی طرح سفید بہت دبلا اور بلبا نادور تھا جس کی سنہری ڈاڑھی جھوٹی ہی اور نیلی آنکھیں روٹھے ہوئے بچے کی طرح چُپ چُپ تھیں۔

کنوار سی مریم کی مقدس قربان گاہ کے قریب دوڑا نو ہو کر اس سیاہ خام لڑکی نے مختلف اعتراف کیے۔ چھوٹے چھوٹے اور قطعی غیر سنگین اعتراضات گویا وہ چھوڑ کر ہی اور اس کی ماں بھتیجی ہوئی ان شمعوں کے سامنے محض اس کا مذاق اڑانے آئی ہوں۔ بھلا یہ بھی کہنے اور سننے کے قابل باتیں تھیں۔ میں نے ٹیڈی صاحب کی ٹکسوں والی کتاب سے ٹکس چرا کر سلی بی بی کے ہاتھ دے رکھے تھے۔ بورصہ صاحب کی تینچی ٹھالی سی۔

”سیکیوں! سنہری ڈاڑھی اور چپ چپ سی آنکھوں والے نادور نے رعب دار آواز میں پوچھا تو وہ بوکھلا کر اپنے ناخن دانتوں سے کترنے لگی۔“

”ہو میں بیچ صاحب کے صندوق کھڑے وہاں چرائی اور اٹھ پانی بھی کھٹھی سی۔“

یہاں وہ رُکی اور اس کے کانوں میں اپنی ماں کی وہ آواز گونجی جو اس نے گرجا کے پچانگ پر اس سے کہی تھی۔ "ساری بات بتاؤ کوئی گل پھپھائیو مت۔"

"نادرجی۔ میں اس کر کے لپ اسٹک کا ٹوپ۔۔۔ اس کا دل بھڑک اٹھا۔ اور وہ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔
"اچھا اچھا۔ کوئی گل نہیں۔"

"قلعی واہیات اور غیر سنگین اعتراضات؟ وہ طر بڑایا۔ وہ دونوں قربان گاہ کے پاس سے بٹ کر باہر نکلنے کو تیار ہوئے تو گرجا کے اندر مکمل خاموشی اور تنہائی تھی۔

"اور تو نے پوری بات تو نادرجی کو بتائی نہیں؟ اس کے دل کا چور بار بار سے ملامت کر رہا تھا۔ دور و نیشہ ستوں کے درمیان سے گزرتے گزرتے بات اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ لکی جھجکی اور بولی: نادرجی، اک ہر گل وی دسنی سی۔" اس کی آواز جرم اور ندامت سے بھر پور تھی۔

"بولو! وہ پراسیدانڈاز میں مڑا۔ وہ دونوں دروازے کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے۔ قربان گاہ بہت سمجھے رہ گئی تھی۔ اور وہاں ایک جی ٹیمع روشن نہ تھی۔

"نادرجی۔۔۔ میں۔۔۔ اس نے دوپٹے کا پلو اپنے دانتوں تلے کھلا۔۔۔ میں جی ایٹیلی صاحب ہوئے نا۔ جیڑا صلہ صاحب اسے۔ میں

اس کو بھی — — — اوہ — — —

”کیا بات ہے، فادر، تجھ بھلا لایا۔ اور یہ پہلا پہلا اعتراف تھا جو اس نے سنا تھا۔

”وہ بیٹوں پیارا۔ — — — بیٹوں بڑا ہی سوہنا لگدا اے۔ ہر میں اس دی ست بڑی بھی چرائی سی۔ اے دیکھو۔“

زربینہ عرف گریس ولد جونف مسیح نے اپنی ضلوع اور کانیفہ ٹٹول کر ایک ٹری تڑی تصویر برنگالی۔ اور فادر کی نیلی آنکھوں نے جھک کر اس تصویر کو دیکھا ایک عام سے اسارٹ لڑکے کی چمرائی ہوئی تصویر کے مقابل زربینہ عرف گریس کے چہرے پر اس کا دہانہ ایک طویل تب کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ چہرے کی سیاہی میں اس کی آنکھیں روشن ستاروں کی طرح جگمگاتیں۔ اول اب اس کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے اس نے سارے قرضے چکا دیئے ہوں۔ چپ چپ سی آنکھوں والے فادر نے خاموشی سے گرجا کا دروازہ کھولا دیا۔

اور جب وہ لاپرواہی اور لگن پن سے جھولی میں پڑے مکا کے والے بھاگتے ہوئی اپنی ماں کے پیچھے چلی تھی تو اسی وقت سیڑھیوں کے نزدیک سے گذرتے ہوئے لڑکے کے ٹرانسپیرنے آواز لگائی۔

”گوٹ آفٹی فیلنگ — — — فالن ان لوو و دیو!“

فادر نے زربینہ مسکرا کر خاموشی سے اپنے سینے پر لٹکی ہوئی سیلیب کو درست کیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

خون

۳۱ مارچ

تب اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہہ کیا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی ساری پسلیوں کو شمار کیا اور طے کیا کہ وہ آگ سے سالم نکل آیا۔ اسے اپنی کئی دلتوں کا خیال آیا۔ مگر پھر اس نے غیر جذباتی، غیر جانبدارانہ، لازم فیضیہ کیا کہ: تیس تجربے کا حتمہ میں۔ اور آدمی بننے کے لیے اُن سے گزرنا ضرور ہے تو وہ اب آدمی بن گیا ہے اور اپنی ذات میں مکمل ہو گیا ہے، اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ طے کیا اور مطمئن ہو گیا۔

وہ اب مکمل تھا اور فارغ تھا۔ فراغت کے ساتھ بھولے ہوئے کام یاد آئے۔ اس نے ایک احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ان سارے کاموں کی اہمیت کو محسوس کیا جو کتنے دنوں تک غفلت کا شکار رہے تھے کتنے دنوں تک؟ ایک تحقیقی جذبہ کے ساتھ اس نے اپنی ڈائری کھولی۔ اندھے جذبے کے گرداب سے وہ نکل آیا تھا۔ اب صرف تحقیقی جذبہ کام کر رہا تھا۔ یکم مئی ۶۵۸ اور آج مارچ کا آخری دن ہے۔ ۳۰ مارچ ۶۵۹ گیارہ مہینے گیارہ مہینوں میں سب ہی مراحل گزر گئے۔ مگر اس سورج میں کسی تاسف کا رنگ نہیں تھا۔ وہ تو بے تعلقاً نہ اپنا حساب کتاب کر رہا تھا۔ یکم مئی ۶۵۸ کی تاریخ بھی تو اس نے بڑی

پرتھتی سے تلبند کی تھی اور اس تاریخ کے بعد سے اس نے اپنی تھوڑی سی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ ایسے کسی قصے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یوں وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے حساب میں دانا بیابان گیا تھا اور یہ جان گیا تھا کہ محبت کے بغیر آدمی مکمل نہیں ہوتا۔ مگر خود اپنی تکمیل کی وہ نیت نہیں رکھتا تھا۔ اپنی تکمیل کی نیت اسے ایسے کے یہاں بھی نظر نہیں آئی۔ اور ایسے پر اسے شروع میں ایک خشک بے رنگ پارسل کی کا گمان ہوا تھا۔ ایسی لڑکی سے بھلا محبت کی جاسکتی ہے! اس نے قطعی انداز میں سوچا اور اسے اپنے ذہن سے یکسر خارج کر دیا۔..... مگر پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ آخر یہ بات اس کے ذہن میں آئی کیوں؟ اب تک۔ تو اس لڑکی کے متعلق کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ دانا بیابان تو وہ بہت بدلتا تھا نا۔ اس نے سوچا کہ ذہن میں کسی خیال کا آنا خود ایک خطرے کی گھنٹی ہے اور بعض قصے بہت اڑکھے طریقوں سے شروع ہوتے ہیں تو اس نے احتیاطاً ڈائری میں تاریخ نوٹ کر لی تھی کہ کس دن ایسا خیال پہلی مرتبہ اس کے دماغ میں آیا۔ یہ سوچ کر کہ مبادا کوئی قصہ شروع ہو جائے اور قصے کی انتہاء معلوم ہو یا ابتداء تو معلوم ہونی چاہیے۔ اب اس قصے کی ابتداء اور انتہاء اس کے سامنے تھی۔ یکم مئی ۱۹۵۸ء کو آغاز ہوا۔ آج ۳ مارچ ۵۹ء کو اس کا انجام ہوتا ہے۔ محبت اور کیلنڈر وہ اپنے آپ پر تھوڑا ہنسنا۔ گھر اس عہد میں اس کے سوا چارہ کیا ہے اور محزون بننے سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی کیلنڈر کو سامنے رکھے اور اس نے یکم مئی کی تاریخ معروضی انداز میں نوٹ کی تھی۔ اور اس کے بعد اپنی نگاہی شروع کر دی

تھی جب انیسہ کا خط آتا تو وہ اپنے آپ سے دُور کھڑے ہو کر اپنے آپ پر اس خط کے اثرات کا مشاہدہ کرتا۔ جب انیسہ کا فون آتا تو ایک حسن فون پر باتیں کرتا اور دوسرا حسن فون پر باتیں کرنے والے حسن کو تاڑتا رہتا اور انیسہ فون پر بات کرتے کرتے اچانک رُک جاتی، ایسے جیسے ریشم کی لمبی ڈوری میں ٹخنی سی گرہ پڑ جائے۔ گرہ پڑ جانی اور پھر ریشم کی ڈوری کھینچنے پہلی جاتی۔ پھر گرہیں بڑھتی چلی گئیں اور ریشم کی ڈوری کھینچنے پہلی گئی۔ اور دوسرا حسن نگیمان بنایا مشاہدہ کرتا رہا۔ کہ پہلا حسن کس بے تابی سے فون کا انتظار کرتا ہے اور بات کرتے کرتے کیا کیا گڑبڑاتا ہے۔ ریشم کی ڈوری میں الجھتا ہے مگر نگیمان کرتے کرتے وہ بھی فون کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اور اس کی نگارنی ڈھیلی پڑتی پہلی گئی۔ اور گیارہ مہینے غرق ہو گئے۔ زندگی کے گیارہ مہینے افروزی کی ایک ہلکی لہرائی اور گزر گئی۔ وقت کے اس زیاں کو وہ مسئلہ بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پھر سے سرگرم ہونے کا جو جذبہ کر لیا تھا۔ توبہ کا ندھ پر ڈال پک جھپک غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

اس نے غسل غسل صحت کی مثال کیا، جیسے کوئی لمبا سفر کیا ہو۔ اور مہنا دھو کر ماری گرد، ماری تھکن اتار دینا چاہتا ہو۔ جیسے وہ غم و غصہ کی گرد میں اُٹا ہوا تھا اور ذلتوں اور رنجشوں نے اُسے میلا کر دیا تھا۔ اٹھان کیا اور وہ پوتر ہو گیا۔ غسل خانے سے وہ اپنے پھول بدن اور خوشبودار وح کے ساتھ ایک نیا آدمی بن کر نکلا۔

کھڑے بدلتے بدلتے نظر اس نیلے خط پر جا پڑی۔ جو پرسوں سے میز پر

کھلا پڑا تھا۔ یہ خط میرا ماضی ہے۔ ماضی قدیم۔ اس خط کو اٹھا کر اس نے یوں پڑھا جیسے وہ کسی قدیم قلمی نسخے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جس بے تعلقی کے ساتھ اسے اٹھا یا تھا اسی بے تعلقی کے ساتھ اسے پھر میز پر ڈال دیا۔ نہایت دایبیت خط ہے۔ اس میں اس نے کچھ بھی نہیں لکھا مگر اس نے کب کس خط میں کچھ لکھا تھا۔ اک تلخ سے احساس کے ساتھ اس کے سب خطوط کو دھیان میں لایا۔ فضول بے معنی دایبیت خطوط، مگر اس وقت وہ کتنے بامعنی، جذبے سے کتنے ہرگز نظر آتے تھے خط کا آنا ایک روحانی واقعہ بن جاتا تھا۔

”یارو لڑکی ہے نہیں، میرا مطلب ہے افسوس“ وہ اس خوشبو کو دونوں اپنے ناف میں چپائے پھر تار یا مگر آخر وہ خوشبو ہونٹوں کی راہ پھوٹ پڑی۔
”یارو مجھے خط بہت لکھتی ہے۔“

”اچھا؟“ مقصود نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔ اور تم؟
”میں بھی بہت خط لکھتا ہوں۔“

”دومانس؟“ عزیز نے بے تکلفانہ ٹکڑا لگایا۔

اس بے تکلفی پر حسن بہت سٹپٹا۔ وضاحتی بلکہ معذرتی انداز میں کہا:
”نہیں یار ویسی بات نہیں۔ ہماری خط و کتابت آپ کی کل مسائل پر ہوتی ہے۔“
”آپ کی کل مسائل پر؟“ عزیز جھڑک گیا۔ ”آپ کی کل مسائل پر خط و کتابت لڑکی سے؟“

”اس نے پھر معذرت کی۔“ یارو لڑکی ویسی نہیں۔
”کیسی نہیں؟“ عزیز نے غصے سے کہا۔

اور اس نے دبے لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت سنجیدہ لڑکی ہے یار۔“
 عزیز نے اُسے غصہ سے دیکھا اور کہا۔ ”دیکھو حسن، ہر لڑکی سنجیدہ ہوتی
 ہے مگر کوئی لڑکی سنجیدہ نہیں رہنا چاہتی۔ اور ہر لڑکی جو کالج میں پڑھ چکی ہے
 اٹلیکچرل خط لکھے گی۔ مگر کوئی لڑکی یہ پسند نہیں کرے گی کہ اس کے اٹلیکچرل خط
 کا جواب اٹلیکچرل خط سے دیا جائے۔“
 ”مگر اس“ مقصود نے عزیز کو مختصر آمیز نظروں سے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ عزیز نے سوال کیا۔

”مطلب یہ ہے کہ تعینم یافتہ لڑکی کی نفسیات کو سمجھنے سے تم تا صبر ہر تعلیم
 یافتہ لڑکی یہ دیکھتی ہے کہ کیا آپ اس سے ذہنی طور پر برتر ہیں۔ ذہنی لحاظ سے
 اپنے سے کمتر کو وہ قبول نہیں کر سکتی۔“

اصل میں عورت کے بارے میں تصور اور عزیز کے الگ الگ نظریات تھے۔
 عزیز کہتا تھا کہ عورت سفلکس ہے۔ جو عورت تمہارے پاس آتی ہے وہ اک
 سوال بن کر آتی ہے۔ اگر تم نے اس کے سوال کو سمجھ لیا تو تم نے اسے توڑ دیا۔ نہیں سمجھا
 تو وہ تمہیں توڑ دے گی۔

مگر مقصود نے ادبی بات کہی، حسن تمہارے ساتھ وقت یہ ہے کہ عورت
 کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے۔ مگر محبت کڑی کمان بنے رہنے کا نام تو نہیں ہے
 اس میں اپنے آپ کو توڑنا پڑتا ہے۔“

اس نے کچھ باتیں عزیز کی سنیں، کچھ باتیں مقصود کی گردن باندھیں۔ کچھ
 باتیں اس نے کانوں میں پڑھی تھیں۔ اور کانوں میں باتیں پڑھنے کے بعد اس نے

اپنے متعلق طے کیا تھا کہ وہ رومانٹک آدمی نہیں ہے۔ مگر ان دنوں مختلف نظریات و تصورات اس کے دماغ میں گڈمڈ تھے اور اس نے ہر پریشان ہو کر مقصود سے کہا: "یار میں تھوڑا سا بے وقوف نہیں ہوں؟"

مقصود نے اسے دیکھا اور دلاسا دیا: "ہر عاشق بے وقوف ہوتا ہے۔ محبت چالاکی کا نام نہیں ہے۔"

عزیز نے مقصود کو تحقیر کی نظر سے دیکھا اور پھر اس سے مخاطب ہوا: "جس نے یہ تمھاری خط و کتابت بہت لمبی ہو گئی۔"

"ہاں یار کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔" اس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔
"اسے مختصر کرو۔"

"مگر کیسے کروں؟"

"دیکھو دنیا میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔ "عزیز کا اور بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ خط لکھنے والی لڑکیوں میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جو اپنے خطوں میں فلمی مکالموں سے استفادہ کرتی ہیں، ایک وہ جو اسٹیلکچرل قسم کے ناولوں سے استفادہ کرتی ہیں۔ مگر لفظ خواہ وہ فلمی ٹائی لوگ ہو خواہ وہ جو اس سے ناخوذ ہو عمل کا بدل نہیں ہے۔ خیر فلمی مکالموں سے استفادہ کا تو ایک حجاز ہے۔ مگر اسٹیلکچرل ناولوں سے استفادہ کر کے خط لکھنا سخت مبتذل حرکت ہے۔ خواہ یہ حرکت تم کو زیادہ کرے۔ تو پیارے لفظوں کے اس مبتذل کو ختم کرو۔"

"مشکل ہے۔" اسے اس مبتذل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے

رہا تھا۔

”پھر اس قصہ پر ہی خاک ڈالو۔ اس لڑکی پر لعنت کیجھو ورنہ تم مارے جاؤ گے
پوچھو کیوں؟
”کیوں؟“

”دہریوں کی محبت کوئی دینی چیز تو ہے نہیں۔ ہر عہد باقی صورتِ حال کی ایک
قدت ہوتی ہے۔ اور اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے اس مدت
میں پورے ہونے چاہئیں۔ اگر مردان تقاضوں سے کترائے گا تو عورت اس
پر لعنت بھیجے گی۔ اور متنفر ہو جائے گی۔ اگر عورت دامن بچائے گی تو مرد
اسے ٹھوکر مارے گا۔ اور الگ ہو جائے گا۔ تو قبل اس کے کہ وہ تم پر لعنت
بھیجے اور تم سے متنفر ہو۔ تم اسے ٹھوکر مارو اور الگ ہو جاؤ۔“

مقصود نے عزیز کو سخت حقارت سے دیکھا اور چپ ہو گیا۔

عزیز نے دونوں دوستوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا اور حکمانہ لہجہ
میں کہا: ”حسن، تم اسے ٹھوکر مارو۔“

”عورت کو تم اس کی عزت کر کے ہی جیت سکتے ہو۔“ آخر مقصود کو پوتا

ہی پڑا۔

”عزت اور عورت کی؟“ عزیز نے تعجب سے مقصود کو دیکھا۔ عورت کو
سجدہ کرو، عورت تمہارے سر پر سوار ہو جائے گی۔ تم سے کثرت کرے گی۔
عورت کو ٹھوکر مارو۔ عورت تمہارے قدموں پر گرے گی۔“

وہ دو پھیر توں کے درمیان لڑا حک رہا تھا۔ کبھی وہ انیسہ سے یوں بھڑا

جیسے وہ سپاہی ہے اور اسے اس قلعہ کو فتح کرنا ہے کبھی یوں جھکا جیسے دو بجلیاں
ہے اور اندر میں داخل ہو رہا ہے۔ مگر موت اور عورت، ان دونوں کے سامنے
آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ اپنی ہی بصیرت ہو تو کام آتی ہے۔ موت اور عورت۔ وہ
موت اور عورت کی زد سے نکل آیا ہے۔ اس نے ایک دفعہ پھر اطمینان کا سانس
لیا۔ مقابلے کی بصیرت نہ ہو تو پیر لٹکنے کی بصیرت ہونی چاہیے۔

وہ اپنے آپ کو پیر لٹکنے کی بصیرت پر دوا دے رہا تھا اور کپڑے بدل
رہا تھا۔ عجلت میں کپڑے بدلے عجلت میں ناشتہ کیا۔ آج پہنی تھی اور اسے
بہت کام بنانا تھا۔ ناشتہ کرتے کرتے اس نے اخبار پر بھی ایک نظر ڈال لینے
کی کوشش کی۔ ۳۱ مارچ۔ اس نے اخبار کی تاریخ کو پھر غور سے دیکھا۔ تو گویا آج
پہلی نہیں ہے۔ یعنی مارچ کا مہینہ ختم ہوا ہے۔ یعنی اپنی میعاد تمام نہیں ہوئی ہے
مگر دوسرے سانس میں اس نے سوچا کہ جبکہ کھانا کھا گیا۔ کھانا کھانے میں اپنی ڈائری
کھڑکچکا ہوں۔ اب یہ کھڑاگ ایک دن کے لیے دوبارہ شروع نہیں کیا جاسکتا۔
جب پوری طرح تیار ہو گیا اور گھر سے نکلنے کو تھا تو اسے خیال آیا کہ کیا
اسے واقعی آج ہی سے زندگی کا نیا پروگرام شروع کرنا ہے۔ مگر طے تو یہ ہوا تھا
کہ مارچ کے ختم تک پیر لٹکاؤ گرام چلے گا اور مارچ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تو کیا میں
اسی تجربے کی تجدید کروں؟ تجربہ؟ کیا میں واقعی کسی تجربے سے گنہگار ہوں؟
اس نے شک بھرے انداز میں سوچا۔ یہ شک اس فتنہ میں بار بار اس کے
یہاں پیدا ہوا تھا۔ یہ میں اتنے طول طویل خطرہ کیوں لکھتا ہوں۔ میں نے
محنت کو ایک علمی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک سیدھا سچا انسانی

نخربہ ہے۔ اس احساس کے تحت اس نے اپنے مبارقہ قلم کو لگام دی، مگر پھر اس کی سمجھ میں بہ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ کہا میں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا، اس وقت وہ ایک قطعی معروضی انداز میں اپنے اقدام پر عیا کہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے یہ کیا تھا اس وقت تو اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس نے صحیح کیا یا غلط کیا۔ مقصوداً و عزیمت میں بھی اختلاف رائے تھا۔

”یہ قوف یہ بات کہنے کی تھی؟ عزیز نے غصے سے کہا۔

”یار بس میں نے کہہ دیا۔“

”اس نے کیا کہا؟“

”اس نے؟ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا اور آواز جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اس نے بڑی مشکل سے ساتھ چھوڑتی آواز کا سہرا پکڑا۔ اس نے.....

کچھ نہیں کہا اس نے..... خفا ہو گئی..... گئی۔“

مقصوداً سے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دردمندانہ لہجے میں

کہا: ”حسن تم نے بہر حال ٹھیک کیا، آدھی کو اس معاملے میں ایمان دار رہنا چاہیے“

”مسٹر مقصود! عزیز بولا۔ ایمان داری سے جنت ملتی ہے عورت نہیں ملتی۔“

اس نے عزیز اور مقصود کے اختلاف کو نظر انداز کیا اور کہا: ”یار بات یہ

ہے کہ میں رومانٹک آدمی نہیں ہوں۔ اور ہر تجربے کی اک عمر ہوتی ہے۔

میرے تجربے کی عمر پوری ہو چکی۔ ویسے میں عجلت پسند نہیں ہوں۔ میں نے

نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں اس مسئلہ پر سوچا ہے اور ایک ہفتے کا باجی

دیا ہے۔“

مقصود نے تھوڑا بیزار ہو کر سوال کیا۔ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟
 تیسری مراد یہ ہے کہ آج مارچ کی ۲۳ ہے۔۔۔ یہ مہینہ پیر سال اپنے
 تجربے کے لیے وقف ہے اس سے کچھ ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ میں مہینے
 کے ختم پر قطعی طور پر اس تجربے کے ختم کا اعلان کر دوں گا۔ آدمی کو حقیقت پسند
 ہونا چاہیے۔ اور میں رومانگ نہیں ہوں۔“

”بالکل ٹھیک بات ہے۔“ عزیز نے تائیدی لہجے میں کہا۔ بات یہ ہے
 کہ ہمارے عہد میں محبت کے تجربے کی کمر اتنی طویل نہیں ہو سکتی جتنی مجنوں اور
 فریاد کے عہد میں ہو گئی تھی اور ان کے لیے عشق ہول ٹائم جوب تھا، ہم اسے
 پارٹائم ہی کر سکتے ہیں اسے لمبا نہیں چلا سکتے۔“

تو اس نے تجربے کو نبایا نہیں چلایا یا اس نے پھر ایک اطمینان محسوس
 کیا۔ مگر آج ۳۱ مارچ ہے۔ اسے اس خیال سے الجھن ہونے لگی کہ مہینہ ختم
 نہیں ہوا ہے۔ مارچ کی اکتیس اگر مارچ ہی کا حصہ ہے تو میرے تجربے کی میعاد
 ختم نہیں ہوئی۔ اگر میرے تجربے کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ تو آج کے دن کو کڑا
 کی اکتیس ہے کس خانے میں ڈالا جائے۔ گزرتے بسترے دنوں میں کوئی کوئی
 دن عجیب طرح اڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کسی خانے میں مقید ہونے سے انکار
 کر دیتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ آج کا دن اُسے کیسے گزارنا ہے۔ پورا
 دن خالی کچھ سبب ایک پہاڑ کی مثال اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتابوں پر نظر ڈالی۔ کتابوں کو اس
 نے کتنے دنوں سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ الٹ پلٹ کتابوں پر گرد کی تہ جمی

دیکھ کر اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں آج کتابوں کو درست کر کے رکھ دو۔

دینک وہ کتابوں کو جھاڑا۔ جھاڑو پونچھ کر قرینے سے ترتیب دیتا رہا۔

الاماری میں کتابیں بجانے کے بعد میز پر بکھری کتابوں کو جمع کیا، سلیپے سے ترتیب دیا رڈی کا غڈ کچھ چپاک کیے کچھ تو ٹیڑھ کر ڈی کی ٹوکری میں ڈالے پھر وہ نیلا خطا ٹھایا چونکہ اس خط میں کوئی خاص بات لکھی ہوئی نہیں ہے اس لیے اسے محفوظ رکھتا ہے سود ہوگا۔ اسے کھول کر ایک اڑتی سی نظر ڈالی۔ میں اپنی تنہائی کے جہنم میں اچھاپ کو محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ یہ خط؟ اسے تھوڑا تعجب ہوا۔ یہ تو بہت پہلے کا خط ہے۔ اب تک میز پر کیسے پڑا ہے۔ اس نے یاد کیا کہ یہ خط کب آیا تھا اور اس کا کیا جواب دیا تھا۔ میری اکیلی ذات میرا جہنم ہے میں اس سے نکلنا چاہتا ہوں۔ رومانا شرم۔ وہ حقارت کی ہنسی بنسا اور اپنے خلاف قرائف مذمت منظور کرتے ہوئے اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس نے عاشق کا لبادہ اوڑھ کر اس قسم کے کتنے رومانی فقرے اسے لکھے ہوں گے۔

اس خط کو اس نے اچھا ناسا تو ٹیڑھ کر ڈالا تھا کہ اسے وہ رڈی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہتا تھا مگر پھر اس نے یونہی نادانستہ وہ خط کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ خط پورا پڑھنا چاہیے۔ آخر وہ کہتی کیا تھی۔ ایک دفعہ پڑھا۔ آخر کتنا کیا چاہتی ہے۔ وہ پھر شروع سے پڑھنے لگا۔ اب کے اس نے ایک ایک فقرہ غور سے پڑھا اور ایک ایک لفظ پڑکا خط ختم کرتے کرتے اسے ایک مبہم سا احساس ہوا کہ اس کے اندر جہاں میل کچھ کچھ بھٹ رہا ہے۔ پھر اس نے یونہی بے ارادہ اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کتابیں صاف کرتے کرتے بہت میلے ہو گئے تھے اس نے

ہاتھ دھال سے صاف کیے روبرو سے خط کو کھٹا اور احتیاط سے لفافہ میں بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

ڈھیر ساری کتابیں صاف کرنے اور جاننے کے کام سے وہ تھک گیا تھا۔ یہ تھکان تھی یا شاید وہ اداس ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو تصور کا درجہ کھل گیا۔ نیلے کاغذ پر سجے ہوئے سب لفظ جی اُٹھے اور تصور میں منڈلانے لگے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ ابھی قلم سنبھالے اور لفظوں کے جواب میں لفظ لکھے۔ اس کی انگلیوں میں وہی اضطراب پھر جا گئے نگاہ پھیلے دونوں خط لکھنے سے پہلے پیدا ہوا کرتا تھا۔ جب وہ قلم اٹھاتا تو سارے بدن کا جی انگلیوں میں اتر آتا۔ پوروں میں آکر ٹھہر جاتا اور لفظ قلم سے کاغذ پر یوں لکھا جاتا جیسے ہرنٹ ہونٹوں پر بوسہ نقش کرتے ہیں۔ مگر پھر اس نے فوراً بھر پھری لی۔ قصہ پاک ہو چکا ہے۔ اب جو میں نے سوچا وہ محض رومانسزم ہے کیسبج وقت ہے۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر تھک جانے کے باوجود نیند نہیں آئی پھر کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ بہت سے صفحے پڑھ گیا مگر پھر نیز اڑھ کر کتاب بند کر دی۔ اصل میں اس نے اپنے رومانسزم پر قابو تو پایا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اندر کسی علاقے میں بدستور بغاوت کی آگ بجھ کر ہوئی ہے۔ جیسے یہ باغی علاقہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے گا۔ اس نے بغاوت کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اور اپنے ارادے کو پورے شعور کے ساتھ بروئے کار لایا۔ بدامنی پھر بھی قائم رہی۔ جیسے دو سانڈ میں کہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اسے لگا جیسے وہ ٹوٹ رہا ہے۔ جیسے یہ دو سانڈ آپس میں ٹکراتے رہیں گے۔ اور اس کی

بستی چم کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ اس نے، کہ علم و حکمت کے موتی کتابوں سے
 ہیں جن کو اپنی شخصیت تعمیر کی تھی، محسوس کیا کہ اس کے اعضاء تولدی سے بڑے
 ہوئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جوڑ بند کھل رہے ہیں کہ وہ ایک طبقہ
 بننا جا رہا ہے۔

یکم اپریل

اس نے اس فقیر کی صورت صبح کی جھن کے اعضا رات کو کھر جاتے اور
 صبح کو بڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکٹھا کیا اور اطمینان کا سانس لیا کہ
 مارچ گزر چکا ہے اور وہ صبح و سائلم نکل آیا ہے۔

بستر سے وہ ایک الکسا بٹ کے ساتھ اٹھا، آئینہ دیکھا۔ میل چپڑ پھری
 آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا کہ کتنے برسوں سے وہ نہیں نہایا ہے۔ تولیہ
 کا ندھے پر ڈال دہ غسل خانے میں چلا گیا۔

ہنا دھو کر کپڑے بدلے، بال سفارے، چلتے چلتے میز کی چیزیں درست
 کیں، نیلے خط کو بے تکلفی سے دیکھا۔ مٹھی میں تل رڈی کی گوکری میں ڈال دیا۔
 پھر باہر نکل گیا۔

جب گھر سے وہ نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی
 تھی چار قدم میں نہایا دھویا سب برابر ہو گیا۔ بس کے اڈے پر ابھی خاصی بھڑ
 تھی، کئی بسوں کو اس نے یہ سوچ کر گذر جانے دیا کہ ان میں رش بہت ہے
 لیکن جب رش کسی صورت کم نہ ہوا تو محبت کی اور مار توڑ کر تا بس میں گھس
 گیا۔

پہننے میں بھیجے گیا مسافر آگے پہنچے، دائیں بائیں اس طرح کھڑے تھے کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ اپنی سفید قمیص کو اس غلاظت بھری بس سے سلامت لے کر نکل سکتا ہے؟

رفتہ رفتہ وہ اپنی سفید قمیص کو بھول گیا۔ پہننے کی بساں دل و دماغ میں ترقی تھی۔ اس نے جانا کہ وہ ہری ہوئی کھجیوں کے انبار کے وہ میان کھڑا ہے۔

ایک بار اس نے پھر بچنے کی کوشش کی۔ ایک مسافر کے ترانے پر وہ پھینے میں شرابور کالے بھجنگ آدمی کے برابر سے بٹ کر آگے ٹھک گیا۔ یہ قدرے بہتر جگہ تھی۔ وہ آسانی سے سانس لے سکتا تھا۔ ایک گوری گردن اس کے سانس کی زد میں تھی۔ اس پر سے بھرے پچھپائے کو اس نے اوپر سے نیچے تک نظر بھر کر دیکھا۔ پھر نظر ان شاداب لمبی باہوں پر گئی جو کھوٹے شک کھلی ہوئی تھیں۔ اس جسم کو وہ دیکھتا رہا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ اس گلشن جسم کو وہ ایک بے تعلقی سے دیکھ رہا ہے۔ برا بھلا پچھپایا۔ گوری گردن، شاداب باہیں، قاعد کی دوسے پر سرسبز جسم مجھے اچھا لگنا چاہیے۔ عقل کے اس فیصلے کے بعد ایک مرتبہ پھر اس نے اس گلشن بدن کو نظر بھر کر دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہوئے طبیعت ادا ہو تی ہوئی چلی گئی۔ اس آن اُسے احساس ہوا جیسے وہ سالم نہیں ہے۔ جیسے جمع ہوتے ہوتے اس کا کوئی ریزہ، کوئی لٹکی باہر پڑی رہ گئی ہے جیسے اس کے جسم کا کوئی انگارہ کہیں باہر پڑا دھک رہا ہے۔ میری ذات میرا جہنم ہے میرے جہنم کے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔

اپنے جہنم سے باہر نکلنے کی نیت باندھے ہوئے اس نے سوچا کہ اس بھلی لڑکی

شاکرہ کے اس کے پیچھے دونوں آچکے ہیں خط بھی آچکا ہے۔ اس سے ملنا چاہو کہ اس خیال سے اسے ایک ٹمب تقویت ہوئی۔ اسے ایک اٹلینان سا بڑا کہ اس کے اکٹھا ہوتے ہوتے جو ریزہ باہر پڑا رہ گیا تھا پھر ٹریجائے گا۔ وہ پھر سے سالم ہو جائے گا۔ اس نے شاکرہ کے لب اور خسار کا دھیلان کیا۔ قدر و گیسو کو تصور میں لایا۔ خوب لڑکی ہے اور انیسہ ۹ عجیب کڈھب صورت ہے۔ اس کڈھب صورت کا تصور کر کے وہ دل ہی دل میں ایک تحقیر آمیز جذبے کے ساتھ ہنسا۔

شاکرہ کے تصور سے اس میں ایک گرمی آچکی تھی۔ گھر واپس چلو اور اسے فون کو۔ اس کا بس ہوتا تو وہ بس کو فوراً رکا تا اور باہر کو درگھر کی طرف واپس ہو پڑتا۔ ایک بے تابانی کے ساتھ اس نے اگلے سٹاپ کی آمد کا انتظار کیا۔ سٹاپ آتے ہی وہ بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا دروازے پر آیا اور کو درگھر باہر نکل آیا۔

گھر واپس ہوتے ہوئے وہ چند فرلانگ بہت تیز چلا۔ مگر پھر خود ہی اس کی چال دھبھی پڑ گئی۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ مگر اتنی جلدی پر یہ سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے تھکے اعضاء کھل رہے ہیں، بکھر رہے ہیں۔

چلتے ہوئے اسے یوں لگا کہ وہ کم ہوتا چلا رہا ہے۔ جیسے اس کے جنم کے انگارے رستے میں گرتے بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ میری ذات میرا جنم ہے میرے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔

اپنے گھر سے بکھرے انگاروں کے ساتھ وہ گھر پہنچا۔ تو شاکرہ کو فون کرنا

ہے۔ اس کا فون نمبر کیا ہے۔ اسے اپنی حماقت پر سخت غصہ آیا کہ اس نے اس کا فون اپنی نوٹ بک میں نہیں لکھا تھا۔ اس نے فیر بھر ڈائریکٹری اٹھائی۔ ڈائریکٹر کے صفحے اٹھتے پڑتے اس نے سوچا کہ وہ اس وقت گھر پر ہوگی؟ اگر سچی تو کیا، اس وقت اسے فون کرنا مناسب رہے گا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مگر انیسہ کو تو فون کرنے کا سب سے مناسب وقت یہی تھا۔ انیسہ ٹیلی فون، رشیم کی ڈوری میں نچتی گرہ۔ گرہ چرباقتی اور پھر رشیم کی ڈوری کھینچی چلی جاتی۔ میں اپنی بنانی کے بہنم میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہوں اور اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر گئی۔ ڈائریکٹری ایک طرف رکھ دے اٹھا۔ اس ٹرے ٹرے نیلے خط کو اس نے ردی کی ٹوکری سے یوں نکالا اور یوں اس کی شکلیں صاف کر کے پڑھا جیسے وہ آج ہی موصول ہوا تھا اور پڑھے جانے سے پہلے غلطی سے ردی کی ٹوکری میں چلا گیا تھا۔ اس نے اس نیلے خط کی شکلیں دوبارہ صاف کیں۔ اسے ہتھیلی کے تہہ کو غلطی میں بند کیا اور میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی ڈائریکٹری اٹھائی۔ یکم اپریل والا صفحہ کھولا۔ لکھا ۳۱ مارچ، اگلا ورق اٹھا اور لکھا ۳۱ مارچ۔ پھر وہ ورق اٹھا چلا گیا اور لکھتا چلا گیا۔ ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ۔



مجازی خدا

نختی بسم اللہ رات بھر سے بھوک تھی۔

تباہی نے جو پتی کو گڑھ میں لیا تو ایک بار ہک کر اُس نے ماں کی چھاتیوں پر
 ہاتھ مارا اور پریچ سا دودھ پھل پھل رسنے لگا۔ اس وقت تختی کو دودھ پلانے تباہی
 عجیب سی لگ رہی تھی جیسے پانچ کیوبک فیٹ کے فریج میں کسی نے وال کی
 باب بھری ہانڈی رکھ دی ہو۔ انگلیا کے بنگلے بالکل سی سے بنے تھے اور پان
 ہر کون کی جھالو تھی۔ بروکیڈ کی کٹوری پر چھاری سیون صراحی دار موتیوں سے جگمگا
 رہی تھی رمل کے کھڑتے تلے ایسی جگر جگر کرتی انگلیا بھی عجیب سی لگ رہی تھی۔
 ایک تو ویسے ہی یوں پورے یک اپ کے ساتھ تباہی کا دودھ پلانا اچھے
 کی بات تھی لیکن یہ کس کو گمان تھا کہ تباہی دودھ پلانے سے پہلے وضو کرے گی؟
 اُس کے نہ پیچھے کبھی وضو کا پانی کنفیوں تک گیا ہی نہ تھا۔ یہ اچانک کا یا پلٹ ہونی

ہے؟

”ناڑاں سے تباہی لوٹی تو گلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اُس کے کانوں
 میں بھوک آواز آئی۔ خدا جانے یہ عرس کی کرامت تھی کہ بھوک آواز کا بلا تھا
 کہ تباہی کی جھانریں صبرِ اسرافیل بھونکی گئی، اپنے اعمال تلے دکھانے کا وقت آ

پہنچا۔ وہ تھر تھر کا ہنسی اور پہنچی۔ بچی نہایت ہی بے سُرسہ پن سے پورا گلا بچاڑے
 بیخ رہی تھی۔ کیڑے تبدیل کرنے کا وقت نہ تھا۔ سارسی اتارتے ہی اُس نے
 جلدی سے ملل کا کرتا پیٹی کوٹ پہن لیا۔ اور وضو کرنے بھاگ گئی۔

اس سے پہلے کو تابی نے کبھی وضو کر کے بچی کو دودھ نہ پلایا تھا۔ پھر یہ

کہلایا پلٹ ہوئی تو کیسے ؟

وہ جھلنگی چارپائی پر پیٹی کوٹ کرتے میں ملبوس بڑے پیار سے بچی کو گود میں
 لیے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر مہربانی محسوس ہوتی تھی جو مائیکل ایجنڈا کی سی
 کسے چہرے پر ہوا کرتی ہے۔ سامنے اچاری آہوں سے لداڑے اور باطنی بھری سی
 پڑی تھی۔ یہ وقت تھکے کا تھا لیکن نادر بغیر کھانے، بنا دستک دیے مستول کی
 طرح اکھڑا ہوا۔

دراصل رات کو تابی کا ارادہ نالراں جانے کا نہ تھا۔ نئی بسم اللہ سے
 اُسے واقعی بہت پیار تھا اور وہ اسے ساری رات چھوڑنے کے لیے رضامند
 نہ تھی۔ کچھ اُس کی اپنی طبیعت بھی اور اس تھی۔ لیکن نادر شاہ کی لچھے دار باتوں کے
 دم میں وہ آہی گئی۔ کئی سالوں سے وہ شریف شاہ کے عرس پر مجرا کہنے جا رہی
 تھی اور اُسے ایسے لگتا تھا جیسے یہ گھراں بسم اللہ، عزت، دولت سب شلہ
 ہی کی دعاؤں کے طفیل ہو۔

نادر نے ٹسر کا فیروز تہ بندھ رکھا تھا۔ گلے میں موتیے کا لمبا سا مار تھا۔
 وہ پردہ اٹھائے بیمرغ بنا کچھ دیر کھڑا رہا۔ کمرے میں رات بھر کی گرمی تل سپیڈ
 پنکھے کے تھپڑے کھا رہی تھی۔ تابی کو نادر کی آمد کا احساس اُس وقت ہوا جب

وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ تابی کے پاس بیٹھ گیا سارے کمرے میں نادری مردانہ خوشبو پھیل گئی۔ تابی نے کُتے سے سچی کا منہ ڈھانپ لیا اور نادری کی جانب بیٹھ کر لی۔ نہ جانے کس طرح اس مسئلے پر تابی کو کیوں شدید غصہ آیا۔ تابی کو یوں لگی کہ منہ ڈھانچتے دیکھ کر نادری بڑے کھردرے پن سے ہنسنے لگا۔

نہ جانے یہ شریف شاہ کے عرس کی برکت تھی؟

خدا جانے یہ نادری کے ملائم قہقہے کا اثر تھا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بسو کے دودھ میں بھیگے نوٹ تھے تبھیں دیکھ کر تابی کو اپنے آپ سے شدید نفرت ہو گئی۔

نادری کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ تابی سچ پر لگے کباب کی طرح بھی رہی ہے۔ کتنی رنگ کے ہاتھ بڑھا کر انگلیاں کے پھوپھو پر کساوٹ کھولی اور آہستہ آہستہ ٹوڑی یوں کھولنے لگا جیسے تپتے دانی ٹھسلی کر رہا ہو۔

”دودھ پینے دو بچی کو۔۔۔ رات بھر سے بھوکا ہے۔“

”ہم بھی رات بھر کے بھوکے ہیں۔“ وہ بے شرعی سے ہنسنے لگا۔

اپنے خلاف، نادری کے خلاف اور نہ جانے کس کس کے خلاف لڑھکھڑا ہوا دیر اور چین تو سر ہو گئی۔ فعل در آتش تابی نے کیو مکس لگی انگلیوں کا بھر پور ہاتھ اس زمانے سے نادری کے مارا کہ وہ اپنا سر کا ہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بات کیا ہے؟۔۔۔ اس نے سخت اور غصے کے ملے جلے جذبات

سے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں ہے بس جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا۔“

”نشہ تو نہیں ہو گیا تجھے؟“

”جو گیا ہے۔۔۔ تو جا!“

”دیکھ لے پھپھیلے گی۔ شہر کے سارے دل پھینک میری مٹھی میں ہیں۔“

نادر نے بالوں بھری مٹھی اُسے دکھا کر کہا:

”بھاڑ میں جائیں ترے دل پھینک اور تو!۔۔۔“

نادر نفیس بھرے قبضے ٹکٹا سیڑھیاں اتر گیا۔

اس وقت تک نہ تو تابی کو علم تھا اور نہ ہی نادر کو شبہ ہوا تھا کہ تابی اپنی پچھلی زندگی کو تیاگ رہی ہے۔ یہی جوں جوں دن گزرتے گئے تابی کے کچے زخم پر کھربندہ بندھا ہلکا اور دیں بہ دیں پیپ پڑنے لگی۔ جو بات یورپی دل کو ڈس گئی تھی اب پڑخانگی بنا کر اُس لے دل کے سیفت میں رکھ لی۔

نادر کا خیال تھا کہ تابی گیلہ بارود ہے چند دن خراج کی کڑوی دھوپ سینکی گئی تو آپنی سلگ اُٹھے گی۔ کوئی کورا پٹا تو تھا ہی نہیں کہ مرد کی شناسائی کے بغیر رہ سکتا۔ لیکن جب کافی دن گزر گئے اور تابی کا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ خود ہی کچھ شرمندہ، کچھ غریب، کچھ مشتاق سا کوٹھے پر گیا۔

تابی کو دیکھ کر نادر کا دل تڑپا تا کھا گیا، نہ بالوں میں فتح و فتح تھے نہ کپڑوں میں دھنک کی سی کیفیت تھی۔ نقلی اصلی سب ٹیٹس غائب۔ رانٹوں کی طرح بال کھینچ کر چوڑا کسا ہوا۔ نہ وہ پچھندے دار سیڈٹس، نہ ناخنوں پر رنگ برنگی کچھ مکس۔ نہ کانوں میں پتے بائیاں نہ ماتحتوں میں آرسی انگوٹھیاں نہ گلے میں رانی مار۔ ہاتھ سے خگی ٹوپی۔۔۔ تابی کی جگہ وہ ایک خصی بکرا نظر آتی تھی۔

نار نے بہت سرسراہ منتیں کیں، سمھایا، واسٹے دیے، دھکیاں داہیں۔ لیکن اُس کی باتیں سن کر وہ اور بھی پچھ گئی۔ تابی کو ایسی ضد چڑھی تھی کہ قسم کھالی برتن مانگنے منظور، روٹری کوٹنے کا پیشہ سرانگھوں پر جھانڈو بہارو پھیرنا قبول، لیکن پھر حرام کاری کا دھندل کرے گی۔ ادھر تابی نے سونا سو گندھ کھائی، ادھر سارے میریٹھی میں جیسے متوقع باتوں کے غبارے ساڑنے لگے۔ بچلے کی خورشید جہاں نے چوری چوری دیگ پڑھائی اور دیباہ بھجوا دی، عرصے سے اُس کے سارے گاہک کسی چور راستے سے تابی کے کوٹھے ایسے پڑھتے کہ پھر وہیں کے ہو رہتے چچ کی والی نازو نے برقع اوڑھاؤ محلے محلے وہ توڑتے پھرتی پھری کہ افواہ کو سیٹ پیارہ کی اڑان لگ گئی۔

جتنے نہ اتنی باتیں — کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ —

پنکھے کی تیز ہوا میں جاپانی ہوا والا کیلنڈر اپنل کی طرح لہرا رہا تھا۔ حمیدہ کے گریبان میں منہ دیے لٹا سا جاوید پھر چڑو دھ پہنچے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سونف کے گچھوں کی طرح ابھرتے تھے اُس نے جاوید کی مٹھی میں دھموکا ارکڑا سے پرے کیا اور شیج سبکی کے ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی "سینے ذرا۔۔۔ اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے ضرور کوئی دوا لے کر آئیں کل۔"

"اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے؟" ناصر ادر حیلہ کے پیٹ میں ہوں تو ہوں۔

"سارا دن میری جان نہیں چھوڑتا۔" نون کو آرام ہے نہ رات کو اس کے پیٹ

میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو رہ جاتا! جاوید بڑی ڈھٹائی سے اب حمید کی ٹپٹ سے پٹا نختے نختے ہاتھوں سے اُس کی چوٹی کو چوس رہا تھا۔

”میں تو جب تک اس کے ساتھ بیٹھی رہوں گی یہ میری ہڈیاں تو چٹا رہیں گی۔“
”ادھر آ جاؤ میرے پلنگ پر۔“ شیخ جی نے لمبا جت سے التجا کی۔

لیکن حمید اُٹھ کر ناصر کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کون اُسے شیخ جی کے تھل تھل وجود سے گھن آتی تھی۔ گہری نیند میں جب اُن کا منہ کھل جاتا اور خواتین کی ڈاک میٹھ جاتی تو حمید کو اُن سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی۔ وہ تو قدرت کی مستم نظر یعنی سے وہ حمید کے نان نفقہ کے کفیل تھے ورنہ حمید کبھی اس پلنگ کا کنارہ بھی نہ چھوتی۔ — اللہ ماں باپ نے بھی کیا دیکھ کر یہاں دیا۔

جب حمید ناصر کے پلنگ پر چلی گئی تو نختے جاوید نے پہلے زندقہ بھری، پھر پیسج ماری اور تھوڑی دیر نہ کھول کر دوتا یا شیخ جی نے اپنا بھاری ہاتھ اُس کی ٹپٹ پر رکھ دیا اور بڑی دیر تک تھکتے رہے۔ جب نیند کا پورا غلبہ ہو گیا تو جاوید غلات کے کولے پھرتا آہستہ آہستہ سو گیا۔

ناصر کے ساتھ سر جوڑ کر حمید بولی — ”اس بار پھر آپ ہمیں شریف شاہ کے عرس پر نہیں لے گئے۔“ ہاں! —

”جاوید بھئیو! ہے۔ اگلے سال سہی۔“

”ہر سال آپ یہی کہتے ہیں۔“

”خدا قسم صرف جاوید کی وجہ سے نہ لے گیا اور نہ اس بار تو شاہ صاحب بھی

تھارا پوچھتے تھے۔“

غرس کی ایک ایک بات، ایک ایک لمحہ شیخ جی کی نظروں میں گھومنے لگا۔ بازو اٹھا اٹھا کر لگاتی اور گاتے برے پلٹ پلٹ کر دیکھتی ٹیارتابی بے طور انہیں یاد آنے لگی۔ ایسی دنگ منہ زور جوانی۔ اللہ اللہ اللہ!

تبابی کو پیشہ کرتے صرف پانچ سال ہوئے تھے۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں اس لگاتار قیامت کی شہرت ہمیز کھاتے ہوئے گھوڑے کی طرح بہت فوڈ کل چکی تھی۔ شہرت کو چھوڑیے وہ تو ہوئی سو ہوئی لیکن اتنی نامور طوائف نے جب پیشہ چھوڑنے کی ٹھانی تو کوئی بھی عاشق منہ نہ شہور پر نہ ابھرا جو اس کے ماتھے کا سیس بھول بن کر باعزت بیاہتا زندگی گزارنے کے لیے ساتھ دیتا۔ ہوئے ہوئے جہاں پہلے مجیر ابجا تھا اب وہاں بالا چڑ گیا۔ سارا دن منہ میٹو کو گود میں لیے پہاڑ سے دن کاٹنے لگی۔ کہاں تو شام کے وقت دیدار کے طاب ہرے سمر رانے بیٹھے ہوتے تھے کہاں اب بیٹھا میں سوائے گاؤں کیوں کے اور کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔

اپنی بستی والیوں سے قطع تعلق کرنے کے بعد کچھ روز تو تبابی کو یہ سکون ملا کہ انت نئے قصوں اور بھانت بھانت کی نصیحتوں سے چھٹکارا ہو گیا، لیکن جب تبابی کمل ٹاپو بن گئی تو دن کی بے مصرف طوائف سے اس کا جی گھبرانے لگا جب سے تبابی نے بیچ چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے ٹھپ سادھ لی تھی اب دونوں میں محض رسمی سی گفتگو ہوتی اور تبابی کے دل پر ہر بار جھٹ سی پڑتی۔ اُس کا جی کتنا صاحب اچھی ٹنگ کی راہ پڑی سب نے نکسال بابر کر دیا۔ کہاں تو لوگ کھڑے

پر بٹلاتے تھے کہاں اب منہ پر کبھی تک نہیں جھولتی۔

جس دن خورشید علی پرانا اس سے ملنے آیا وہ اُداس اور خاموشی کے دباؤ سے مجبور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اس فعل کی تعریف کرے۔ کوئی تو کبے شاباش تابی چاہے بدیر بدراہ اختیار کی لیکن ہر اک اندہ بہت خوب کیا۔ پروانہ صاحب زندگی میں بھی بڑی اُنہنی باتیں کرتے تھے تابی اُن سے داد تحسین وصول کرنے کے لیے نہچا تری اور ٹٹھک میں اُنھیں بلالیا۔ پروانہ اس کے گوشے پر ہمیشہ مہمان خصوصی بن کر آتا تھا۔ رخصتی کے وقت دامنِ مجرم کو خدا حافظ کہتا۔ اُس نے طوائف کے عنوان سے تابی پر ایک سہ غزل بھی لکھا تھا جس میں اس نے طوائف کو ہمالہ کی برف، سیپ کے موتی، اچھوتے خواب اور بہشت کی جڑ سے تشبیہ دی تھی۔ اس سہ غزل کے جدیدہ جدیدہ اشعار دیکھو مجھوں میں گاتی بھی رہی تھی اور پروانہ صاحب اُسے اپنے لیے باعثِ عزت بھی سمجھتے رہتے۔ پروانہ صاحب کو دیکھ کر تابی کا دل رقت، انفعال اور دکھ سے بھر گیا۔ اُس نے اپنے آپ پر اس شدت سے ترس آیا کہ سلام کا جواب دیتے ہی اُس نے پروانہ صاحب کے پاؤں بچھ لیے اور گڑگڑا کر بولی: ”پروانہ صاحب مجھے بچا لیجیے — خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔“

پروانہ صاحب آدمی پہلے تھے۔ تابی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے بولے — ”صاحب ہم آپ کو کیا بچا دیں گے کیا پدی کیا پدی کا شور بہت تابی پر نیک با عزت بیوی بننے کا بھوت سوار تھا۔ اپنے دعا کو غلامی صورت میں پیش کرنے کا ہر کیاں جھٹ کر مٹی۔ پروانہ صاحب آپ مجھ سے نکاح کر لیجیے۔ خدا

قسم حج اکبر کا ثواب ہو گا۔

ہمدانہ صاحب کئی کچا کر دُور جا بیٹھے اور گاؤں کے کچھ بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ جب بہت دیر تک وہ لوہنی بیٹھے کھاتے رہے اور منہ سے کوئی بات نہ نکلی تو بانی ایک بار پھر تہمت کر کے اُن کے پاس جا بیٹھی اور بڑی بے چارگی سے بولی —
 ”کیوں ہمدانہ صاحب، میری بات کا کیا جواب ہے؟“

کہاں تو چپ چاپ بیٹھے پُچھنے نے اُدھر رہے تھے اور کہاں ایک دم کسی منبر سے پھیٹ پڑے۔ کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا، کبھیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی۔
 ”تف ہے ایسی عورت پر جو زبور حیا سے آراستہ نہ ہو۔“

تانی کو اپنی جلد بازی اور بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ تھلا کر بولی — ”کیوں ہمدانہ صاحب میں نے کوئی بے شرمی کی ہے بھلا؟ آپ سے نکاح کی درخواست کی ہے کوئی رات گزارنے کے لیے تو طلب نہیں کیے۔“

”اور یوں نکاح کا خواستگار ہونا کیا یہ بے شرمی نہیں بے حیائی نہیں — استغفر اللہ!“

”پہلے ہی چمے ہر جو مال کا مانا گیا تو پھر تانی میں کسی سے عرض نہ عا کی بہت ہی باقی نہ رہی۔ آج سے بول چال پہلے ہی بدلتی تھی۔ محلے والیوں نے اُسے اصل کی نہ پا کر ویسے ہی ترک کر رکھا تھا۔ نادار سے معاملہ یوں ہی چوٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گریہوں کی دوہر ہو گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے خیال آتا کہ یہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی دے گی، اگر کسی کا ساتھ نہ ملا تو ٹھیس ٹھیس کر جوانی کی سو دات کب تک کٹے گی؟“

پھر سچی پر نگاہ پڑتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں تو پارسا بن گئی۔ یہ بن باپ کی سچی کس کی کہلائے گی، جوان ہو کر کہاں جائے گی، کہاں سے کھائے گی؟ خود سری زندگی کا کیا بنے گا؟ جس رفتار سے وہ بنک کے چک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی اس رفتار سے تو سارا اثاثہ دونوں کا کھیل تھا۔

اللہ آمدنی کی صورت نہیں اور اخراجات حمل کی صورت ہر دن چڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔

رسی ہی باتوں نے جب تابی کی زندگی کو کر کر کر دیا تو ایک شام وہ اٹھی اپنا ٹیلا پیڈ نکالا، اُس پر فرنیسیسی خوشبو چھڑکی تاؤ کو پیشانی بھرا محبت نادر کھٹا اور نیچے اتری۔ حیرت انگیز مکان کی پختی منزل میں تین دوکانیں تھیں اور ایک کمرہ تابی نے پہلے ہی فتح دین کو دے رکھا تھا۔ فتح دین جیلہ بچانے کے علاوہ سودا سلفٹا گئے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے کام بھی آتا تھا جب وہ فتح دین کو خط لکھتا تو یہ سچے جا رہی تھی تو سامنے شمع جی نظر آ گئے۔

تابی نے کچھل مروت کے مارے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ شیخ جی مسکراتے مسکراتے آگے آگے آ گئے۔ اخلاقی جرات کی تابی میں کی تھی ورنہ اُسے ٹیوٹر ہی سے نکال دیتی۔ بنس کر ایک طرف ہو گئی اور شیخ جی اندر آ گئے۔ اور — تابی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

حمیدہ نے دمکو کا راجا وید کو روں دھکا دیا کہ پھر ہے برابر تپہ نالی میں گرتے گرتے بچا خالہ مسگری نے ناک پر انگلی رکھ کر اُسے فوراً آنا۔ کیوں اپنا قصہ

اس بے زبان پر نکالتی ہو۔ میں تمھاری جگہ ہوتی تو اُس بد بخت نابی کی آنکھیں فوج
یعنی بہتر تم کو تمھاری نہ کی نے مارا۔ ہاں۔۔۔

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیلی میں بڑھنے والی چھاؤں کی طرح
اُکڑ بیٹھ گئی۔ خالد اصغری نے پیرھی کو چوڑوں سے گھسیٹ کر اُس کے قریب کر
لیا اور راز داری سے بولیں۔۔۔ ”بھئی تم نام خدا مصحوم ہو، دین دار ہو، اچھے
خاندان کی ہو تم کو مرد بھینٹا نے کہاں آئیں۔ یہ طوائفیں تو سارے مومنی تشنہ جانتی
ہیں جلنے کیا تعویذ گنڈا کر دیا ہے اس چلتر بانے شیخ جی پر؟“

تیلی کی چھاؤں ساون کے بادلوں میں بدل گئی اور لہندا باندی ہونے لگی۔
”یہ تو سفلی کام ہیں، سفلی کام انہی لوگوں کو آتے ہیں۔ گھر کی شریف بیبیاں
ان باتوں کو کیا بیانیں۔ لیکن بھی اتنا میں ضرور کہوں گی، خیر دار ہو وہ نہ ہو شیخ
جی نکاح ہی پڑھو لیں اُس کٹنی کے ساتھ!“

حمیدہ دانتوں میں تنکائیے گھری مٹی تھتی۔ نکاح کے نام پر کسمپاسی۔ ایک
روز شیخ جی کا اُس سے بھی نکاح ہوا تھا۔ آج بھی اُس دن کے تصور سے اُسے
اُبلایاں سی آنے لگیں۔ اللہ! سے تو پہلے دن سو شیخ جی بُرے لگے تھے، مرنے
سے جلد سے۔ اُزبک سے! کہیں جو اُن سے رزق کی ڈوری نہ بندھی ہوتی
تو۔ یکساں تو بندھی تھی اسی لیے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اللہ نہ کرے
خالد جو کہیں نکاح ہی پڑھو لیا تو میں یہاں کیوں رہوں گی؟

خالد اصغری سے غصہ پھیلنے کے جھکے اُٹھ رہے تھے۔ کانوں میں موتیا کے
پھول۔ ہونٹوں پر لاکھا رنگ دندا سے کی رنگت، بڑی حوصلاری سے کلیوں

کا ہلکا پھلکا رشتہ اٹھا کر بولیں۔ "تھاری رشتی ہے جوتی، اُن کو کسی بیماری ہے تو پھر تم کیوں دین ہاتھ سے جانے دو۔ کل کو اس چیڑھاسی کی اولاد تھاری اولاد میں بھائی ہی تو کہلائے گی۔"

برستے بادلوں میں سے بھلی کڑکی۔۔۔ ہائے اشد نہ کرے، ہائے اشد نہ کرے تو یہ خالہ منہ سے کچھ تو بھلی بات نکالا کرو۔۔۔"

"بھئی میں تو کشمیری بازار جا رہی ہوں۔۔۔ کلیجہ چٹا جا رہا تھا تمھارے کدے سے، دل میں سوچا حمیدہ کو ملتی جاؤں، کمر کچھ منگوانا تو نہیں کشمیری بازار سے ہے خالہ اصغری گئیں تو پھوپھی بھال آرا آگئیں۔

دو گھنٹے وہ میٹھی باز پرس کرتی رہیں اور حمیدہ تل نظری بنی گم سم ٹپتی رہی۔ دراصل یوں تو شیخ جی سے سیرامنڈی کا تعلق پڑنا تھا، لیکن اس رابطے کو سونے حمیدہ کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بلکہ حمیدہ کو تو آٹا ٹسکیر تھا۔ گند سنبھالنے کو کوٹھے والیاں اور ٹسکیر پانے کو حمیدہ۔۔۔ لیکن کچھ عرصہ سے وہ تانی کے ہاں بڑے

قوت سے آنے جانے لگے تھے۔ جیسے تیز گام وقت مقررہ پر آتی ہے۔ ادھر دودھ والے کارٹر چاگل میں داخل ہوتا۔ ادھر شیخ جی سیاہ اچکن، جلاں کیپ، پشاور پتیل پیسے نکلتے پر پتے۔ دودھ والا سلام کرتا۔ ادھر سے سر کے اشارے سے جواب ملتا۔ علیک سلیک ہوتی۔ لیکن اتنی صبح نہ کہ صبح آتے ہیں اس بات کا بھید کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لوگوں نے بہت جلد خطوط و حداف میں چھپے ہوئے راز کو پایا۔ بات کا نکلنا تھا کہ حمیدہ کے لیے بدردی کا ایک انوکھا باب کھل گیا ہائے ہائے تفت تفت یہ چاری ماری گئی، اوئی اللہ ہائے اللہ تو بہ فوج

کی بچھاڑ سے حیدرہ کے دل کا آنگن بالکل بھیگ گیا۔

سانپ تو چل گیا مگر راستہ بڑا چڑا تا بانی نے بازارِ حُسن بھی چھوٹا اور شیخ صاحب کی بیوی بھی نہ بن سکی۔ بیٹھے بیٹھے جی میں خیال آتا کہ وہ نہ ہو سوجو تیاں بھی کھانا پڑیں اور سوہیا زیں بھی نہ ہر بار کرنا ہوں۔

شیخ جی چالیس کے چٹھے میں تھے اور تابی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ جی کی صحت بالوکا ڈھیر تھی تو چھوٹو کر کے گھر نہاتے، ادھر دو ہونڈ پانی کے پڑتے اور ارارار دم ساری عمارت زمین پر۔ چھینک کیا آتی سارا سینہ ملنی ہو جاتا۔ ذرا سی سردی پڑتی اور جوڑ جوڑ میں دم آجاتا۔ بند بند دُکھنے لگتا کبھی سانس اکھڑا جو اسے کبھی نہیں کھینچی چلی جاتی ہیں۔ کاتھی چتی تھی، شکل و صورت بھی بھولی بھالی تھی، براہیے تناور وخت کو اندری اندر دیکھنے چاٹ لیا تھا۔ تال بکھانے جیسی رنگت اور عذاب کے ہونٹوں عالی تابی اُن کی پوتی لگتی۔

مجیب سی بات تھی کہ نہ تو شیخ جی کی صحت پر تابی کو کوئی اعتراض تھا نہ اُن کی عمر پر۔ اُسے تو انداز ہی اُن کی خوبیاں لگتی تھیں۔ ایسے یا شخس کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ شیخ جی تابی کو ساتھی تو نہاتے ہوئے تھے پر نکاح کی بات دو سال سے کشائی میں پڑی تھی۔ نکاح کا وعدہ تو شیخ صاحب نے بڑی فراموشی سے کیا تھا لیکن آج کل کرتے دو سال بیت گئے۔ کبھی تابی کے منہ سے نکاح کا نام سن لیتے تو فوراً کھوں کھوں کرنے لگتے۔ فوراً یا تو سردی لگ جاتی

یا پڑھوں کا درداً بھرا آ۔

شیخ جی کچھ ایسے بد نصیب بھی نہ تھے، ہر فی الحال اپنے آپ کو پابند بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تانی کا خیال رکھتے۔ ننھی بستی سے باپ کی سی محبت برتتے۔ خرچ اخراجات کے وہ بھی کفیل تھے۔ ہر جس کو مفت دودھ ملے وہ بھینس کا گھنچوٹ کیوں پالے؟ اصغر تانی کو کونٹے سے بندھنے کا ایسا سودا ہوا تھا کہ دین رات یہی ذکر کہاتے جاتا کہ یہ زندگی پہلے سے بھی بلیڈ ہے۔ وہ رہے کے سوچتی کہ شیخ جی کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہتر تھا کہ اپنی جوانی پر اعتبار کیا ہوتا۔ وادی سم وادی سروں کی سمجھ تھی، گلے میں قدرتی سرتیاں بھری تھیں۔ شکل دوسری بھی کشمیریوں جیسی گوری چٹلی۔ کچھ دیر اور سیلاؤتی نہ رہتی تو کم از کم کچھ اثاثہ بھی جمع ہو جاتا۔ پھر یہ اطمینان ہوتا کہ جو غلام ہو ہے وہی باطن۔ جیسی باتیں ہیں ویسے ہی اعمال۔

بیچاری تانی کی تو وہی حالت ہو چکی تھی کہ کھوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باؤ لاکٹا لگائے۔ ادھر شیخ جی سے اُسے سنی سادری جیسی محبت ہو چکی تھی۔ شیخ جی کو دیکھ کر سارے باپ کٹ جاتے، سارے گلے بھول جاتے، لیکن جب اکیلی ہوتی تو ضمیر ڈستائیوں داشتہ بنی رہنا اس کے ضمیر کے منافی تھا۔ ادھر آپو سارا دن اُسے طعنوں سے گامستی دیتیں۔ اس رستہ کشی کو تانی اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی، لیکن ایک دن اُس کا کچھو شقی ہو گیا۔

اس روز تانی کو بکھلا کر بخار پڑھا۔

بستو ماں کو پٹنگ پر بے سندھ بیٹھ دیکھ کر بات بے بات خند کرنے لگی۔ کبھی یہ دو کبھی وہ بے دو۔ نوکرائی ہل ہل باہرے جاتی لیکن ہر بار بستو کھتی۔

نیں نہیں نہیں۔۔۔ آخر چٹا چٹا کرکریں جیسے میں نے گڑیا دیکھ لی ہے کسی کی وہ ہانگتی ہے۔ شیخ صاحب تابی کی کلائی پر لڑے کرکریں پر بیٹھے تھے ٹھک ہار کر تابی بولی ہم انکو شیخ نبی انارکلی سے جلسے اور موسیٰ گڑیا دلوادے کیجیے۔ اس کا ردنا سن کر تو سر پھٹنے لگا ہے۔

انارکلی بانارکا سفر ہی بستروپک کر شیخ جی کے کندھے سے چٹ گئی اور تب تک چٹ رہی۔ جب تک گال پر کار کی لکیریں نہ چڑ گئیں۔ تابی تو حکم لگا کر نچنت ہو گئی لیکن شیخ جی مکہ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تابی یا بستو کو لے کر وہ آج تک کہیں باہر نہ گئے تھے۔ کھنکار کھنکار کر بہانے بنا تے رہے کبھی کہتے اس حال میں تھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کبھی کہتے اب تو شام ہو رہی ہے ابھی بچی سو جائے گی۔ شیخ جی نے بہت پیترے مارے مگر تابی کو آج بمسم اللہ کی ضد بہت پیاری تھی۔ بال بٹ میں تو یا بٹ بھی شامل ہو گئی۔ بخار میں تہی ہوئی آنکھیں کھول کر تابی نے پوچھا، میں بات کیا ہے آپ بچی کو لے جاتے کیوں نہیں؟۔۔۔

پو کھر کے مقررے ہانڈوں میں انکار سے کہتے دیکھ کر شیخ جی بدک گئے اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلنے لگے۔

”آپ صبح اصلی وجہ بتادیں شیخ صاحب ورنہ مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کو صبح بونے کی عادت نہ تھی مگر تابی کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ سستے سستے لیجے میں بولے۔ بھلا میں اسے کیسے انارکلی لے جاؤں؟ کوئی واقف ہی مل گیا اگر؟ ساری بات کھل جائے گی۔۔۔

اب تک تابی نے خطر کے پھوٹے کی طرح شیخ جی کے ساتھ محض خوشبو بھری باتیں کی تھیں، یہ جواب سنتے ہی وہ کٹ گئی۔ کچھ بخار سے تفتاقی مچلی تھی، کچھ غصے نے آپہنچ دی شعلہ بوالابن کے پلنگ سے نکل آئی۔

شیخ جی اس بھری جوئی پلنگ زادی کو دیکھ کر دس قدم پیچھے ہٹ گئے اور کھڑکی کے شیشے کو ٹنکا ٹنکا کر بیڑ بچانے لگے۔ اُن کا خیال تھا نئی جبر کو یوں ہیلانے دیکھ کر تابی کا دل پیسج جائے گا۔ لیکن جوار بھلا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کیا بات کھل جائے گی شیخ جی؟ —

شیخ جی نے سنی پھران سنی کر دی اور شادو کو گانا سناتے لگے۔

”تمہری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف —“

”ہم کو بخار ہے خواہ خواہ بستر سے نکل آئی ہو۔“

”آپ بخار و خمار رہنے دیجیے، ایسی بے بندیاں بست ہو سکیں۔ میری طرف دیکھیے۔“

جسے تردد سے شیخ جی نے تابی سے نظریں ملائیں۔

”آپ کا بسم اللہ سے رشتہ کیا ہے؟ — تابی ترشول کی طرح تنی کھڑی تھی۔

”بیٹی ہے۔ — کمال ہے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!“

تابی غصے میں کانپ رہی تھی۔ سنگار میر کا سہارا لے کر بولی، ”اور مجھ سے آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟“

”یہ آج تمہارے سر پر سونچ کیوں سوار ہو گیا ہے۔“ شیخ صاحب اہل

موضوع پر چہن بجائے رکھنا چاہتے تھے۔

میرا آپ کا رشتہ کیا ہے ؟ — تابی اب اُن کے باطل سامنے کھڑی تھی۔
”یہ بھی کوئی پرچہ کی بات ہے۔“

”آپ کے نزدیک تو بالکل اہم بات نہیں لیکن میری تو جان پر ہی آئی ہے۔“ تابی
بیچ کر بولی۔

”ہیں..... تم..... میری بیوی ہو تا بندہ! آج تمہیں ہو گیا ہے، خدا
کے لیے بیٹھا جاؤ ہر الگ جائے گی۔“

بجراغ یا تابی بولی — ”بیوی تو ہوں شیخ صاحب لیکن بغیر نکاح نامے کے
— میں نے تو کسی پر چھوڑ کر بھی پیشہ ہی کیا۔ لیکن آپ کو شرم نہیں آتی آپ تو
بڑے دین داں وضع دار و عزت شہری ہیں۔“

شیخ جی مبسم اللہ کو کندھے سے ٹکائے کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے اور بر موٹے
میرٹے آنسو گرانے لگے کہاں تو تابی بھری لہریں کراٹھی تھی اور کہاں ڈبی سلان کی
بھاگ بن کر بیٹھ گئی برٹے موٹے آنسو اور وہ بھی شیخ جی کی فریاد گلوں پر تابی انہیں گھر
بدر کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن بھاگ بکرا اُن کے پاس جا بیٹھی اور آہ بچل سے آنسو
پونہنے لگی۔

”شیخ جی کیا بات ہے! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ لایے مبسم اللہ کو مجھے
دے دیجیو۔“

شیخ جی لے بستو کو اور بھی بچھ کر سینے سے لگا لیا اور ناک سے ٹٹک ٹٹک
کی آوازیں نکال کر رونے لگے۔ تابی بے تاب ہو کر کمرے میں پھر لے گئی اُسے سمجھا

آ رہی تھی کہ اپنے سے بیس برس بڑے مرد کو کیسے چپ کرائے ہیں۔ ویسے بھی اُسے اب شیخ جی اتنے اچھے لگنے لگے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بیشمار نہ ہونا اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ اور صریح شیخ جی بھلے کا گھنگر و بجا بجا کر کہہ رہے تھے۔ خدا قسم میری نیت نیک ہے۔ مجھے تمھاری قسم تابی نکاح میں ضرور چڑھواؤں اور چڑھواؤں کا بھی، لیکن کیا کروں جس علاقے میں تم رہتی ہو۔ وہاں..... وہاں رہ کر ایسے کیونکر رہ سکتا ہے، اگر کہیں تم باہر مکان لے لو تو..... تو کیا مجال جو میں رتی بھر حیل و حجت کروں خدا قسم تابی۔“

”تابی واپس پلنگ پر چلی گئی جیسے ایک سوچہ بخار میں بوقت کا خصل لے چکی ہو آہستہ سے بولی۔ شیخ جی آپ نے پہلے کیوں نہ کہا میں آج ہی سیدہ دلال کو بلا کر گلہ گر لیں کہ کٹھی لے لوں گی۔ خیر و پرچ آپ کے ذمے نہیں ہو گا۔ جب نہ ہوں گے آپ ہی سے لینے ہیں ناں۔ بس۔ لائیے بسو کو میرے پاس ڈال دیجیے، ہائے بچاری روتے روتے سو گئی۔“

تابی کو گلہ گر میں آئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن کسی دن تو وثیقہ لوہیں نہ ملتا تھا کسی دن نکاح چڑھوانے والے مولوی کے گرد سےیں درد ہو لے لگتا، یہ دونوں مل جانے تو گواہ کچھریاں بھگتے چلے جاتے غرضیکہ شاہی مسجد کے ہچکھوڑے سے اٹھ کر آنے کا فقط ایک نفع ہوا، وہاں سارا محلہ جاتا تھا۔ سارے کام گلہ میٹھے ہوتے۔ گلہ گر میں اتنی کی جگہ رہا یہ خیرچ ہونے لگا۔ پھر تابی کے لیے اس نے ماحول میں ایک اور بڑی مشکل درپیش تھی۔ اپنے محلے میں اُن کی

پرانی ساکھ تھی۔ حیثیت عرفی سے سب واقف تھے۔ یہاں اس عمل نما کوٹھی میں بہت بہت تو تمام بلیوں کی سی تھی۔ لیکن جی کا چور جینے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت لوگوں سے چھپی رستی تھی۔ یہی سوچ کر کسی سے نہ ملتی کہ اپنا تعارف کس نام سے کراؤں؟ خیال تو تھا کہ کوٹھی بیٹے ہی پاس اپلٹ جائے گا لیکن ہوا یہ کہ بیکاری اور مجبوری میں پڑ گئی۔ جھلرگ کی کوٹھی تابی کو کوٹھی نظر آنے لگی۔ لیکن شیخ جی سے کبھی بدی بات کا بھرم رکھنے کے لیے چکی بیٹھی رہی۔

اور سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ خدا جانے کیوں اور کیسے اُسے شیخ جی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی جی لڑا اٹھا کہ وہ جہاں شیخ جی نے یہاں چھوڑ دیا تو کیا بنے گا؟ ویسے بھی تابی میں تناس و ایوں جیسی بے لحاظی نہ تھی۔ ہر بات کا الزام گھوم بھر کر نہ بنانے کیسے اپنے سر ٹھسنے کی عادی تھی۔ دو مہینے گزرتے اور شیخ جی پر دباؤ ڈالنے کی جہت نہ پڑی اور شیخ جی تابی کو جھلرگ پہنچا کر پخت ہو گئے۔ روز میرا منڈی ہانے کا کھیل کا کم ہوا تو فصل دار لوگوں کی طرح فوراً اپنا وعدہ قبول نہاں میں نہاں ہو کر خاموش ہو رہا۔ شاید اسی طرح کچھ برس اور گزر جاتے لیکن حالات نے یک دم کروٹ لی۔

برسات کا موسم تھا۔ کینال پارک کی جانب سے آندھی پڑھی۔ گھنٹوں ہوا نشہ پانی کیے کھڑکیاں دروازے توڑتی رہی۔ شام کوٹھی کی تہیں موزیک کے فرش پر سے دھلواتی ہوئی تابی نے دیکھا کہ ٹیکسی میں سے شیخ صاحب اتر رہے ہیں۔ ساتھ دو کھانچے آم کے اور ایک کھوکھا آلو بخارے کا چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ سب بیٹھے برف لگے آلو بخارے کھا ہی رہے تھے کہ شیخ جی کو دو چھینکیں

آگئیں۔ ساتھ ہی سر میں ایسا شدید درد اٹھا جیسے کوئی بچاؤ ڈسے سے بھیجا نکال رہا ہو۔ تابی نے اسپر دہلائی تو ایسی قے آئی کہ آئیں اُلٹ گئیں۔

شیخ جی چار پائی پھر پڑ گئے۔

بیس دن تابی نے شیخ جی کی وہ خدمت کی کہ جتنی وزن ساد تریوں کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے۔ کچھ تو شیخ جی تابی کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے، کچھ اپنے بچنے کی امید نہ تھی۔ دل میں رورہ کر یہ خوف اُبھر تا کہ قبر تک سانسوں کا فاصلہ ہے اس عورت سے جھوٹا دعوہ کر کے گیا تو مشتبہ مثل ساتھ لے کر جانا ہو گا۔ اور پھر جانے کیا ہو؟

ایک روز نیم مہوشی کے عالم میں شیخ جی نے آپ کو بلایا اور مولوی صاحب کو بلوا بھیجنے کی تاکید کر دی۔

رات کو جس وقت سفید کپڑوں میں ملبوس، ارٹھوں کی طرح چوٹا کسے ننگی بوی تابی کا نکاح پڑھوانے تین آدمی آئے وہ ہاتھ میں شیخ جی کا استعمال شدہ پیڑے ہیں لیے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔

سارے محلے کی زبان پر اس کے لیے بہرودی کے بول تھے۔

پہلے خالہ مسٹری آئیں، عطر پھیل سے سارا گلن ملک گیا گیہوں داے ریشمی بُرقے کو چار پائی پر قرینے سے رکھ کر وہ بھائیں بھائیں رونے لگیں خالہ کے جاتے ہی پھر بھی جال آرا آگئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دونوں کم عمر شادی بھتیجیاں بھی تھیں۔ بڑی در تک شیخ جی کا کیریکٹر زیر بحث رہا۔ پھر بھی گئیں تو منہ بولی

بہن زادہ کا تانگہ بیچ سات بچوں کے آگیا۔

دو کریمٹ کو کا کولا کے ختم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اتنے آنسو بہائے گئے
کہ کو کا کولا کا سارا کھارا پن ختم ہو گیا۔

سارا دن ہمدردیوں کی ٹراک بندھی رہی۔ ہر کارے پر ہر کارہ آتا ہمارا
آئی توحید کا بند بند کھنکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کبھی ابراہیم نے
ادھ مٹا کر دیا ہو، ٹری دیڑھی سو جتی رہی۔ اب کیا کرنا چاہیے؟ خیرت برقی
اور گھر چلی جاؤں یا چپ چاپ روٹی کپڑا حلال کیے جاؤں اور اپنے بچوں کا
بھلا چاہوں؟ شیخ صاحب کے ساتھ محبت و مروت کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا
تھا۔ اُسے تو ان کا تھل تھل وجود دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی پھر سوتے
میں ان کے زخموں سے جو آوازیں نکلتی تھیں ان سے حمیدہ کو ٹری وحشت تھی۔
صحت ان کی بالو کا ڈھیر تھی، دہانے، سینک دینے، مزاج پر سی کرنے کا نہ
حمیدہ کو شوق تھا نہ وقت۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی کہ وہ بیوی
ہے نہ س نہیں۔ لیکن اب تو ایک کسی سے مقابلہ پڑا تھا۔ ڈوم ڈھلیوں
کے آگے وہ ہار ماننے والی تھوڑی تھی۔ وہ تو ادب و کریم کے چلی جاتی لیکن کار،
بنگلہ، قالین، فریج سب سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے اور پھر کون جانے شیخ
نان نفقہ کے بھی پیسے دیں نہیں۔ یہ خوف جان کا لاگو ہو رہا تھا۔ ادھر جس طرح تابی
نے اُسے اڑنگا دیے کر بچھاڑا اس پینزے کی تو یہی شرط تھی کہ ایسی روٹھ کر سکے
جائے کہ یا تو شیخ ہی تابی کو طلاق دے دیں یا ہمیشہ کے لیے حمیدہ سے کھٹاپی
ہو جائے۔

محلے والیوں کی بھڑکی بھرے جلے ٹپکے کے آموں کی طرح تھوڑی تھوڑی در در بعد کالوں میں جھجھکاتے تھے۔ اسے یہ طوائفیں مردوں کو ہنسی میں لینا جانتی ہیں، تم یہ فن کیا جانو۔“

”دیکھا میں نہ کہنتی تھی حمیدہ۔ کوئی مردوں کو بھی توں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟“

”تم کو کیا معلوم؟ کیا کیا کچھ کرتی ہیں یہ کوٹھے والیاں۔“

”البتہ! اب رنگ لائی ٹلری۔ ہم بھی کہیں یہ شیخ جی روز روز کہاں جاتے ہیں۔“

بڑی درجیدہ ہنسی سوچتی رہی۔ پھر اٹھی حندل کا شربت، دو گھنٹہ علیٰ میں ٹپکایا۔ نائیلون کے دوپٹے سے آنکھ کے کونے کو پونچھا اور جی کو پچکار کر بولی۔ ”پلوہیں کیا؟ نکلا کر پڑھوایا تو اچھا کیا۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ روز باری بوٹیاں توڑ توڑ کر کھاتے تھے لیکن ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں۔ ابی خرمیادیں گے۔ جب دو بہری بیٹا پڑے گی تب عقل ٹٹکنے آئے گی۔“

ساری فکر حمیدہ کو اپنے ماہی کے تھی۔ با، بار سوچی کہ وہ جو کہیں اس مال زادی نے خیر بند کر دیا تو کیا ہو گا؟ رفتہ رفتہ اپنی کم فیسی کی عظمت سے وہ کچھ اس طرح متاثر ہوئی کہ اٹھ کر محل کا سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس لیا اس کے پریوں آلیٹی جیسے حضور شدہ قدم مصر کی کوئی شہزادی ہو۔

آنسو آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

ٹپ ٹپ..... بوند بوند۔

نکیہ بیگنے لگا۔ لیکن عجیب سی بات تھی اتنے سارے آنسوؤں میں

ایک آنسو بھی شیخ جی کی یاد میں نہ تھا۔ سب اپنی بد نصیبی، اپنے بچوں کی بد نصیبی، اپنے مستقبل کے اندھیرے پن پر پھل رہے تھے۔

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی۔

تانی کی پتنگا سی نگاہیں بار بار پتنگ کا طواف کرتی تھیں گھر کی میں بیٹھے اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ صندوقی ہو رہی میں بیٹی تسخیر آفتاب کا منتر پڑھتی کسی مہم سے لوٹ رہی ہے سارے گھر میں ٹکڑے شانی کا پھر یہ الہا رہا تھا۔ گویا ہر بندیں برس رہی تھیں لیکن گھر کے اندر باہر سڑیوں کی ٹوم ٹوم دھوپ کا سماں تھا۔ آج بادلوں میں ایسی آکنان اور آنسو نہ تھے بلکہ آج قوادے دوپٹے اوڑھے۔ کندھوں پر برنجی گاگرس اٹھائے رادھا گری ہے گہریاں قطار در قطار پانی لا رہی تھیں۔

تانی کی پتنگا سی نگاہیں سوئے ہوئے شیخ جی پر منڈلا رہی تھیں۔

یہی مرد کل تک شیخ صاحب تھا، اس سے اُسے محبت تھی، لیکن اس کے وجود سے تانی کے انگ انگ میں گناہ کی خارش اُٹھتی تھی جینیر کے تازیالے کسی گھڑی اپنی کارگزاری بند نہ کرتے تھے۔ تانی کا سب کچھ پہلے بھی شیخ صاحب کے لیے تھا لیکن نکاح کے دو بول اس گھر میں کیا سُر ہوئے سارے گھر میں اس شخص کے وجود سے بہار آگئی۔ تانی کو شیخ جی کی ہر بات ابھی لگتی تھی، بلاوجہ۔ اہم پن کی حد تک۔

آلو کو یہ اعتراض تھا کہ شیخ جی موٹے بہت ہیں اور میں تانی سے بڑا

بھی بہت ہیں آپ کے سامنے تو تابی چپ رہتی لیکن اکیلے میں تابی سوچتی، موڑے ہیں تو کیا بٹوا؟ شوہر مرنے ہو تو رجب داب والا نہیں لگتا۔ عمر و کی عورت سے بڑی ہی ہونی چاہیے ورنہ شادی کے دسویں سال میاں بیوی کا رشتہ ماں بیٹے کا نظر آتا ہے۔ ان کی بیماری سے بھی تابی کو مریضانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ سوچتی وہ تو شیخ جی قسمت سے بیمار رہتے ہیں۔ ورنہ ان ہاتھوں کو ان کی خدمت کا موقع ہی کب ملتا؟

شادی سے پہلے محض ایک وعدے کی بنا پر تابی شیخ جی کی ہوسچکی تھی۔ تن من دھن سے ان کی غلام تھی اب تو ہریل احسان مندی سے بھی دل ڈوبا چلا جاتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر شیخ جی کے پاؤں چُوم لے۔ اپنے چمڑے کے ہاتھ سیسیر بنوا کر شیخ جی کے گدگدے پیروں میں پہنا دے — اللہ مجھ سیسی راندی ہوتی سے شیخ جی نے نکاح پڑھوایا۔ مجھ بازار والی کو یہ عزت بخشی۔ کوڑے کی ٹوکری کو سر پر اٹھایا جب یہ باتیں اس کے ذہن میں آئیں تو شیخ جی کی محبت کا سوتا جسم پر آبشار بہ کر گرتا اور روح تک کو سرشار کر جاتا۔ اس محبت میں اندھیرے بادلوں کی سی ستر لپٹتی تھی، حضرت بلالؓ کی سی عبودیت تھی۔ رام رام سمن کرتی چٹاکے گرد چکر لگاتی پدنی کی لگن تھی۔

تابی آہستہ سے صندوقِ ہر وج سے اٹھی اور سوتے ہوئے شیخ صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر ہوئے ہوئے رونے لگی۔

حمیدہ اٹھی تو طوفان بن کر لیکن نصیب برگشتہ کی طرح پھر ٹھہر چوکر
چوکی پر بیٹھ گئی۔

ناموں نے چھٹی مرتبہ پھر وہی بات کہی۔ لیکن اس بات کی کیا گارنٹی
ہے کہ شیخ صاحب دوسرے نکاح کے بعد بھی حمیدہ کی کفالت کرتے رہیں گے
— اس سارے معاملے کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ کسی طرح شیخ صاحب اس
بد معاش کو چھوڑ دیں۔“

جہاں تک حمیدہ کا تعلق تھا وہ یہ چاہتی تھی کہ شیخ صاحب چاہے جہانی
طور پر تباہی کو چھوڑیں نہ چھوڑیں لیکن مچلکہ لکھ دیں کہ اس کا ہزار روپیہ ہر ماہ
کھرا ہے گا۔ ایک طرح سے تو وہ خوش تھی کہ گناہ سمیٹنے کو ایک دوسری آگئی لیکن
مشکل یہ آن پڑی کہ بقول ناموں تباہی کسی تھی، انڈی تھی، روپے پیسے کی بوجی وہ
کب تک برداشت کرتی رہے گی کہ حمیدہ کو ہزار روپیہ ماہوار نفقہ کا ملنا ہے۔
”ارے تم نہ ڈرو حمیدہ ہم تمہاری پشت پر ہیں۔ ادھر تو کارخانے کو انڈسٹری
کے ڈائریکٹر سے کہہ کر بند کروا دیں گے ادھر ٹرولر پیپ ہاتھ سے نہ لٹکا دیا
تو کتنا جیب بزنس کا درجہ بند ہو گا تو یہ ساری محنت اپنی دم نچت ہو جائے
گی۔“

حمیدہ لرز گئی محنت کو دم نچت کرنے کا ہر طریقہ اسے ایک آنکھ نہ بھلایا
اللہ وہ جو کہیں سے ایسا علاج ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور بزنس کی لالچی
بھی سلامت رہے تو یہی لطف ہے۔

خاناہ صغریٰ ریشمی برقعے کو اٹھا کر بولیں، بھائی جی ہماری حمیدہ تو سیدھی

سادہ ہے آپ خود جا کر اُس گلی مری۔ سسٹے۔ اُس رنڈی کے ہتھکنڈے
بیچاری یہ کیا جانے۔

مشکل تو یہی ہے کہ شیخ صاحب نان نفقہ کے ضامن بھی بن گئے تو کوٹھنے
والی کسی کب کیفل رہنے دے گی۔ شیخ صاحب کو نو واپس ہی لانا پڑے گا
— ہر قیمت پر —

اپنے ساتھ واسے پٹنگ پر نخل نخل کرتے ہوئے زرخے سے بھیانک
آفاتیں نکالتے شیخ جی کے قصود سے ہی حمیدہ لہزہ لگی۔ اُس کے دل میں آنکلی
میں پرائی آہنی پر شیخ جی کی وہ ساری باتیں افسوس کرنے آئی بیٹھی تھیں جن کا
شیخ جی کی محبت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ رنڈی کے ہاتھوں خراج بند ہو جانے
کا اندیشہ تو تنہا ہی دُوبے یہ وہ ہمہ ستانا تھا کہ سارے میں تک کٹی ہوئی ہاری
توپ کو کیسی انجک پھاٹ گئی کہ شیخ جی جیسا کہ وہ دن شکار ہاتھ سے جا آ رہا۔
جب ماموں نے گلبرگ جانے کا قصد کیا تو خالہ اصغری نے بچوں کو گندے
میلے کپڑے پہنا کر تھیوں کی ساری خریاں پیدا کر کے ٹیکسی کی پھیلی سیٹ پر اٹھایا
پیلے تو حمیدہ ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی تھی لیکن جب اٹھا رھوں تو رہ چلتے
چلتے ماموں بولے۔ ”دیکھ تو حمیدہ! وہ حرفہ باز ہے مات دے گی تمہیں یہ مت
مجھنا کہ ایسی عورتوں کے وعدے اعتبار کے قابل ہوتے ہیں مجھے یقین ہے
کہ سلسلے ضرور مان جائے گی، لیکن ایسی عورتوں کا اعتبار کیا۔ بہتر تو یہی تھا کہ
تم ساتھ چلتی تیں اور کسی طرح شیخ جی کو والائیں در زمان کے چلتر تم کیا سمجھو۔
آنکھوں میں مٹھیاں دے دے کر روو گی۔“

حمیدہ خنزیرہ ہر کچھ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آدھ کھلی کھڑکی سے سر اندر ڈال کر خالہ صفری بولیں۔ ”اے حمیدہ! جب ماموں دہکا پکیں تو پھر دلا۔ سے کام لینا کہیں پچا فسا ہوا شکار نہ جڑ کا دینا۔ وہ تو ایسے سب گن پڑھی ہیں میں تم کو تاکید کرتی ہوں نگارٹ کی باتیں کتنا لگاؤ کی۔ وہ نہ ہو کہیں شیخ صاحب کی ہرٹے کی دہری مالک بن بیٹھے۔“

کیاں پارک کی جانب سے اٹھنے والا فیمل مست بادل گلبرگ پر بے جان بیٹھا تھا۔ ٹیکسی کی سیلی چھت پر رشید جیسی بوندیں پھوہار بن کر لڑ رہی تھیں اور میٹر دم بدم بڑھ رہا تھا۔
سانی شکست خوردہ راجپوت رانی کی طرح صندوقی ہو رہے ہیں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پہلے ماموں نے پورن گھنڈا اس کی، اس کے پیشے کی، اس کے آباؤ اجداد کی بے غیرت زندگی کی لچھے دار گالیوں سے ضیافت کی۔ اس اشیا میں حمیدہ چا پائی کے سر مالے یوں کھڑی رہی جیسے اس کمرے کی ہر چیز میں پھول مانا کے جراثیم ہوں۔ جب اپنے بھانوس ماموں تابی سے نیٹ چکے تو غصے کی گاڑی شفٹ کرتے ہوئے شیخ جی سے بولے۔ ”تم جانتے ہو کہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز سے میرے کیسے تعلقات ہیں بڑی بھر میں ساری فیکٹری پر تالا نہ ڈالو اور آتش شیخ الہی بخش نام نہیں، جس دولت کے مان پر نہیں یہ اتنے تعلقے سوچھے ہیں۔ اُس دولت کا پرنا لہ ہی بند کر دوں گا، انشاء اللہ!“

شیخ جی کچی فینڈ سے جا گئے تھے، چہرے پر پلاہٹ جسم پر لڑا ہٹ اور
 دلائیں دوسو سے تھے۔ پھر نگاہ جو مکمل قوسا سے حمیدہ اور ماموں کی شکل نظر
 آئی۔ بیماری نے پہلے ہی قوت مدافعت چھین لی تھی۔ پلنگ پر عادی مجرموں کی
 طرح بیٹھ گئے۔

”تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔۔۔ لیکن اس آوارہ سے نکاح پڑھوا کر اب
 بروہی کیا۔۔۔ بے شرم کار تو گھر پر ہی رہنے دیتے، یہ لوگ تو سارا مال ہتھیا کر
 بھی اپنی نہیں بنتیں۔“

”یہ میری ویسی ہی بیوی ہے جیسی حمیدہ..... آپ آپ۔“ انھوں نے
 تباہی کے لیے آواز کو بلند کرنا چاہا، لیکن آواز کہیں ملتی ہی نہیں سوکھ گئی۔
 برآمدے میں حمیدہ کے بچوں نے ہلچل مچا رکھا تھا۔ نئی بسم اللہ کی سائیکل
 کو دھڑا دھڑا رہے تھے، آسمان پر گھر سے سڑی بادلوں میں خون ناک سی چمک
 کوڑیا لے سانپ بی کر بار بار لہرا رہی تھی اور میٹر دم بدم ڈھنسا جا رہا تھا۔
 تباہی آہستہ سے بروج میں سے اُتری۔ حمیدہ کے بچوں کی آوازیں اُس
 کے کان میں گرم سیسہ بن کر اتر رہی تھیں۔ آخر ان محصور مدحوں کا کیا قصور تھا؟
 جس طرح بستو کو ایک والد کی ضرورت تھی اُسی قدر ان بچوں کو بھی تو سہارے
 درکار تھے؟ وہ آہستہ آہستہ الماری تک آئی اور سیکر پڑ گئی جیسی اچکن اُٹارنے
 لگی۔

شیخ جی نے تباہی کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسی وقت آگے بڑھ کر حمیدہ
 نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور جیتاں پیروں سے کھسکا کر ان کے برابر

کر دیں۔ جاتے ہوئے نہ تشریح ہی لے لٹ کر دکھا اور نہ ہی طوائف انہیں شکسیتک
پھولنے گئی۔

کینال پارک سے آنے والے بادل کی تھاقیں پھٹ گئیں اور کاجل بھری پھل
گھرگ کی کوٹھی پر پڑنے لگی۔

تباہی لے سارے کرے پر نگاہ دوڑائی اور پھر شیخ جی کے خالی پلنگ کی پائنتی
ہا بیٹھی اس کی آنکھوں میں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ایک آنسو
بیس شیخ جی کی شبیر ٹوٹ رہی تھی، نکھر رہی تھی۔ اُس کے سر کا سیس پھول پتی پتی
سارے گھر میں بکھرا پڑا تھا۔

نقص



چٹان

عجیب واقعہ گزرا۔۔۔!

یہ اُس سال کی بات ہے جب میں اپنے بوڑھے طبی مشیر ڈاکٹر گار کے ساتھ کہہ الماس کے سبزہ زاروں پر اعصابی سکون کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے نلول کا آخری حصہ مکمل کر رہی تھی۔

موسم گرمی کی بہاروں میں الماس کا چتہ چتہ مسیاحوں اور مسافروں کی تفریح کا آماجگاہ بن جایا کرتا تھا۔ یہاں میں نے ایک نیلی چٹان کے سرے پر جگہ لے رکھا تھا جس کے سامنے چمن لیلیاں رہا تھا۔

بوڑھا ڈاکٹر گار بڑا مجلس پسند آدمی تھا۔ اپنی ساری زندگی اس نے اعلیٰ معیار کی محفلوں کے فانوسوں تلے بس بول کر گزاری تھی۔ چنانچہ آج کل کی چھٹیوں میں وہ تمام تمام دن مرغزاروں کے چکر کاٹتا اور دوستوں کے گپ لگاتا۔ ہندوؤں ہاتھ میں رہتی، اور جہاں کوئی شکار نظر آتا، اسے نشانہ بناتا اور میں نیلی چٹان کے زیر سایہ بیٹھی اپنی کتاب لکھا کرتی۔ پھر جب شام پڑتی اور آسمان پر تاروں کی آگ لگ جاتی تو ہم دونوں اسے مٹتے سے جگمگاتے شہر کی سیر کے لیے نکل جاتے۔ دوستوں سے ملاقاتیں کرتے محفلوں

میں شریک ہوتے، میں اپنی نامکمل کتاب کی باتیں کرتی، ڈاکٹر گاراپنے شکار کی — اور آدمی آدمی رات گئے واپس آتے غرض رات بڑے جھگڑے میں کٹتی اور دن صرف نیت میں۔ کوہ الماس چونکہ مختصر جگہ تھی اس لیے وہاں کی نصف سے زیادہ آبادی ہمارے جاننے والوں کی تھی۔

ایک صبح میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان لیے سید مخدوم کے تالے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ سامنے درخت کی ایک گہرے کاسنی رنگ کی ٹہنی پر ایک زرد پروں اور نیلی جینچ والا پرند ٹھیا زور زور کی سیٹی بجا رہا تھا۔ ڈاکٹر گاراپنے نسوار کی ڈیریا اور بندوق لیے پھاٹوں پر گھوم رہا تھا کہ اتنے میں مری بوڑھی حبش زوناش حسب عادت منہ پھلائے نوردار ہوئی۔ ”کیا بات ہے بوڑھی بتی؟“ میں نے اپنی گہری سوچ سے باہر نکل کر پوچھا۔

”نجانے کیا بات ہے۔ بوڑھی زوناش عام طور پر صبح کے وقت چڑچڑی ہوا کرتی تھی۔ شاید رات بھر کے خونخاک خوابوں کا اثر اس کے ذہن کو پریشان رکھتا تھا۔ خشک لہجے میں بولی۔ اپنا تار لیجیے۔“

”اوہ کس کا ہے؟“ میں چونک پڑی۔

زوناش بغیر جواب دیے اپنی موٹی کمر لاتی واپس جا چکی تھی۔

میں نے جلدی میں لفافے کے ساتھ تاریبی پھاڑ دیا۔ پھر اسے جوڑ کر پڑھنے لگی اور پڑھنے لگی اور پڑھنے ہی تو محسوس ہو گئی تار زلفی کا تھا، لکھا تھا۔ ”مجھے فوراً آلو۔ میرا ارادہ مختصر بہ خود کشی کا ہے۔ کبھی بہ زندگی مجھے کتنی

عزیز تھی! پر اب۔۔۔ بڑی نفی :-

میں نے اسی وقت تیرا جواب تیرے دیباکہ

”مرے آنے تک رکتا رہی۔“

تار پڑھ کر میرے احصاب تہ و بالا ہور گئے۔ بڑی نفی کی مٹی سی لاش خوں میں نہائی ہوئی مجھے صاف نظر آرہی تھی اور اس پر سخت حسرت برس رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہم مکتبی کے دن، بے ٹکری کا زمانہ، اور ہمیش کی گھڑیاں یاد آنے لگیں جب میں اور بڑی بچیاں تھیں۔ بڑی نفی مری پرانی دوست تھی مجھے اس کا بھی علم تھا کہ وہ سخت بزدل ہے اور خود کشی بہت کا کام ہے لیکن اس کے باوجود اس کی لاش بار بار مری تصویر کی آنکھوں کے آگے آجاتی تھی اور مری مسکیاں نکل جاتی تھیں۔

ہریشاں جو کہ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ گیارہ بجے ایک جہاز جانے والا تھا۔ مجھے اسی میں اڑ جانا چاہیے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔
ٹھان۔ ٹھان۔ —! دو پرہاڑوں پر سے ڈاکٹر گار کی بندوق کی ناگوار آوازیں آرہی تھیں۔ میں بڑا سامان گئی۔ مجھے شکار سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ اس غلامانہ شعل سے مجھے نفرت تھی۔ جانے لوگوں کو کیا ثواب مل جاتا ہے جانوروں کو مار کر۔ — پھر میں تو اس مخلوق کی شیدائیوں میں سے تھی۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے جلد جلد اپنے کاغذات پلٹے۔ اندر کرے میں جا کر ایک چھوٹا سا انچی کیس ٹھیک کیا اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب میں ہوائی اڈے کو جانے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلی تو ڈاکٹر گار

مجھے جنگل کے ایک سوٹر پر بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے ملا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی چیز لٹک رہی تھی۔

یہ صحیح بیچ کر مجھے آوازیں دینے لگا۔ روجی! روجی! ادھر دیکھو۔ آج مرنے والی ملی ہے۔ زردناش سے کنا دودھ پر کے کھانے کے لیے اسے بھالنے میں خوب سُرخی تل دے۔ ہاں وہی کا پھینٹا ضرور دے۔

میں نے بے پروائی سے ہلٹ کر دیکھا۔ مری ایک سسکی سی نکل گئی۔ وہی کا پھینٹا۔ اہ زلفی خود کشی کر رہی ہے ڈاکٹر۔ اور آپ مرنے والی کی۔ ڈاکٹر گارمرب آگیا۔ کیا کہا؟ زلفی؟ خود کشی؟ جا کہاں رہی ہو تم؟ میں نے تاراسے دے دیا۔ وہ آنکھیں چندھیا کرے ہوئے تار پڑھ کر بولا: اور تمہیں یقین آگیا؟

”نہیں۔“ میں نے دوسری سسکی بھری تاہم کیا معلوم۔ ڈاکٹر گارمربس پڑا۔ میں تم سب کو بچپن سے جانتا ہوں روجی۔ اسے خود کشی تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ زلفی خود کشی کیا کرے گی۔

”لیکن اس نے مجھے فوراً پہنچنے کی تاکید کی کہ جہاں کا معاملہ ہے ڈاکٹر میں اسے ساتھ لے کر کل صبح کے جہاز سے واپس آجاؤں گی۔ تاکہ خود کشی کا اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔“ یہ کہہ کر میں پل دی جہاز میں تمام رستے میں بادلوں کو ٹنگتی اور ادھر ادھر مڑتے ہوئے نظر میں ڈالتی چھوٹی سفیر کاٹی رہی۔

ڈاکٹر گارمرب مرنے والی اٹھا کر بلانے اور مجھے خدا حافظ کہنے لگا۔

دو گھنٹوں بعد جب میں زلفی کے ہاں پہنچی تو وہ ایک دھانی رنگ کے

نوعصورت لباس میں باغ کی درہجی پڑھنی ٹھہری کی طرح ایک ٹرخ سیب کٹر کٹر کر کھا رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر مجھے دلی اطمینان ہوا۔ مسکرا کر بولی۔ "تم تو بڑی سنوری بیٹی سیب کھا رہی ہو۔ خود کشی کا پردہ گرام کیا ہوا؟"

اس نے مجھے گلے لگایا بولی: "دردن سے خفا تھا روحی یہ پہلا سیب ہے میں تمہاری منتظر تھی۔"

"اور خود کشی؟" میں ہنس پڑی اور اچھی کیس نیچے ڈال دیا۔

"تم نے تار میں ملٹوی کرنے کو لکھ دیا ورنہ مر چکی ہوتی۔"

"میں تمہیں کوہ الماس اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں زلف سیسی روشن گرم بہاؤ میں خود کشی کرنا کفرانِ نعمت ہے۔"

"تم خود کشی کی وجہ نہیں جانتیں روحی۔ تم میری جگہ ہوتیں تو یہی کرتیں۔"

"میں مایخو لیا کی مریض نہیں ہوں جو یہ اقدام کرتی۔"

اس نے سیب باغ کی درہجی سے باہر پھینک دیا۔ کمرے میں اتر کر ایک ٹرخ قالین پارے پر پٹکے کے نیچے لیٹ کر بولی۔ "روحی، تم کو میری سوتیلی بہن شافریا دے، طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ کس قدر مکار مشہور تھی۔ اکثر لڑکیاں اسے ناپسند کرتی تھیں۔ محض اس کی مکاری کی وجہ سے،" میں کچھ یاد کر کے بولی، "ہاں ہاں مکار اور حسین۔"

اسی نے مجھے خود کشی پر آمادہ کر دیا۔ "زلغی نے دردناک لمحے میں کہا۔ میں متاثر سی ہو گئی۔ ہائے زلغی۔ تم اس کے ساتھ آخر رہتی کیوں ہو؟"

— اب آج ہی تم مرے ساتھ کوہ الماس چلو۔ تم نے اب تک تفصیل تو مجھے کچھ بھی نہیں بتائی۔“

زلفی کچھ سوچ کر بولی۔ ”میں نے تم کو اس لیے بلایا تھا کہ اگر تم میری بجائے شالو کو اپنے ساتھ کوہ الماس لے جاؤ تو میرا کام بن جائے گا۔“
میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ صوفے پر کا ایک کٹن کپڑا اس سے ٹپک لگائے ہوئے بولی۔ ”آخر بات کیا ہے زلف؟“

زلفی اب سنجیدہ اور اس نظر آ رہی تھی۔ ”اگر تم اُسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اُس کی وہاں کہیں شادی کر دو تو میں زندگی بھر تمہارے اس لسان کو نہیں بھولوں گی۔“

”کسی کی شادی کرانا آسان ہے زلفی؟“ میں حیران ہو کر اس کی بات دیکھنے لگی پھر بولی ”مزید برآں اس جیوار لڑکی کی شادی کر لے کے فرائض آخر تم کیوں سرانجام دو؟“

”بھئی۔ اس نے مری حق تلفی کی ہے۔ اب سارا قصہ تم کو مختصر آسان کیوں بتاؤں۔ میں نے میرے ایک دوست میں مری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو بید دلکش اور خوش ذوق ہے۔ مارچ کا مہینہ ہم نے سرسری ملاقاتوں میں کاٹا۔ اپریل میں ملاقاتیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اوائل مئی میں اس کا تعارف اپنے رشتہ داروں سے کرایا اور سب نے اُسے بے حد پسند کیا۔ اور اواخر مئی کا زمانہ محبت کے دلفریب خواب دیکھنے گزر گیا، لیکن جون کے پہلے مہینے میں شالو آگئی۔ اس کا آنا تھا کہ مری دنیا تہ وبالا ہو گئی۔ اس نے آتے ہی اس پر

جادو سا کر دیا۔ وہ اس کے قریب ہوتی چلی گئی اور میں فوراً بٹنی لگی۔ اب
نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اگر میں ایک قدم بھی اور پیچھے ہٹی تو ناکامی کے
خار میں جا گروں گی۔

”لیکن وہ شخص؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے متعلق میں کچھ کہ نہیں سکتی تو جیسا کہ وہ شانوسے محبت کر رہا ہے
یا مجھ سے، مجھے دھوکا دے رہا ہے یا اُسے؟“

”پھر تو وہ خاصا گرگ باراں دیدہ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ جیسا بھی ہے..... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم شالو کو اپنے
ساتھ لے جاؤ۔ کوہ الماس کی دلچسپیوں میں اسے اتنا غمگین کر دو کہ وہ اُسے
بھول جلائے۔ اور اگر ہو سکے تو اس کی وہیں کہیں شادی بھی کرادو۔ کوہ
الماس پر گرم بہانوں میں جگہ جگہ سے مسافر آتے ہیں۔ اسی جگہ بڑی آسانی
سے رشتے کرائے جاتے ہیں۔“

میں پریشان ہو کر بولی۔ ”لیکن میں اس فن کی ماہر نہیں ہوں دوسرے

زلفی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں کب کہتی ہوں روحی کہ تم کچھ کر دو۔ تم سدا
کی نکلی ہو۔ ڈاکٹر گاراس سلسلے میں بے حد کارآمد ثابت ہوگا۔ وہ دنیا جہان
کے لوگوں کو جانتا ہے۔“

باغ کی روش کی طرف سے ہلکی ہلکی سیٹی کی آواز آئے مگر پھر تھوڑی
ہی دیر بعد سر ہلکی آواز میں ایک عشقیہ مصرع سنائی دینے لگا۔ میں نے زلفی

سے پوچھا۔ ”یہ کون گا رہا ہے؟“

میرا جملہ ختم ہوا تھا کہ شالو نے غلی غلی کی تنگ جینس پہنے بازوؤں پر سیاہ بال لٹکائے لٹکاتی ہوئی اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹ گھٹائی رنگ کی لب اشک سے انگاروں کی طرح دھبے رہے تھے۔ اس کے ماتھے ہی کمرہ گھاس کے قطر کردہ ترخو شبوؤں سے جھبک اٹھا۔

مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”ارے رُدھی! تم یہاں! میں نے سنا تھا تم کوہا اس کے بنگالوں میں مشغول ہو۔ مجھے رشک آ رہا تھا تم پر۔“ مجھے کوہا اس اتنا پسند ہے کہ وہاں ایک ہفتہ گزارنے کے لیے میں اپنی جان تک دینے پر تیار ہوں۔“

میں ہنس پڑی۔ ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔ بغیر جان کا نقصان کیسے تم وہاں کی نضاؤں کا لطف اٹھا سکتی ہو، تم مرے ساتھ چلو اور مری ممان بن کر رہو۔“

زلفی خوش ہو کر بولی۔ ”رُدھی تمہیں دعوت دے رہی ہیں۔ شالو جینے بھر کے لیے ہو آؤ۔“

میں بولی۔ ”مجھے کل صبح کے جواز سے واپس جانا ہے چلتی ہو تو ساتھ چلو۔“ شالو کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئی پھر بولی۔ ”رُدھی، دو دن کے لیے تم اپنا سفر ملتوی نہیں کر سکتیں؟“

میں گھبرا کر بولی۔ ”دو دن؟ بہت زیادہ ہیں شالو تم کل ہی مرے ساتھ

چلو۔“

زلفی مجھے تیز تر نظروں سے گھورنے لگی۔ روجی۔ دو دن میں قیامت تو نہیں آجائے گی۔

میں بولی۔ مجھے اپنے ناول کا آخری حصہ مکمل کرنا ہے۔ زلفی دو دن کے معنی یہ ہوں گے کہ سوچا ہوا سارا خاکہ دماغ سے نکل جائے گا۔
 ”تو دماغ کے پٹ بند رکھو نا۔“ شانو ہنس کر بولی۔ اگر تم دو دن ٹھیک رہو گی تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے ایک ضروری انتظام کرنا ہے۔

میں باؤلی درخواست دو دن کے لیے ٹھیکر گئی۔

جب میں جانے لگی تو زلفی نے مجھے بے حد سار کیا اور بولی۔ روجی میں تمہارا یہ احسان (زندگی کے آخری لمحوں میں بھی یاد رکھوں گی تم نہیں جانتیں کہ اس عیار لڑکی کو یہاں سے دفع کر کے تم نے مجھ پر کتنا عظیم احسان کیا ہے۔ گورامری راہ سے ایک چٹان ہٹ گئی۔

”چٹان — میں سنس پڑی۔ گوراتم اسے اپنی راہ سے ہٹا کر مری راہ میں سائل کرنا چاہتی ہو اور واقعی میں اس کے نیچے دب جاؤں گی۔ اس لیے کہ میں کوہ الماس محض اس غرض سے سنس گئی کہ وہاں کے شعور و اثر میں لگی رہوں یا وہاں کی محفلوں کی شمع بنوں۔ میں تو اپنے ناول کا آخری باب مکمل کر لے گئی تھی۔ اب شانو دن رات میری جان کھایا کرے گی کہ مجھے دھوکوں میں گھماؤ۔ محفلوں کی سیر کراؤ۔“

زلفی بولی۔ تم بہت بھولی ہو روجی۔ تم شانو کو نہیں جانتیں۔ اسے

کسی سے متعارف کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے لیے راہیں آپ نکال لیتی ہے۔ وہ بڑی خاص المذاج لڑکی ہے اور اگر فرض کرو اس نے تمہیں کسی قدر پریشان کیا بھی۔ تو کیا ہوا۔ مرے لیے تم اتنی تکلیف گوارا نہیں کر سکتیں؟ آخر دوست اڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے۔ میں نے سوچا تو مجھے بھی اس کا کتنا کچھ شیک ہی معلوم ہوا کہ دوست اڑے وقتوں میں کام آنے کے لیے ہوتا ہے اور پھر مری آواز زلفی کی دوستی تو بچپن کی تھی۔ جب تیسرے دن میں شانو کو لیے ہوئے کوہ الماس پہنچی تو خوش گھو ایشانی بہ بانس کی سرسبز شنبیوں پر لغزہ مل گئے اور شام کی ہواؤں میں سولف کے گچھوں کی نمک رچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر گاربا ورجی خلیے میں چو لے کئے گئے اسپرین باندھے کھڑا اپنے فنکار کیے ہوئے جنگلی مرغ کی ایک ٹانگ بھون رہا تھا۔ اس نے ہیں دیکھ کر ایک قہقہہ بلند کیا۔ نسوا کی ڈیبا کھول کر زور سے سونگھی اور چہرے آگے بڑھا کر کہا۔ تم دونوں اسے چمک کر دیکھو۔ کیا لذیذ قورمہ پکایا ہے میں نے۔ زونا ش کو پکانے کے لیے کتنا تو وہ جلا کر رکھ کر دیتی۔ اسی وقت اس کی نظر بجائے زلفی کے شانو پر پڑی اور اس نے متعجب ہو کر کہا۔ "ہائیں؟ زلفی نہیں آئی؟"

اسی رات کا ذکر ہے۔ آسمان پر ککشاں کی بساط بھیجی ہوئی تھی بہار کے گرم دستر چھونکے ارغنون کا سا شہ مجاہد ہے تھے۔ شانو نے کھانا کھاتے ہی اپنے کسی دوست کو فون کیا۔ وہ دوست ذرا سی درمیں آکر اسے موسیقی

کی کسی محفل میں لے گیا۔

میں آنس کریم کے دو پیالے ہاتھ میں لے کر باغ کی بیڑھیوں پر جا بیٹھی ایک پیالہ ڈاکٹر گار کے ہاتھ میں تھا دیا۔ دوسرا خود کھاتے ہوئے شانو کے اس سفر کا عقد ڈاکٹر گار کے ذہن نشینی کرایا اور کہا: ”یہ مسئلہ آسانی سے حل ہوتا نظر آتا ہے ہجرتی مہی ہلکی معلوم ہوتی۔ آتے ہی کوئی واقف نکال لیا۔ اب اس سے محبت کی پیٹلیں بٹھسنے لگیں۔ بہر حال ٹبری بات پر ہے کہ زلفی کو اس سے نجات مل گئی۔“
ڈاکٹر گار نے کہانی سن کر کہا۔ ”بھاری زلفی۔ اچھا کیا کہ اس چٹان کو تم نے اس کی راہ سے ہٹا دیا۔“

میں بولی: ”میں نے تو شکاری طور پر ہٹایا ہے۔ مستقل ہٹانا آپ کا کام ہے۔ اس کی شادی کرا دیجیے۔“

ڈاکٹر گار نے آنس کریم سے منہ بھر کر کہا: ”کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں، کوہ الماس — تم جانتی ہو۔ یہاں گرمیوں میں بیسیوں رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آ رہا روحی بیٹی۔ سلیم نجمہ کا ایک چھان ہے۔ کنوارا اور خوبصورت۔ اس کے اعزاز میں آج دو پہر سلیم نجمہ نے ظہرہ کر رکھا تھا تمہارا بھی بلوا تھا، مگر تمہارا جواز کھانے کے وقت کے بہت بعد میں پہنچا۔ ہاں تودہ نوجوان دیکھنے میں تو ہنس مکھ اور مفسدہ خواتین اور لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد کوہ الماس کی محفلوں کا چراغ بن جائے گا۔“

”تو ڈاکٹر اس سے شالو کی ملاقات کرا دیجیے نا۔“ میں نے لڑکی سیٹی بتی کو آنس کریم کھلاتے ہوئے کہا، اور پھر بولی: ”اگر ہو سکے تو شاہی....“

پھر میں ذرا ہنس کر لولی چٹائیں لیونہی بیٹتی ہیں :-

میں پوری کوشش کروں گا۔ اگر وہ نوجوان شریف اور محنتور نکلا اور دونوں نے ایک دوسرے کو پسند بھی کیا تو میں بیگم نجم سے کہہ کر ان کا رشتہ کر دوں گا۔
 ”بیگم نجم کو ایک تو اس قسم کی باتوں سے انتہائی دلچسپی ہے۔ دوسرے وہ اس سلسلے میں ماہر فن کی حیثیت رکھتی ہیں۔“ بیٹن دوستی سے بتی کامنہ پوچھتے ہوئے کہا۔

اس شب جب میں زینہ خرابگاہ میں گئی تو بے حد ملنسار تھی۔ کیوں نہ ہوتی۔ میں نے دوستی کا فرض ادا کر دیا تھا۔ مسکرا مسکرا کر سوچنے لگی۔ زلفی کس قدر احسان مند ہوگی میں نے جہنم سے نکال کر اسے فردوس بریں کی راہ پر ڈال دیا ہے.....! واقعی دوست ہو تو نبھ سا ہو میں نے دیر تک اپنے نیلگوں بستر پر لیٹی مسکراتی رہی۔

دوسری صبح جب میری آنکھ کھلی تو درہچے سے بہار کے خنک جھونک اندر آ رہے اور مرے خساروں کو چھو رہے تھے اور مرے بستر سے نیلگوں روشنی بجاؤاڑی جا رہی تھی۔ قریب ہی شاہ بلوط کی شاخ پر ایک ابابیل بیٹھی نغمہ الاپ رہی تھی۔

میں نے حنظل کے پانی سے جلد جلا غسل کیا اور تیار ہو کر نیچے ناشتے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ میز پر ٹاکٹر گار اور شانو پہلے سے موجود تھے اور نیچے کے گرم گرم سمو سے کھا رہے اور کافی پی رہے تھے۔

زونا نش حسب عادت بڑبڑاتی ہوئی باغ میں فرنی ٹونگا لپٹا رہا۔

میں کھڑی تھی۔ اس صبح اس نے ایک گھرے گلابی رنگ کی پوشاک پہن رکھی تھی جس کے سیاہ رنگ کو زیادہ نمایاں کر رہی اور اسے خوشنما بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "سلام خاتون زوجی۔ آج بڑی دیر سے اُٹھیں آپ۔ میں نے آپ کے لیے تازہ انناس کارمن نکال کر اس میں برت ڈال دی تھی۔ پھل نہ گئی جو — تو یہ تو بہ اتنی دیر ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اکثر روز صبحی جوشن کی جلی کٹی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ اس لیے چُپ چلپ جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور ناشتہ کرنے لگی۔

ڈاکٹر گارڈر شانو بے حد خوش نظر آ رہے تھے اور باتیں کیے جا رہے تھے میں نے انناس کا لالک گھونٹ لے کر کہا۔ "تاؤ شانو، رات کی محفل موسیقی کیسی رہی؟ تم بہت دیر میں لوٹیں؟"

شانو نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ ڈاکٹر گارڈر بول پڑا۔ "وہی عجیب اتفاق ہے۔ رات کی محفل میں بیگم نجم کا وہ جہان بھی شریک تھا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔"

"اُسے عجیب اتفاق ہے۔" میں نے حیران اور خوش ہو کر کہا۔

اس پر شانو بولی۔ "میری بھی اس سے ملاقات ہو چکی ہے زوجی۔ بلا کا خوش مزاج ہے اور خاندانی آدمی ہے آج اس نے مجھ سے وقت کافی پر مدعو کر رکھا ہے اور شام کو بیگم نجم کے ہاں برج پارٹی پر بھی وہ موجود ہو گا۔ تمہیں بھی چلنا ہو گا؟"

”مجھے ناش کے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں، شالو تم اور گار چلے جاؤ۔“ میں نے سکراتے ہوئے کہا پھر یوں ہو سکا تو فرصت پا کر بعد میں آجاؤں گی۔“ اس کے فوراً ہی بعد ناش نو اٹھ کر تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں پہلی گئی تو ڈاکٹر گار نے سگار سلگاتے ہوئے آمبتہ سے کہا: ”بیٹی روجی یہ عجیب لڑکی ہے دیکھتے ہی دیکھتے بیگم خیم کے مہمان سے بے تکلفی کے ایسے تعلقات بنا لیے ہیں گویا ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔“

میں سنس بڑی: ”تعلقات کی ترقی کی یہی رفتار ہی تو وہ دن دور نہیں کہ دو ہفتوں کے اندر اندر شادی بھی ہو جائے۔“ کیوں ڈاکٹر؟“ ڈاکٹر گار نسوار کی ڈوبیا کھولتے ہوئے بولا: ”اسی کو کہتے ہیں چٹ منگنی پش پیاہ۔“

اور یہی ہوا۔۔۔! بیگم خیم کے ہاں کبھی رقص و موسیقی کی محفلیں ہوتیں کبھی نصف شب کے بیگلے منعقد ہوتے۔ میں چونکہ اپنی کتاب ختم کر کے دم لینا چاہتی تھی اس لیے ان محفلوں میں شاید ہی شریک ہوتی۔ میں نے بیگم خیم کے مہمان کو اب تک نہ دیکھا تھا۔

ایک شام بیگم خیم نے ٹیلی فون کر کے مجھے تنبیہ کی: ”روجی۔ تم کوہ الماس تفریح و سکون کے لیے آئی ہو یا مصروف کتھی کی زندگی بسر کرنے کے لیے، تلف ہے تم پر۔ لوگ سال بھر کی تکان قدر کر کے یہاں آتے ہیں اور تم نے سال بھر کی محنت یہیں کرنے کی قسم کھائی ہے۔ آج تمہیں ڈاکٹر گار اور شالو کے ساتھ صرف

اں کھانے پر چڑھ کر بڑا بڑے گا۔ ہاں۔ — تاکید ہے۔ اور انھوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

چنانچہ ہم قینوں رات کے کھانے پر یکم خیم کے ہاں پہنچے ہیں بھی بے حد خوش تھی کیونکہ دلوں کی محنت کے بعد تفریح کا مطلق آسما تھا۔ یکم خیم کی محفلوں کے ہنگامے کوہ الماس میں شہرت رکھتے تھے۔

اسی رات پہلی دفعہ مری ملاقات ان کے مہمان سے ہوئی اور واقعی وہ بہت دلکش فوجیہ ان نکلا۔ مگر مجھے ایک بات کا احساس ہوا اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو ہوگا ہمیں بے یقینی کا پیام دیتی ہے یعنی یہ نہیں معلوم ہوئے پتا کہ اس قسم کے لوگوں کا کتنا رکیلا ہے۔

شانو نے مراعات اس سے کر دیا "دو جی" یہ ہیں یکم خیم کے مہمان ونگ کا ٹیڈرو فائی۔

"وفائی؟" سری منسی نکل گئی پھر گفتہ لبے میں بولی۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کے نام میں پائنداری کی خوشبو آتی ہے۔ وفا کرنا آدمی کی بہت بڑی صفت ہے۔"

ونگ کا ٹیڈرو فائی ہنس پڑا، بولے۔ زندگی میں جہاں جہاں بھی وفا کرنے کے موقعے سر پر آ پڑیں گے اس سے دریغ نہ کروں گا۔

اور واقعی وہ بہت باتوئی ہے، دلچسپ اور خوش شکل شخص تھا۔

مجھے اور ڈاکٹر کار کو کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ مرحلہ خود بخود طے

ہو گیا جب ایک شام شانوف نے عجب پر اس راز کا انکشاف کیا اور کہا: رنجی پیاری، میں نے ڈنگ کمانڈو فانی کی طبیعت اور مزاج کو ابھی طرح جانچ لیا ہے۔ تمہیں یہ سن کر متحیر نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ہم اسی سبھتے شادی کر لینا چاہتے ہیں۔ میں نے تار دے کر اپنی خالہ سے اجازت منگوائی ہے۔

شادی اس کی ہو رہی تھی اور خوشی میں تھی۔ بار بار خیال آتا تھا، زلفی کس قدر خوش ہوگی اپنی راہ سے اس چٹان کے بٹ جانے سے۔
 سوچ سوچ کر اسی دیدہ میں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زلفی کو ایک تار دیا اور لکھا "چٹان سرکنے لگی ہے، خوش ہو جاؤ۔"
 دوسرے بھتے کوہ الماس کے شاندار ہوٹل "اڈورک" میں شانوں کی شادی ڈنگ کمانڈو فانی سے ہو گئی۔ شادی میں کوہ الماس کے سبھی میاں لوگ شریک تھے اور بڑے بنگلے کی شادی تھی اور کیوں نہ ہوتی، دو لادوہن کوہ الماس کی ہنگامہ خیز اعلیٰ محفلوں کے دو روشن چراغ تھے۔
 اُدھر میں شادی کی دعوت کھا کر باہر نکلی اُدھر تار گھر جا کر دوسرا تار دیا: "چٹان ہمیشہ کے لیے بٹ گئی ہے۔ تم فوراً پہنچو۔ رنجی۔"
 تار دے کر میں ایک غمز کا احساس لیے ہوئے گھر واپس آئی اور سکرانے ہرے زلفی کے لیے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ ٹھیک کر لے لی۔

دوسرے دن میں نے دو لادوہن کے لیے کھانا تیار کر رکھا تھا اور

سارے زندہ دلائل الماس کو مدعو کیا تھا اور اسی دن زُلّی پہنچنے والی تھی۔
میں تمام دن دعوت کے انتظام میں مصروف رہی مگر مسلسل مسکراتی
رہی۔ سوچتی رہی، میں نے زُلّی کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کس قدر
خوش ہوگی۔

میں نے ضیافت کا انتظام عرشہٴ حین پر کیا تھا، کیونکہ گرم بہانوں کا
زمانہ تھا اور صحرائی پرندرات رات بھر باغ میں فغمہٴ سنچ رہتے تھے۔ میں اور
ڈاکٹر گلزاریہو کر مہمانوں کی پیشوائی کے لیے باغ کے دروازے پر ساکھڑے
ہوئے۔ آٹھ بجے مہمان آئے شروع ہوئے۔ حشقیہ موسیقی کی تانیں اور تازہ
پھولوں کی بیٹیں فضا میں رقصاں تھیں۔ کہیں تھمے سنائی دے رہے تھے،
کہیں لطیفے، ڈاکٹر گلزاریہو شب طعانی کے سیاہ کوٹ کی کالج میں گھرے سُرخ
رنگ کے گلاب کی ایک مُتی سی دہکتی ہوئی کلی لگاتے بڑے ٹھاٹھ سے
انتظام میں مصروف تھا۔ میں بھی اپنے گلابی ریشم کے بھاری جوڑے میں
کبھی نوکروں کو ہدایات دیتی ہوئی، کبھی مہمانوں سے سلفی مذاق کرتی ہوئی
اور آدھ گھوم پھر رہی تھی۔ دو لہا دو لہن عروسِ لباس میں ملبوس ہاتھوں
میں سُرخ انگوروں کے رس کا جام تھلے مہمانوں کے درمیان عوجھٹکھٹکتے۔
سارے مہمان آپکے تھے، اب صرف زُلّی کا انتظار تھا۔ آج شہابِ جہاز
دیر میں پہنچ رہا ہے۔ کئی مہمانوں نے قیاس آرائی کی۔

انشہ میں برساتی میں ایک کارنا کرُنکی ہیں اپنے گلابی ریشم کے لباس
کے واسن سنبھالتی ہوئی زُلّی کی پیشوائی کو برساتی میں بھاگی۔

وہ بھی بنی ٹھنی بہار کی تیزی کی طرح کار سے اُتر پڑی اور اترتے ہی عجیب
 سے چپٹ گئی اور سرگوشی کی۔ مری جان روحی کیسے شکریہ ادا کروں تمہارا؟
 تم نے مری راہ حیات سے مصائب کی چٹان بٹا دی! میں اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالے بہانوں میں لے آئی اور بولی: زلفی
 پیاری۔ سب سے پہلے تم دو لہا دو لہس سے ملو اور انھیں مبارک باد دو۔
 دو لہا یہ ہیں ونگ کا نڈر وفاق۔ (پھر زور سے سانس کر بولی) جن کی کھٹی
 میں وفاق پڑی ہے

میں نے پلٹ کر دیکھا تو سرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ زلفی دو لہا
 کے چہرے کو شعلہ بار نظروں سے تک رہی تھی۔ پھر اُس نے جھلا کر کہا، ہائے
 روحی۔ یہ وہی ہے۔

اب مجھے معلوم ہوا اور اب میں اس ستم انگیز حقیقت سے آگاہ ہوئی
 کہ چٹان مٹی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ کے لیے عامل ہو گئی تھی۔
 پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی



نقص و شہ:

سواری

سورج ڈوب رہا تھا اور مجھے شہر پہنچنے کی جلدی تھی۔ کچا راستہ عبور کر کے میں پل پر ہولیا۔ دور — راوی کی ٹیڈ میں سورج اتر رہا تھا۔ بس اب جلتے تاجے سا کنارہ گیا تھا میں نے بے دھیانی میں اس کنارے کو دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ مگر کچھ دور جا کے مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے کچھ دیکھا اس لیے میں مڑا اور میں نے پل کے جنگلے پر جھکے وہ تینوں شخص دیکھے وہ تینوں سامنے دریا کی دلدل میں اترتے سورج کو پڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے میں نے بھی سورج کی جانب دیکھا مگر وہ کچھ نہ پا کر پھر ان تینوں کے چہروں کی طرف نگاہ پھیری۔ ان تینوں کی شکلیں مختلف تھیں جیسے ہم سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر پھر بھی یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی شخص تین بن کر کھڑا ہو۔ ان کے کپڑے اور بچے طبقے کے دیہاتیوں کے سے تھے اور جوتوں پر گرد کی تہیں جی تھیں جیسے وہ میلوں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے ہوں۔ اسی لمحے کی خاطر — سوکتے راوی کی دلدل میں اترتے سورج کو دیکھنے۔ اور اب وہ گہرے انہماک سے، شرمک پر آتی جاتی بھاری ہلکی سواریوں اور انسانوں سے بے خبر اس سرخ ہوتی دلدل پر نگاہیں جماتے

نٹھے میں بھی پل بھر کو ان کے قریب رک گیا۔

اب سورج چھپ چکا تھا اور زمین سے مٹے آسمان پر گہری سرخی پھیلی تھی۔ ایک دم ان نینوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا اور پھر ان کے سر جھک گئے۔ پھر خاموش ہی وہ شہر کی دوسری سمت مضافات کو لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا بیٹھیں مٹھلی قدموں سے لوٹا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے شہر میں جاگتی رات کی آوازوں نے چر لکایا۔ اب پھلتی رات کے نیلے دھوئیں میں تیاں ٹٹانے لگی تھیں اور مجھے یاد آیا کہ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ چنانچہ میں تیز نیز قدم اٹھانے لگا۔

لگے روز جب میں سوکتے راوی کے پل پر سے گزرا تو ابھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر تھی۔ سورج کو دیکھ کر مجھے ان نینوں کا خیال آگیا اور میں بغیر ارادہ کے جھنگلے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ بلدی گھر پہنچنا ہے۔ مٹا ڈیڑھ سی میں کھڑا ریوڑوں کا انتظار کر رہا ہو گا اور ذکیہ سینا کے لیے تیار ہو گی۔ پھر بھی میں لمحہ بھر کو وہاں رک گیا۔ غروب کا وقت قریب ہی تھا۔ اگلے دن مجھے رات بھر ہی خیال ستاتا رہا تھا کہ وہاں رہا کی دلدل اور سورج کے تانے میں کیا تھا کہ وہ نینوں اس اٹناک سے اسے دیکھتے تھے۔

اب روشنی مدھم پڑ رہی تھی اور سورج کا تاریخی دکھتا تھا۔ زمیں کی طرف اتر رہا تھا۔ مگر میں غروب کے وقت دیہات کی سمت تین شخص آتے دکھائی دیے۔ ایک سے قدر ایک سی چال اور لباس جب قریب پہنچے

تو وہی اگلے دن دوائے شخص تھے۔ وہ پھر چپ چاپ آکر جنگل کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور اسی امناک سے رُہتے سورج کو دیکھنے لگے۔ ان نے ان کی طرف دیکھا۔ تینوں کی آنکھیں کوسلے کی طرح دکتی تھیں۔ اور ان کو سنے کی طرح دکتی آنکھوں میں ایک سی اداس چپ بھری تھی۔ اب پھر مجھے حیرت ہوئی کہ مختلف خدو خال رکھنے کے باوجود یہ تینوں ایک سے کیوں لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص خاصا سمر تھا اور اس کا چہرہ گھنی سفید ڈاڑھی میں چھپا تھا۔ دوسرے کا رنگ اپنے دونوں ساتھیوں کی نسبت صاف تھا اور ڈرتے سورج کی سرخ روشنی میں کندن کی طرح دکھاتا تھا۔ اس کے بال جھال کی صورت گردن پر پڑے تھے اور ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا۔ تیسرا پہلے دونوں کی نسبت سیاہ فام تھا اور بے حد چوٹی ناک رکھتا تھا۔ میں انہیں غور سے دیکھتا رہا اور اسی اثنا میں سورج ڈوب گیا پھر ان تینوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا اور پھر اپنے راستے پر لوٹ گئے۔

اس رات میرا جی کسی کام میں نہ لگا اور میں بچپن یا کہ آخر میں لے ان سے پوچھا کیوں نہ کہ وہ سو کھتے راوی کی دلدل میں اترتے سورج میں کیا ڈھونڈنے آئے ہیں۔ میں نے ذکیہ سے ان تینوں کا تذکرہ کیا مگر ذکیہ ہنس کر خاموش ہو رہی۔ یونہی کوئی دریا قی شہر کی سیر کو آئے ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ ذکیہ غلط بھی نہیں کہتی۔ جب تک کوئی ان تینوں کو دیکھے نہیں ان کے اسرار کا احساس نہیں کر سکتا۔ اگلے روز تمام دن

مجھے شام کا انتظار رہا۔ غروب آفتاب کے وقت میں جھگے پر کھڑا ان کی راہ دیکھنے لگا۔ عین روشنی کے ڈھلنے وہ تینوں اسی طرح ایک سی چال سلتے جھگے پر ان رکے اور آتی جاتی سوار یوں اور انسانوں کے شور سے بے خبر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے کے عمل میں وہ یوں محو ہوتے تھے کہ اس کے درمیان ان سے بات کرنا بالکل ناممکن لگتا تھا۔ چنانچہ میں سورج کے پوری طرح ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا اور سوچا کہ جب یہ تینوں اپنے راستے پر مڑیں گے تب میں ان کا پیچھا کروں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور ڈوبتے سورج اور سوکھتے دریا کی دلدل اور شام کے لمحے میں کیا ڈھونڈتے ہو؟ جب سورج پورے کا پورا ڈوب گیا تو ان تینوں نے پھر گنگا اور اسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ اور میں اس بات کا منتظر ہوا کہ اب یہ اپنی راہ لیں اور میں ان کے پیچھے ہوں۔ مگر وہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہیں اپنی راہ پر لوٹنے کی بجائے وہ شہر کی سڑک پر ہو لیے ان کی جوتیوں پر گزرنے والی تھیں اور ان کے قدم ساتھ ساتھ اٹھتے تھے آخر میں سمجھ گیا کہ ان سے مخاطب ہوا اور میں نے پوچھا:

”بھائیو! تم کس گاؤں سے آتے ہو؟“
چپٹی ناک والے نے گھوم کر مجھے دیکھا اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”دباں پل پر کیا دیکھتے ہو؟ اب ان کے اسرار سے میری پوچھل ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں، سارے جسم میں پچھلا سیدھا

اتر رہا ہے اور میں ابھی پندرہ کے لڑکے ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ قہقہوں میرے اس سڑل پر بھی نقش دیوار کی مانند خاموش رہے۔ اب کہ میں نے چلا کر ان سے بات کی اور میری آواز بھر اگئی اور آنکھیں جلتے پانی سے بھیک گئیں۔

”اس سورج کو کیوں دیکھتے ہو؟ میں نے اُن کے قدم کے ساتھ قدم ملائی کو شش کی کیونکہ اب وہ نہایت تیزی سے چلنے لگے تھے۔ وہ قہقہوں میرے اس سوال پر بھی خاموش رہے۔ اب شہر کی ٹرک قریب تھی اور سواروں کی ریل پیل تھی۔ مصروف رات کی آوازیں بہت قریب آگئی تھیں اور سہا میں جانے اکثر برکی خنکی تھی۔ کہیں سے پھیلی کی مہک لہریں کرائی تھی اور ہم محمول چونکی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک ستر شخص نے جس کی بال بوت کی طرح سفید چمکے تھے کہا:

”کیا تم نے نہیں دیکھا؟ کیا اس شہر کے کسی شخص نے دیکھا؟“

”کیا؟ کیا نہیں دیکھا؟“

”جب سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکا ہے؟“ ستر شخص نے چادر کی بال ٹھیک کرتے ہوئے کہا:

”سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکا ہے! وہ تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ بلکہ نہیں دیکھتے کیونکہ سورج روز ہی ڈوبتا ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا کہ مبادا وہ شخص پھر خاموش ہو جائے۔

”ہم جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے ہم آئے ہیں۔ یہ پھیلی بستی بھی ستر شخص نے مشرق کی طرف اشارہ کیا اور سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔

”ہاں جہاں سے ہم آئے ہیں۔“ چوٹی ناک والے نے کہا۔

”کہاں سے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔“

اس پر درمیان کے شخص نے میری طرف ٹرکے دیکھا۔ اس کے ساتھ
پرچٹ کا نشان پہلے سے بھی گہرا نظر آ رہا تھا۔

”ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ سورج روز
چڑھتا ڈوبتا ہے اس لیے ہم نہیں دیکھتے۔ اسی لیے جب ادھر اس نے
ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا، سورج ڈوبنے پر سرخی لبو کی طرح گہری جڑے
لگی تو ہمیں خبر تک نہ ہوئی اور پھر — وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے اس
کا گماندہ گیا ہو۔“

یہ سرخی بستی بستی پھیلتی ہے۔ ایسی سرخی میں نے کبھی میں نے اپنی زندگی
میں نہ دیکھی تھی۔ نہ ہی میرے بزرگوں نے اور نہ ہی ان کے بزرگوں نے کبھی اپنے
بزرگوں سے کوئی ایسی بات سنی تھی۔ اس سے پہلے کا پتہ نہیں۔“

اس پر میں نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دریا پر چلتے آسمان کو
دیکھا۔ اندھیرا خوب سا گہرا ہو چکا تھا اور ٹرکوں کی زرد دتیاں ٹٹماتی تھیں مجھے
اپنے ساتھیوں کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ سوائے ان کے سفید سفید
کپڑوں یا پھر ان کے دھندلے پیروں کے جب وہ کسی بجلی کے کھمبے تلے گزرتے
تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ اس اندھیرے میں بھی آسمان کا وہ ٹکڑا
آگ کی طرح دھلکتا تھا۔

”ہاں واقعی — ہم نے نہیں دیکھا۔ میں نے جیرانی چھپانے کی کوشش

کی۔

”اب تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

”ہم لمبے نہیں شہر کو جا رہے ہیں۔ بعد میں آ لے گا کیا فائدہ۔“

میرا جی چاہا ان لوگوں کے ساتھ رہوں۔ انہیں اپنے گھر لے چلوں۔

مگر وہ اچانک ہی دوسری سڑک پر ٹر گئے اور مجھے یاد آ گیا کہ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ مٹاڈیوٹریسی میں ریلوڑیوں کے انتظار میں کھڑا ہو گا اور ذکیہ انتظار کرنے کرتے بیزار ہو چکی ہوگی۔

اس سے اگلے روز میں سوکھتے راوی پر رکا اور سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہا۔ پورے کا پورا سورج چھپ گیا مگر ان تینوں کا آج کوئی چٹانہ تھا۔ پہلے میں بیسپینی سے ان کا منتظر رہا۔ مگر پھر ڈوبتے سورج کی صفائی میں غور کیا آسمان پر گویا لہو کی چادر تنی تھی۔ پھر اچانک اس لہو کی چادر کے سامنے تنہا کھڑے کھڑے مجھے خوف آنے لگا۔ اپنے پیچھے — بالکل پیچھے — شالوں کی ہڈیوں کے درمیان مجھے کسی کے وجود کا احساس ہوتا۔ کوئی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا — مگر غلط ہے — میں نے دیکھ دیکھا ہی کب وہ میں اپنے پیچھے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ نہیں دیکھ سکتا اور میرے پیچھے کوئی موجود ہے۔ میرے اندر رہا شاید مجھ سے الگ۔

سواریاں اپنے راستے پر چلی جاتی تھیں۔ تیاں جل چکی تھیں۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اور پھیلتی رات میں آسمان کا وہ ٹکڑا لہو کی چادر بنا دیتا

تھا اور اس کی آپخ دود دور کے اندھیروں تک پہنچتی تھی۔ خوف زدہ ہو کر میں گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچے ہی میں نے ذکیہ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ وہ میرے وہم پر ہنس دی۔ مگر میں اسے چھت پہلے گیا۔ رات کی تاریکی میں بھی وہ سرنخی چمک رہی تھی۔ ذکیہ کچھ خاموش سی ہو گئی، پھر بولی:

”کوئی آندھی آئی ہوگی۔“

اگلے روز میں دفتر میں فائل پر جھکا تھا کہ عجیب اللہ نے حفظ احمد سے

کہا:

”یہ آج کل سورج چھپنے پر دیکھا ہے آسمان کیسا سرخ رہتا ہے۔ اندھیرے میں بھی باقاعدہ سرخ رہتا ہے۔“

اس پر مجھے یوں لگا جیسے میں اکیلا اس چادر خون کے سامنے کھڑا ہوں اور اسے خوف کے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور شام قریب آئی گئی میرے دل میں عجیب دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ میں سو کھتے رادھی اور پل ادا آسمان اور سورج سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ ان کا خوف میرے اندر پھیل رہا تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ آسمان کے لبو اور زمین کی دلدل اور ان تینوں شخصوں کی کشش بھی مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا میں اپنے ساتھیوں سے ان تینوں دیہاتیوں کا تذکرہ کروں کہ اس ہر رنگ شام کی آمد کے ساتھ ساتھ تین دیہاتی بھی جو مختلف صورتوں کے باوصف ایک سے تھے، اس شہر میں اترے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے یہ سرنخی دکھائی تھی اور دکھا کر خود ایک شکر پر گھوم گئے اور شہر

کی بیڑ میں کم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی بستی بستی اس لہورنگ شام کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ میں نے انہیں شہر میں بیت ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام و نشان نہیں۔

مگر عجیب اللہ اور حنیف احمد دونوں مجھ سے بات کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ عرصہ ہوا ان دونوں نے مجھ سے دس بیس روپے قرض لیے تھے جو انہوں نے لوٹائے تھے اور اب وہ مجھ سے پُر خاش رکھتے تھے۔

چنانچہ میں خاموش رہا اور گھر لوٹتے ہوئے جب پل پر پہنچا تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور ڈوبتے سورج کی طرف سے آنکھیں پھیریں اور شہر کی طرح کو بغور دیکھتا رہا۔ مگر پھر بھی وہ لہورنگ شام میرے ساتھ ساتھ چلتی — آگے بچھے پھیلتی — سانس لیتی جھکتی پل آتی تھی۔ میرے سامنے پھیلتے شام کے پھیکے اندھیرے میں کجلائے آسمان پر سیاہ پردوں کی ٹولیاں آٹھ کے بند سے کی خشکی میں اڑتی جاتی تھیں۔ ان کی طرح میں بھی اپنے ٹھکانے کو مٹ رہا تھا — ٹھکانا کہ جواب محفوظ نہ رہا تھا کیونکہ لہورنگ شام اس کی کھڑکیوں، دروازوں، ٹھوس دیواروں میں سے بہہ کر اسے اپنے آپ سے بھر رہی تھی۔

ابیں رات گئے تک شہر میں گھومتا، ہر قسم کی دکان میں جھانکتا کہ شاید کہیں وہ گرد آلود جوتیوں اور سفید چادریوں کی بُنگلوں میں چھپے سیاق نظر آجائیں اور میں ان سے پوچھ پاؤں کہ یہ سرخی کہاں سے آتی ہے اور اس کے آنے کے بعد کیا آتا ہے، تم پہلی بستی کیوں چھوڑ آئے۔ اور اب

وہ کس حال میں ہے؟ مگر مصروف تیز رفتار کلیل کلیل کرتے شہر میں کیسے ان کا نام و نشان نہ تھا اور اہل شہر تجارت میں کمال تہنک تھے۔

مگر کچھ ہی دنوں میں شہر میں شام کے وقت میں نے کچھ آدمیوں کو مغرب پر پھیلی سرخی کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ معلوم نہیں یہ سرخی کی اطلاع چند ہی دن میں کیوں کہ آج کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی ہیں نے تو سوائے ذکیہ کے اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر سب نے اس کو چٹکاں آسمان کو کیوں کر دیکھ لیا؟ اس پر مجھے خیال آیا کہ وہ دریا کی یقیناً شہر میں موجود ہیں۔

اب ہر جگہ اس سرخی کے چھپے چھپے چودھری صاحب میرے پرانے واقف کاروں میں سے ہیں اور رنگ کے چٹنگ میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ شام گئے ان کے یہاں دوست احباب کی صحبت رہا کرتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے میں سودا ہاں جانا ترک کر رکھا تھا۔ کچھ دنوں سے مراد یہی کہ جب وہ تینوں شخص مجھے ملے تھے اور اب تینوں کے غائب ہو جانے پر ایک عجیب اضطراب مجھ پر حاوی ہوا تھا۔ کیا گھر اور کیا باہر۔ گھر میں میری چاہتا باہر جاؤں اور باہر آکر سوچتا نہیں گھر زیادہ محفوظ تھا۔ پھر میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر پاتا کہ مجھے کہاں ہونا چاہیے اور ایک بوچھل پن میرے جی پر آن پڑتا۔

اس شام میں یونہی، پرانے وقتوں کی طرح، چودھری صاحب کی دکان پر جانا نکلا۔ کچھ پرانے کچھ نئے لوگ جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چودھری

صاحب ہوئے:

”کیوں بھائی، تمہارا کیا خیال ہے؟ کہتے ہیں یہ سب اٹھی تجربات کا اثر ہے۔ سنا ہے اب دنیا کے سرد حصے گرم اور گرم سرد ہو جائیں گے، رُتوں کا سلسلہ بھی بدل جائے گا!“

اس وقت میں نے پھر سوچا کہ ان تین درہائیوں کی واردات ان کو مناؤں، مگر اتنے بھوم میں بات کرنے کو میرا جی نہ چاہا اور میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر اخبار دیکھنے ہی لگا تھا کہ اس شوم گھڑی کا نزول ہوا۔ اچانک ایک تیز، ناخوشگوار سی ہبک کہیں سے آئی۔ ایسی ہبک میں نے آج تک کبھی نہ سونگھی تھی۔ اس ہبک کے آتے ہی میرا دل اندر ہی اندر ڈھینے لگا اور معلوم نہیں جسم کے کسی حصے میں جڑا گہرا مگر مٹھا میٹھا سادرو اٹھا۔ دراصل میں آخری وقت تک فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ ہبک تھی یا درد۔ اس کی ناخوشگواہی سے گھبرا کر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

”کیا بات ہے، کہاں چل دیے؟“ چودھری صاحب نے جبران ہو

کر پوچھا۔

”جارا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیسی ہبک ہے۔ میں نے گہری گہری

سانسیں لے کر کہا۔

”ہبک — ہبک کیسی؟“ چودھری صاحب نے ہوا میں سونگھ

کر کہا۔

اور میں ان سے بات کیے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ راستہ بھرا سڑکیں
غریب ناخوشگوار درد اور دہشت بھری مہک کی لہریں آتی جاتی رہیں اور
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چکر اکر گر جاؤں گا اور چکر اکر گرنے سے پہلے
کے نیلے نیلے اندھیرے میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ جب میں گھر
پہنچا تو ذکیہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔

”کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا، چہرے پر کیسی زردی ہے؟“
”ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مہک معلوم نہیں کیسی ہے۔“ میں
نے ماتھے کا پسینہ اونچھا حالانکہ وہ نو میر کا پسینہ تھا۔

ذکیہ نے ہوا میں سونگھ کر کہا: ”یہ ٹپوس میں جا لے دن لات کیا معجون بنتے
رہتے ہیں۔ سلیم صاحب کے بیٹاں اسی کی بو ہے اور پھر آج ہنڈیا بھی لگ
گئی تھی۔“

”مگر یہ تو ہر جگہ ہے۔۔۔ ہر ٹرک پر۔۔۔ تمام شہر میں۔“

”موسم جو بدلا ہے۔ سردی کے پھول تپوں کی مہک ہو گئی۔“

ذکیہ نے بے دھیانی سے کہا اور سلامتی پران کے خانے ڈالنے لگی
پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ہوا میں سونگھا تو یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ مہک باقی
ہے یا نہیں۔ شاید وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے ختم ہونے پر مجھے بید خوشی
ہوئی مگر پھر بھی اس کی یاد میرے اندر باقی تھی جیسے چوٹ کے بعد سوزش
رہ جائے، اور اس خیال سے مجھے پکپک آگئی کہ شاید وہ مہک لوٹ آئے مگر
دفتر کے کام کاج میں میں اس سادھے کو بھول گیا۔ آج میرے سامنے ناکوں

کا ڈھیر لگا تھا۔ عجیب اللہ اور حفیظ احمد بڑے ندر شور سے کسی فلم پر بحث کر رہے تھے اور کاغذات کا مضبوط میرے ذہن سے پھسل پھسل ہاتا تھا۔ تنگ آکر میں نے گھنٹی لکٹن دیا یا اور چیر اسی کو ہاتھ سیدٹ چائے کا آرڈر دیا اور جیب سے سکرٹ کی ڈبیا نکالی مگر عین اسی وقت مجھے ایک شدید جھٹکا لگا جیسے میں کسی بے انتہا اونچائی سے گر گیا ہوں۔ ایک تیز چکر کے ساتھ نیلے پیلے اندھیرے میرے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے سر کو دلوں ہاتھوں سے تھاما اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ دراصل وہ درد اور دہشت بھری مہک پھر لہر دو لہر کہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے دیوانہ وار کھڑکیاں بند کرنا شروع کیا۔ عجیب اللہ اور حفیظ احمد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”بھئی، دھوپ آ لے دو۔ بند کیوں کرتے ہو؟“ حفیظ احمد نے اپنے مخصوص پچھتے پچھتے لہجے میں کہا۔

”یہ مہک — تمہیں آ رہی کیا — کس قدر ناممکن برداشت ہے۔“

عجیب اللہ اور حفیظ احمد لے ہو ایسے ناک اوجھتی کر کے سونگھا اور پھر حفیظ احمد نے قدمے تامل سے کہا:

”ہاں یار۔ یہ کیسی بو ہے۔ یا شاید خوشبو۔ اس سے تو دل خراب ہو لے لگتا ہے۔“

اس روز میں نے شہر میں کچھ اور لوگوں کو بھی اس مہک کا تذکرہ کرتے سنا، جس کی لہریں آتی تھیں اور پھر ختم باقی تھیں، پھر آتی تھیں اور ختم باقی تھیں۔ مگر شام کو غروب آفتاب کے وقت ان میں تیزی اور شدت

آتی جاتی۔ یہاں تک کہ چند ہفتوں میں اس مہک یا بو کا یہ عالم ہو گیا کہ اکثر مجھے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اب اس شہر کے دیکتے پہرے ان لہروں پر ایک دم زرد پڑ جاتے۔ اکثر لوگوں کو گرائی اور خفقان کا آثار رہنے لگا اور ڈاکٹر دل کا کاروبار خوب چمکا۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایٹمی تجربات سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اثرات ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مہک بھی انہی تجربات کا اثر ہے اور اسی باعث لوگوں کے اعصاب کی حالت نازک ہو گئی ہے چنانچہ سب سے پہلے کانوں کے اعصاب ٹھکنے لگے۔ در کہنے کی دعائیں ختم ہونا شروع ہوئیں یہ بھی نہ تھا کہ دعائیں کم مقدار میں آتی ہوں مگر اہل شہر میں اس دعا کی ذخیرہ اندوزی کا عجب جنون پھیل چکا تھا کہ چند ہی دن میں نیند کی گولیاں بھی گورہ نایاب ہو گئیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دونوں دواؤں کو بے سود پایا۔ در و دہشت بھری مہک کی وہ لہر اس اپنی کاٹ میں تلوار سے زیادہ تیز تھیں اور آدمی کے اندر اتر جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کروں کہ اس تلوار کی کاٹ کاٹھی مہک سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس سے مانوس ہو جائیے، اسے اپنا شامہ جانیے۔ دواؤں سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ مگر ایک عجیب بے دلی کے ہاتھوں میں خاموش رہا گو کچھ عرصے بعد ہی خود بخود یہی طریق کار سب نے اختیار کیا۔

اس تہک نے شہر میں دہشت کو عام کر دیا تھا۔ گو کوئی بھی بظاہر دہشت کو تسلیم نہ کرتا تھا مگر سب ہر لمحے کسی ان جانے والے حادثے کے خوف سے سستے تھے

اور یہ سہم کچھ بے جا بھی نہ تھا کہ چند ہی منفتوں بعد آخر وہ حادثہ رونما ہوا۔ وہ وسط دسمبر کی ایک شام تھی۔ میں چودھری صاحب کی دکان سے اٹھ کر گھر کی جانب آرہا تھا۔ ہر طرف سواریوں اور انسانوں کی بیل بیل تھی۔ دکانیں جگ جگ گم کرتی تھیں اور اہل شہر بظاہر زندگی کے عھیلوں میں مصروف تھے۔ اس دہشت درد بھری مہک کی لہریں کبھی کبھی کاٹ کر گزر جاتیں۔ میرا سر چکرا جاتا۔ میں رُک جاتا اور پھر لہر کے گزرنے کے بعد چلنے لگتا۔ اب تمام اہل شہر کا یہی دستور ہو گیا تھا گو وہ خود اس کا علم نہ رکھتے تھے۔ کوئی باہر سے آنے والا انہیں دیکھتا تو حیران ہوتا کہ آخر یہ چلنے پھرتے، کام کرتے کرتے ان آدمیوں کو کیا ہوتا ہے کہ اچانک رُک جاتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، سانس روک لیتے ہیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر مصروف ہو جاتے ہیں۔ ماں، اب یہی سہم سب کا معمول تھا۔ وسط دسمبر کی اس شام میں بیل کے قریب تھا کہ اچانک میرے سر پر ایک برچی لگی۔ چکر اکر میں نے بجلی کے کھمبے کا سہارا لیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھاما۔ مگر برچی تو کہیں بھی نہ تھی، اور نہ ہی برچی مارنے والا کوئی ہاتھ۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہ برچی ہمیں اسی مہک کی نہایت شدید۔ ناقابل برداشت حد تک شدید۔ لہر تھی۔ خوف نے مجھے بخیر کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کو یا مہک (معلوم نہیں وہ کیا تھی) کا سرچشمہ کہیں میرے قریب، بہت قریب پہنچ گیا ہو۔ میرے شانوں کی بڈیوں کے درمیان۔ گردن کے قریب۔ میرے سینے پہنچے۔ کہیں مجھ سے اتنا قریب کہ مجھ سے الگ بھی نہ ہو۔

مگر اچانک میری نظر سامنے آنے والی ایک عجیب و غریب سواری پر جا
 رکی۔ وہ ایک بہت بڑا گڈا تھا جسے دو سفید بیل کھینچ رہے تھے۔ بیلوں کی
 آنکھوں پر سیاہ کھوپڑے چڑھے تھے اور ناگوں میں مڑے ہوئے روٹھے اور سفید جلد
 تلے ان کی پسلیاں اور کولہوں کی ہڈیاں سانس لیتی تھیں اور رسوں جیسے تختوں
 سے سانس کی گرم بھاپ۔ گڈے کے چاروں طرف ٹکڑی کا جھگڑا سا بنا تھا۔
 اور اس کے اندر سیاہ پردے تنے تھے۔ دراصل وہ پردے بھی نہ تھے جیسے
 ملتی لہریں کھاتی اندھیرے کی دیواریں۔ سامنے تھوڑی سی جگہ خالی تھی اور سیاہ
 پردے سے باہر دو گاڑی بان، بیٹھے بڑیوں بھرے اندھے بیلوں کو رہائستہ
 تھے۔ ان گاڑی بانوں کی شکلیں اندھیرے کی وجہ سے میں نہ دیکھ سکا اور
 پھر سیاہ کپڑوں پر انھوں نے طلسمی چادر دوں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں کہ ان
 کے آدھے آدھے پیرے چھپ گئے تھے۔ ان کے سر جھکے تھے جیسے لمبی
 مسافت کے بعد نیند کا غلبہ ہو۔ ان کی پشت پر وہ سیاہ پردہ (یاد دلوار)
 ہوئے ہوئے ملتا تھا اور سیاہ پردے (یاد دلوار) کے اندر اندھیرا بھرا تھا اور اس
 گھپ اندھیرے کے گرد سیاہ پردے تنے تھے اور ان پردوں میں سے درد
 دہشت بھری جہاک کی وہ لہریں اٹھتی تھیں جن کی کاٹ تلوار سے بڑھ کر تیز
 تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی میرے قریب سے گزر گئی اور میں چکر کر کے
 میں اتر کر قے کرنے لگا۔

مجھے معلوم نہیں اہل شہر نے اس شام اس گاڑی کو دیکھا یا نہیں، اور
 جو دیکھا تو ان پر کیا گزری۔ میں مشکل گھر پہنچا اور جا رہا ہی پر گریا۔ نہ کیسے لے مجھ سے

بہت پوچھا مگر ایک کندہشت لے میری زبان بند کر رکھی تھی۔
 چند روز بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ شہر کی میونسپلٹی انتہائی غیر
 ذمہ دار ہوتی جا رہی ہے۔ کوڑے کرکٹ بھری گاڑیوں کو سر شام شہر کی اہم
 سڑکوں سے نہیں گزرنے دیا ہے۔ اس سے فضا متعفن ہوتی ہے اور اہل شہر
 کو بدمعاشی کا خطرہ۔

میں نے دفتر سے ہفتے بھر کی چھٹی لی تھی اور ان سات دنوں میں شہر کی
 کیفیت خود نہ دیکھ سکا۔ مگر اخبار سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب غریب
 گاڑی سیاہ پردوں میں، غالباً کوڑا کرکٹ بھرے، شہر کی مختلف سڑکوں سے
 گزرتی ہے، جس کے گاڑی بان خوابیدہ ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی مضائقہ سے
 ہوتی شہر سے گزرتی ہے اور پھر میونسپلٹی سے مطالبے کہ اس قسم کی ناخوشگوار
 گاڑیوں کا شہر میں ورود بند کیا جائے یا ان کے لیے کم آبادر منہ مقرر کیا جائے
 دفتر ذخیرہ۔

ساتویں روز میں گھر سے نکلا۔ ان سات دنوں میں اہل شہر کس قدر بول
 چکے تھے۔ چاروں سمت زرد زرد بے خواب چہرے جل چہرے تھے، جو
 بے فکر اور لاپرواہ نظر آنے کی کوشش میں بڑے درد بھرے انداز میں ہنسنے
 ہو گئے تھے۔ (اور مجھے یاد آ رہا کہ آج صبح آئیے میں میرا چہرہ بھی ایسا ہی تھا،
 شہر میں ایسا ایک تفویجی تقریبات بکثرت ہو لے لگی تھیں اور اہل شہر جو
 درجہ ان تقریبات میں جاتے تھے، بلکہ وقت سے بہت پہلے دروازوں
 پر منتظر رہتے تھے اور وہی پرانے چہرے پہلے سے زیادہ زرد اور

مضمکہ خیز نظر آتے تھے۔

دفتر میں میں نے خالکوں کی طرف توجہ کرنے کی کوشش کی مگر بار بار میری آنکھوں کے سامنے وہ گاڑی آجاتی تھی۔ میونسپلٹی کے گڑے اس صورت کے تو نہ کبھی تھے۔ اس کے نیم خوابیدہ گاڑی بان، آنکھوں بندھے، ہڈیوں بھرے بیل اور سیاہ پردوں کے اندر بھرا اندھیرا اور اس کی درد و ہشت بھری مہک جس نے اہل شہر کو تنگی میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے چہروں کا رنگ پوڑ لیا تھا اور ان کی آنکھوں کی چمک دھوٹالی تھی۔ وہ پردوں ڈھکا اندھیرا بار بار میرے سامنے آئے جاتا تھا۔ کسی چیز کی باس ایسی ہر سکتی تھی، بعض اور خوشبو کا مرکب؟

اپنا مک ایک پاگل خواہش سے میرا گلا رک گیا میں نے تصور میں دیکھا کہ میں اندھا دھند اس گاڑی کی جانب بھاٹکا جاتا ہوں اور بانہ سے اس کا پردہ ہٹاتا ہوں۔ اندر دیکھتا ہوں۔ اندر کیا ہے۔ اس بعض اور خوشبو کی اصل دیکھنے کی خواہش نے پاگل پن کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ اس لیے آج پھر غیر رادی طور پر میرے پاؤں رادی کے بیل پر دھیسے پڑ گئے۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ دیر تھی اور درد و ہشت بھری مہک کی لہریں ہولے ہولے تیز ہو رہی تھیں۔ جنگلے کے ساتھ لگ کر ایک عجیب خوف نے مجھے گھیرا دیا کی دلدل بانہیں پیسارے مجھے بلارہی تھی۔ تہ دار۔ نکل جانے الی دلدل۔ اور مجھے خدشہ ہوا کہ مبادا میں اس میں کود جاؤں اور اس میں اترتے سورج کے ساتھ ہند بوجاؤں اور ہمیشہ کے لیے اس جلاور

خون میں دفن کر دیا جاؤں۔ مجھے یوں لگا کچھ میرے قریب آ رہا ہے یا میں خود کسی چیز کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ وہ جس کا مجھے — نہیں ہم سب کو — ہم سے پہلوں اور ہم سے بعد کے آلے والوں کو انتظار ہے اور میرا جسم پتھرا رہا ہے مگر اس پل اور دلدل اور سورج سے نجات نہیں وہ میرے اندر ہیں اور میرے ساتھ۔ میں نے بے بس ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اچانک میرا دل رک گیا۔

تین شیشیہیں ایک سی پال میں چادروں کی لٹل مارے چلی آتی تھیں۔ میں پتھرائی آنکھوں سے مضائقہ کی سمت انھیں دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ لوگ قریب آن رکے۔ آج مہتمم شخص کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہ رہے تھے اور اس کی سفید ڈاڑھی ان سے زرخیز۔ باقی دونوں کی آنکھیں جھکی تھیں اور دانت بھنچے تھے اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ "تم اتنے روز کہاں غائب رہے۔ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے بتاؤ یہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔" میں نے لڑکھرائی زبان میں ٹوٹتے سانسوں کے درمیان کہا۔

"ہم انتظار کر رہے تھے ہم اپنے آپ کو روک رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو باندھ رکھا تھا یہ دیکھو۔"

مہتمم شخص اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی بانہیں میرے سامنے پھیلائیں اور اپنے شانے اور پشتیں جن پر دوسروں کے نشان کندہ تھے۔ "ہم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے۔" مہتمم شخص کی آواز عجیبوں میں ڈوب

گئی۔

”مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ — تو دوسرے کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ایک دم وہ پیٹ پکڑ کے دوہرا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی شدید کرب میں جھک گئے۔ اس دکھ دہشت بھری جھک کی شدید لہریں گزر رہی تھیں؛ ہمیں کاٹتی ہوئی، ہمارے اندر جذب ہوئی، ہمیں چرتی ہوئی۔

”وہ دیکھو! معمر شخص نے اچانک دیہات کی طرف اشارہ کیا اور پھر تینوں کے چہرے موت کی نزدیکی میں سن گئے۔ میں نے دیکھا گرداڑا قیام راہ پر سیاہ گاڑی کا بیولا بھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں موٹے رستے اور سیاہ کپڑوں، ٹلگنی چادرؤں کی بکلوں میں چہرہ چھپائے نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کاٹنی چوستی دکھ دہشت بھری جھک کی بعد وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے سیاہ پردے — ایک لرزش مجھے سرسپاؤں تک روند گئی۔ تینوں دیہاتیوں کی آنکھوں سے چمک، نصرت ہو گئی جیسے وہ موت کے قریب ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی اور اس کی کاٹنی جھک ہمارا لہو چوس رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آگئی، یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بانوں کے چہرے چادرؤں میں چھپے تھے اور سیاہ پردے (یا دلواریں) مدھم ہوا میں ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔

اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انہوں نے ہمدرد اُٹھا دیا۔ ان کے سر پردے میں چھپ گئے مگر پردہ اُٹھنے کے

باوجود نہ اٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت زدہ غیر انسانی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔

”تم نے کیا دیکھا؟ تم نے کیا دیکھا؟ میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ بھٹی بھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔

”بولو — بولو —“ میں نے ان کی منت کی۔ مگر وہ بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔

”مجھے بتاؤ۔“ مجھے بتاؤ۔“ بالآخر میں نے عمر شخص کی چادر پکڑ لی۔ اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چپک جلی تھی۔

وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔

میں چکا کر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں کو اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی، پھر وہ بھی مٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا۔ مہینوں میں نے ان تینوں کو ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام نشان نہیں۔ اسی دن سے گاڑی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی، پل سے ہو کر کچے میں اتر جاتی ہے اور مصافحات کا رخ کرتی ہے۔ اہل شہر اس دکھ دہشت بھری ہبک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کا نتیجہ نہیں مر گئیں۔ بھولی بھری کہانی کی طرح — مگر میں اب بھی انہیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر بولتا ہے،

آبِ تمھاری باری ہے — اب تم دیکھو گے۔“
 اور راج میں اس پل پر آن کھڑا ہوا ہوں، اس سواری کے منتظر میں۔

سو میرا:

راستہ

گھٹیا چائے خانے کا ریڈیو فرمائشی پروگرام سن رہا تھا، وہ بھی ایسے زور شور سے کہ تاک کی آواز کا جاو دو دور دُور تک چھایا جا رہا تھا۔ جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت اُداس ہے۔ تنہا ہے اور اسے کوئی گلے سے نہیں لگاتا۔ اس نے دل ہی دل میں تاک کے گلے ہوئے بول دہرائے ”مجھے گلے سے لگا لو بہت اُداس ہوں میں۔“

اس نے کبھی کبھی نظروں سے چائے پینے والوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی جانے کی ایک پیالی کے دام ادا کر کے لوہے کی سیاہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے کے سینا ہاؤس سے آخری شو شروع ہونے کی گھنٹی کی آواز سے بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ سڑک کے اُس پار کھڑے کھڑے اس نے ایک لمبے کو ذرا دلچسپی سے اس طرف دیکھا۔ وہ لوگ جو تیسرے درجے کے ٹکٹ نہ خرید سکے تھے، ان میں قیامت کی نفسا نفسی تھی اور جنہیں ٹکٹ مل گیا تھا وہ سینا ہال کے دروازے پر جیسے جلا بول رہے تھے۔

اُس نے بڑی احتیاط سے پڑا لے مفلر کو کانوں پر لپیٹ لیا اور لٹسے بازار سے خریدے ہوئے اوور کوٹ کی میسرین میں ہاتھ چھپا کر ابستہ ابستہ فٹ پاتھ

پر پہننے لگا۔

یہ راتوں کو بارہ بارہ بجنے تک کی آوارہ گردی جیسے اس کا نصیب ہی چکی تھی۔ ان راتوں میں چاہے کھر پڑ رہی ہو، چلے چھا جوں بارش ہو رہی ہو، یا مارے گرمی کے سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا ہو، وہ یونہی بے مقصد ٹٹلتا اور سو جاتا۔ اُن اُن گنت راتوں میں جب وہ ٹٹل ٹٹل کر تھک جاتا تو جلنے لگتی بارانی ناکامیوں اور حسرتوں پر چپکے چپکے رویا۔ محرومیوں کے احساس نے اُسے تڑپایا۔ یہیں ان سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس نے اپنے مستقبل کو سنوارنے کے منصوبے بنائے۔ انہی سنسان راتوں میں اس نے تھک کی طرح بندوکانوں کے شکاریوں کو دیکھا۔ ٹنگے ہوئے خوبصورت کپڑوں کو اپنے جسم پر سجایا، ساریئل میں لپٹی ہوئی معصوم حسین عورتوں کو اپنے سینے سے لگایا۔ عورتوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کہ کیا زبان اور دماغ بے وفا کی کی علامتیں ہیں۔ اور یہیں اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے اپنے حساب بہت بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ دنیا کے بے پناہ حسن کا اندازہ لگایا۔ یہیں اس نے جنگ اور امن کے مسائل پر غور کیا اور انہی سڑکوں پر جان فنی سے بھر پور ایک رات میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ ایک دن تو وہ گھنٹوں یہ سوچ کر غصے اور خطرے سے لرز رہا تھا کہ پڑوسی ملک اُس کے وطن کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے۔ اسے اپنے پڑوسی ملک کی بھڑاتی ہراسوس ہوا تھا۔ کیا وہ ملک ویرانہ ہے؟ وہاں لوگ نہیں بستے؟ وہاں حسن جنم نہیں لیتا؟ جس ملک میں عورت پسندیا لگاتی ہیں اُس کے پاؤں میں کھجور بھتا ہو، اور جہاں لگکا جتنا بہتی ہو، وہ جنگ کی بانیں کیسے کرتا ہے؟ اس نے سمجھ لیا

تھا کہ اگر اس کے ملک پر ذرا سی بھی آغ آئی تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ مگر وہ اس سو کر کن فضا میں زہر نہ پھیلنے دے گا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے لاغر جسم میں جانے کہاں کی طاقت آگئی کہ وہ سینہ تان کر بڑی دیر تک ایفٹ رائٹ کے انداز میں چلتا رہا۔

وہ اپنے امکان بھر کبھی سر شام گھر نہیں گیا۔ تنہا، ویران دو کمروں کا گھر اسے کھانے کو دوڑنا۔ گھر کے راستے پر ہی اسے اپنی مرحومہ ماں یاد آنے لگتی۔ اس کی بیوہ ماں نے محنت مشقت کر کے اسے تعلیم دلائی تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے سوچا کہ ساتھ ساتھ اپنی اس تھکی باری ماں کو ایک دن سونے کے تخت پر بٹھا دے گا، مگر جب وہ ایم اے کا امتحان دینے والا تھا تو اس کی ماں ایسی تھکیں کہ سونے کے تخت کا بھی انتظار نہ کیا اور لٹوئی ہوئی کھاپ پر لیٹ کر ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔

گھر کی تنہائیوں میں اسے بچہ یاد آتی۔ اس نے اسے فیمل ہوتے دیکھ کر محبت اور ملگنی دونوں سے مزہ موڑ لیا اور شاندار مستقبل والے سے شادی رچا کر رخصت ہو گئی۔ پھر وہ ایم اے نہ کر سکا۔ بچہ کی بے وفائی نے اس کے مستقبل پر ایسی لات ماری کہ نفرت کے باوجود اسے کمر کی قبول کرنی پڑی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے وفائی کا ڈکھ دنیا کے سارے دکھوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ رات سوتے میں بھی بچہ اس کے سینے پر دم دم کہے اسے روندتی رہتی اور وہ ماسے اذیت کے پھر نہ سو پاتا۔ ان لمحوں میں اس نے کئی بار سوچا تھا کہ قانون میں قتل کی سزا پھانسی ہے مگر یہ بے وفائی کا جرم کسی قید بند میں نہیں آتا! یہ بھی مزے کی بات ہے کہ سر توڑنا تو جرم ہے مگر دل توڑنا جرم

نہیں! اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو ضرور ایسا قانون بناتا کہ دل کوٹھنے والوں کو بیچ چرائے
پھانسی دے دی جاتی۔ پھر وہ اپنی اس اُٹھ پٹانگ سوچ بچار پر خود ہی بے بسی
سے ہنسنے لگتا، اگر وہ وزیر قانون ہوتا تو پھر بے وفائی کا دکھ ہی کیوں سہتا۔
بجائے کہ بھولنے اور خود کو سبیلانے کے لیے اس نے بڑی ہما بھی سے زندگی گزارنی
چاہی اس نے کتنی ہی بار عورت کو خریدنا مگر اسے کتنی خوشی نصیب نہ ہوئی اس
نے ہر بار سوچا کہ عورت کو خریدنے کے لیے چاہے سب کچھ خرچ کر دو مگر کھاٹے
کے سوکھے کچرے بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس کا گھر تو اور بھی دیران ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جلد
ہی اس چکر سے نکل گیا مگر کسی کو اپنا بناتے اور محبت کرتے بھی ڈرتا۔ بجائے اس
کی زندگی سے اعتماد چھین لیا تھا۔

جنوری کی اس انتہائی سرد رات میں وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک چکا تھا۔ آج اس
کے سارے جذبات اس کے گلے آگے تھے۔ آج اس نے اپنی تنہائی اور اداسی
پر دل ہی دل میں خوب ماتم کیا تھا اور اس طرح اس کے دل کا بار چھٹ گیا تھا۔
اب وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا اور گھونچ کر جلدی سے سو جانا چاہتا
تھا مگر مدد کی بڑی اور بھونٹی دکانیں، دیر سونی، بند ہو چکی تھیں مگر بڑی دکانوں
کے شوکیس اسی طرح بقیعہ ٹوڑنے ہوئے تھے اور چوکیدار موٹی موٹی لاشیاں
پکڑے کھانس کھانس کر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں کہیں اتکاؤ کا
راہ گیر جاتا ہوا نظر آ جاتا۔ ہاں کالوں کے لیسنے رات تھی، نہ سردی۔ جانے وہ
کہاں سے آئیں اور رزق سے غائب ہو جاتیں۔ کہہ کی اس چادر کے اُس پار
کالوں کی پھیلی تیلیاں دُور تک جگنو کی طرح چمکتی رہتیں۔

اب کمر کچھ زیادہ ہی پڑنے لگی تھی۔ سڑکوں پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے لمبوں کی روشنی جیسے سردی میں ٹھنکراؤ بھی پکڑ گئی تھی، وہ اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے بڑی تیزی سے میکلڈ ریڈو کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فلکوں کے آخری شو ختم ہو چکے تھے۔ تانگے، ٹیکسیاں، اور رکشائیں حرکت میں اپکی تھیں۔ کھوکھوں میں بیٹھے ہوئے پان بیٹری، سگریٹ بیچنے والے اونگھتے اونگھتے چونک پڑے تھے۔ اس نے ایک لمحے کو رگ کر تانگوں اور ٹیکسیوں کی طرف بے تحاشا دیکھتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا۔

کئی تانگے کھا ٹھم سواریاں بھرے قطار کے ساتھ اس تیزی سے اس کے پاس سے گزرے کہ اسے اپنی مڑ مڑاں یاد آ گئیں۔ اگر وہ زندہ ہوتیں اور وہ جا کر اپنے بال بال بچنے کا حال سناتا تو وہ ضرور صدقہ دیتیں۔

اب وہ سینا گھروں کو اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ تانگوں اور ٹیکسیوں کا دھاوا بھی ختم ہو چلا تھا۔ اس نے اب اطمینان سے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ گھراب تھوڑی دُور رہ گیا تھا۔

”بائے تم کو ابھی تک کوئی تانگہ نہیں ملا۔ انتظار کر کے تھک گئی۔ پیچھے سے آکر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، سیاہ نقاب سے ایک چاند کا ٹکڑا جھانک رہا تھا۔ وہ اس وقت بجلی کے کھمبے سے دُور تھا۔ وہاں اندھیرا تھا مگر وہ چہرہ کسی روشنی کا محتاج نہ تھا۔ عورت نے بڑی اپنایت اور محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔ تانگہ نہیں ملا تو نہ سی، ٹیکسی کر لو، گھر میں سب پریشان ہوں گے کہ

دیر کیوں ہو گئی، تم بھی اتنی دیر سے سوؤ گے تو صبح کام پر کس طرح جاؤ گے؟
 وہ مارے بوکھلاہٹ کے کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر عورت کا بڑھا ہوا ہاتھ ہانے
 کیسے اس کے ہاتھ میں آگیا۔ نرم ہاتھ مارے ٹھنڈ کے برف کا ٹکڑا ہو رہا تھا اس
 نے کچھ بھی سوچنے کی کوشش نہ کی۔ اسے تو اس وقت صرف ایک خیال تھا کہ
 کسی طرح اس ہاتھ کو اپنی حفاظت میں لے کر گرم کر دے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا
 کہ عورت سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔ وہ اس کے لیے ایک محبت کو لے
 ولے شوہر کی طرح بے چین ہو گیا۔ اسے اس وقت یہ خیال ہی نہ رہا کہ عورت اس
 کی کچھ بھی نہیں لگتی اس کھڑپے کی اندھیری رات نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا
 ہے۔ وہ شوہر کے دھوکے میں اسے اپنا سمجھ بیٹھی ہے۔

”تم کو سردی لگ رہی ہے، بس ابھی تا لنگریا ٹیکسی مل جائے گی۔“ اس نے
 دھیرے سے جواب دیا اور جب رُک کر دیکھا تو اُن کے پیچھے ایک سپاہی کھڑا ان
 دونوں کو تنگ رہا تھا۔ آپ کیسے کھڑے ہیں سنسٹری جی؟ اس نے فوراً غصے
 سے پُرجھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ اس بیچاری عورت کو اکیلا دیکھ کر آگے ہوں گے۔
 ”سیال جی، اس زمانے میں عورت کو اکیلا چھوڑ کر بٹے بھی نہیں، فلم دیکھنے کو
 غنڈے بھی آجاتے ہیں اور ہر عورت کو آوارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ دُور تا لنگر مل
 جائے گا۔“ سپاہی اپنی لاشی کھمکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

”تم نے اس کا منہ ہی نہ توڑ دیا۔ یہ کون ہوتا ہے نہیں نصیحتیں کرنے والا میں
 نے تو لڑائی کے ڈر سے کہا نہیں۔ جیسے ہی تم تا لنگر لینے گئے، یہ آکر میرے پیچھے
 منڈلنے لگا۔ پھر میں تمہارے پیچھے بھاگی اور اب دیکھو کیا چپکے سے آکر پیچھے کھڑا

ہو گیا۔ ماسے غصے کے عورت کی آواز بھرا رہی تھی۔

”پتلو صاف کر دو، غلطی تو میری ہے، تم کو چھوڑ کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“
اس کی آواز میں واقعی ندامت تھی۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جب وہ اندھیرے سے گزرا
کہ بجلی کے کھمبے کے پاس آیا تو اس نے شعوری طور پر اپنا منہ دوسری طرف پھیر
لیا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ یہ سترت سے بھرپور
لحے کہیں اتنی جلدی ختم نہ ہو جائیں۔

اس نے کئی مرتبہ چار نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی خوبصورت
تھی۔ اس کی ترستی ہوئی سیاہ زندگی پر اچانک چاند کا ایک ٹکڑا گر پڑا تھا۔
اس نے ایک لمحے کو رک کر منہ سے اس طرح اپنا چہرہ چھپا لیا کہ صرف آنکھیں
کھل رہی جائیں۔ اس کا لباس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان اڑتے ہوئے لمحوں کو
پکڑنے کے لیے خود کو کسی طرح عورت کے شوہر کے روپ میں ڈھال لے۔
ایک عمر بیت جائے مگر وہ اسے نہ پہچان سکے۔ اسے یہ سب کچھ کتنا خوبصورت
لگ رہا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ گھما کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بڑی پیاری
نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ گھبرا گیا، مگر وہ سکرا
رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر جیسے پھول کھل رہے تھے اور جگہ جگہ اندھیرے
میں اس کی آنکھیں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔
”تم تمہیں تو نہیں؟ اس نے پوچھا۔“

”میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی ٹھکی ہوں۔“ عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس نکتے منے کنول کو اپنی ٹھکی میں دبایا مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاؤں باؤس ہے۔ یہیں سے تو بجلی کی بہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے قیہ سدا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھٹی گھٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سناٹے میں عورت کو سینے سے لگلے مگر اس نے اپنے اس ہذبے پر فوراً ہی قابو پایا۔ وہ اتنی معصوم محبت کرنے والی اور خوبصورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے گا۔ وہ ایسی پھر حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی مگر عجب سے دبائے لگی۔

اس لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کونند گیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی ویسی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی، جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکر اکر رہ گیا۔ اب کے اس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا، اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخباروں میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لیے اس نے مہارا

ڈھونڈا ہوا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر؟ عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔
 ”اے! وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی۔ میں چاہتی ہوں کہ اب تم
 کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کر لو۔ نہ خاضر و جاگ گیا ہو گا سلیم، وہ میرے
 لیے دور رہا ہو گا۔ ہائے وہ روز نا ہوا بھی بڑا پیارا لگتا ہے، لگتا ہے نا؟ بالکل تمہاری
 طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔ عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 اچھا تو سلیم ہے اس کا نام! پہنچاؤ اس غریب کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ
 اسے کیا کہے۔ کون سا نام دے۔ بھرم؟ اس نام سے اس کے گلے میں ہرک سی
 اُٹھی۔ مگر یہ بھمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ بھمہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں بھیلنے کے خیال
 سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی یہ
 بھمہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے
 اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہو گا اور اب واپسی پر کتنا
 پریشان ہو گا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس
 کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو وہ اسے چھین لے
 جائے گا۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دوسرے سینا ہاؤس میں
 ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔“

”ہوں! عورت نے کہوئے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اٹھانے
 لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے پہلے کبھی تھکی ہوں۔“ عورت نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اس نئے منے کنول کو اپنی گھٹلی میں دبایا مگر جلد ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہاتھ نہیں بجلی کا پاؤں ہاؤس ہے۔ یہیں سے تو بجلی کی لہریں پھوٹتی ہیں۔ اسی ہاتھ کے دم سے تو یہ سدا شہر روشن ہے۔

اس نے ایک گھٹی گھٹی سی سانس بھری۔ اس کا کیسا جی چاہ رہا تھا کہ اس سناٹے میں عورت کو سینے سے لگائے مگر اس نے اپنے اس جذبے پر فوراً ہی قابو پایا۔ وہ اتنی معصوم، محبت کرنے والی اور خوبصورت عورت کی غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے گا۔ وہ ایسی لچر حرکت کبھی نہ کرے گا۔ اس نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس کے سخت مردانہ ہاتھ کو بڑی مگر عجز سے دبائے لگی۔

اس لمحے کو اس کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال کونند گیا کہ کہیں یہ کوئی ایسی دلی عورت تو نہیں۔ کہیں اسے بے وقوف تو نہیں بنا رہی جانے اسے کہاں لے جائے، کیا عورت کبھی اپنے شوہر کو پہچاننے میں بھی غلطی کر سکتی ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کو چکر کر رہ گیا۔ اب اس نے خور سے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ کس اعتماد اور معصومیت سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ پھر بھی اس کا دل صاف نہ ہوا، اس عورت ذات کا کیا اعتبار۔ اس نے خالص مردانہ انداز سے سوچا۔ آئے دن اخباروں میں کیسے کیسے واقعات آتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ محض پولیس سے بچنے کے لیے اس نے سہارا

ڈھونڈا ہوا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو آخر یہ صورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اچانک سوال کیا۔
 ”اے! وہ جیسے کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑی۔ میں چاہتی ہوں کہ اب تم
 کسی طرح بھی کوئی سواری کا انتظام کر لو۔ تختہ ضرور جاگ گیا ہو گا سلیم، وہ میرے
 لیے رہا ہو گا۔ ہائے وہ رونا ہوا بھی بڑا پیارا لگتا ہے، لگتا ہے نا، بالکل تھاری
 طرح ہے۔ ایسی ہی اس کی عادتیں بھی ہوں گی۔“ عورت نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 اچھا تو سلیم ہے اس کا نام اچھا ہے اس غریب کو دھوکا ہوا ہے۔ مگر وہ
 اسے کیا کہے، کون سا نام دے۔ بچہ؟ اس نام سے اس کے گلے میں ہرک سی
 اٹھی۔ مگر یہ بچہ کیسے ہو سکتی ہے۔ بچہ تو پیدل چلنے اور مصیبتیں بھیلنے کے خیال
 سے ڈر کر اسے چھوڑ گئی۔ یہ تو اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے نہیں تھکتی یہ
 بچہ کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ اسے اپنا شوہر سمجھ کر کس پیار سے باتیں کر رہی ہے
 اس کا شوہر سواری کی تلاش میں شاید آگے نکل گیا ہو گا اور اب واپسی پر کتنا
 پریشان ہو گا۔ کس طرح اسے تلاش کر رہا ہو گا۔ اس خیال کے آنے ہی اس
 کے دل پر چوٹ سی لگی کہ اگر اس کا شوہر راستے میں مل گیا تو وہ اسے چھین لے
 جائے گا۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بس آگے جا کر کوئی سواری مل جائے گی۔ شاید دوسرے سینما ہاؤس میں
 ابھی فلم نہ ختم ہوئی ہو۔“

”ہوں عورت نے کھوئے ہوئے لیجے میں کہا اور تیزی سے قدم اٹھانے
 لگی۔ راستہ بڑی خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

”کتنی سردی ہو رہی ہے آس نے خاموشی سے اُکٹا کر کہا:

”ہوں! عورت جانے کیا سوچ رہی تھی۔ آس نے صرف ایک بار آس کا ہاتھ محنت سے دبایا اور پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب اس خدوت سے کُہر پڑ رہی تھی کہ سامنے تھوڑے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس کا کوٹ اور منظر دونوں ہی نم ہو رہے تھے۔ مگر اسے ذرا بھی سردی نہ لگ رہی تھی۔ اسی کا قریبی چادر ہا تھا کہ یہ کُہر پڑتی رات کبھی نہ ختم ہو۔ قدرت نے یہ رات صرف اس کے لیے بنائی ہو۔

”تم کیا سوچ رہی ہو؟ آس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، میں سوچ رہی ہوں کہ تنہا رہا ہو گا مگر سلیم، آج کتنی مدت بعد تمہارے ساتھ باہر آنا نصیب ہوا ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے تو تمہارے ساتھ نکلنے کا خیال میں سستا کر ہی رہ جاتا ہے۔ سب کی مرضی کا لحاظ کر کے جیسے دم گھٹ گیا۔“ عورت نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ٹھیک کہتی ہو، میرا دم خود گھٹا رہتا ہے۔“ اس نے جلدی سے ہاں میں ہاں ملائی۔

”وہ دیکھو تانگہ“۔ عورت نے رُک کر سامنے اشارہ کیا۔

اس نے تانگے والے کو آواز دی۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ کچھ کبیل میں لپٹا شاید اونگھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی تو تانگہ ان کے قریب آ کر رُک گیا اور وہ دونوں پھیلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

”کہاں چلنا ہے بالو جی؟“ تانگے والے نے پوچھا۔

اس نے بدکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہاں جانا ہے؟ کس گلی؟ کس محلے؟ یہ چاند کا کمرٹم کس گھر میں اترے گا؟ اسے تو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔

”کیا سوچنے لگے؟ مانگے دے کر جواب تو دو۔ ریمان پورے چلو یا با۔ یہ تمہاری ہر وقت کے سوچنے کی عادت نہیں جاتی۔“ عورت ہولے سے منہی۔

”جیسی وہیں سوچ رہا تھا کہ نکٹھا اگر اٹھ گیا تو ضرور سو رہا ہوگا۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”ہاں امیرا! تجھے سو رہا ہوگا۔ لعنت ہے ایسے فلم دیکھنے پر۔“ عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔

رات، سناٹا اور پختہ شہر پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اسے محسوس ہو رہا تھا کہ عورت اب آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ٹاپیں بجھاتے ہوئے لمبوں کے رُوپ ہیں اسے بُری طرح بلے سپین کر رہی تھیں۔

اس نے گھبرا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اب وہ مسلسل اسے دیکھتا ہے۔ وہ اس صورت کا نقشہ اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتا تھا۔ ”کیا سوچ رہے تھے؟“ عورت بڑے اعدانہ سے گردن موڑے کھوئی کھوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ بھی نہیں؟“ اس نے نظریں جھکا لیں۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ اس سے کچھ کہے بھی نہیں سکتا تھا اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح تو وقت سے پہلے ہی بچاؤ ناجائز۔

”سلیم۔“ عورت نے جیسے خواب میں اسے پکارا۔

”ہاں! اس نے مفطر اچھی طرح پٹیتے ہوئے جواب دیا۔

”اماں یہ نہیں اور ہمارا کھٹڑا فادہ بھتیا، سب جاگ کر انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں ان بیچاروں کو کیا پتہ کہ تانگہ نہیں مل رہا تھا اور تنہا بھی ضرور اٹھ گیا ہوگا۔ تم کو نہ پا کر رو رہا ہوگا۔ اس نے اس طرح نلتے کا ذکر کیا کہ واقعی اس کا دل پڑی محبت سے پھٹنے لگا۔ اسے تو اس وقت یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ وہ کسی کا باپ نہیں۔

”ہاں رو رہا ہوگا“ عورت نے اس طرح اسٹکیوں، بند کر لیں جیسے گہری نیند سو گئی ہو اس کے چہرے پر عجیب سی آسیبی کیفیت طاری تھی۔ اس کی گردن اب بھی اسی انداز سے اس کی جانب مڑی ہوئی تھی۔

اب وہ اسے جی بھر کے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ خطرہ نہ تھا کہ یوں دیکھنے پر وہ پہچان لے گی۔

مرل گھوڑا جیسے رنگ رہا تھا۔ تانگہ والے نے اُسے دو چار چابکیں سید کیں اور پھر کیل میں ہاتھ چھپا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے عاجز آ گیا ہو۔ طرک پر داخل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی راگیر نظر نہ آتا تھا۔ سردی اس غضب کی ہری تھی جیسے آج ہو کے پھر کبھی نہ ہوگی مگر وہ سردی اور سنٹے سب سے بے نیاز ہو کر عورت کو تکے جا رہا تھا۔

”سیلم“ عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ ”تم بتاؤ کہ اگر میرا بھائی اپنی ماں بیٹوں کا بار نہیں اٹھاتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سب بھوکے مرتے ہیں تو میر

جائیں ہیں تھاری کمانی کا ایک دھیلا بھی ان کو نہ دوں گی، اگر تمھارے پاس بہت دولت ہوتی تو شاید میری وجہ سے ان کو سنبھال لیتے مگر اتنا ہے ہی نہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں کا پاراٹھنا پھر اتنے بہت سے بیمار اور بھوکے لوگ بھر گئے ہیں اس گھر میں۔ پتہ نہیں میں ان سب کے ساتھ کیسے رہتی ہوں جی نہیں چاہتا کہ یہ سب مر جائیں۔ اپنیوں کی محبت اندھی ہوتی ہے نا؟ اس نے اپنا چہرہ بازو میں چھپا لیا اور ایک ہلکی سی سسکی بھری۔

”سفر تو اس نے بے چین ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عورت کے دکھوں کی پہل صراط سے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا اور جب وہ اس دھارِ طور راستے پر کٹ کر گرنے لگا تھا تو عورت نے اپنا سر اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گود میں ڈال کر مسکرائے لگی۔ وہ کٹھرنے کی آواز سے اٹھ کر خود بھی ہنس پڑا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اسے کتنی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

”دنیا میں اتنی بہت سی عجوبیاں کیوں ہوتی ہیں سلیم؟“ پھر رنجیدہ ہونے لگی۔ ”بس ہوتی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر مارے بدردی کے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ تم یہ سب مت سوچو کہ بگلی۔“ ”سوچنا تو پڑتا ہے، اگر اللہ میاں نے انسان کو داغ نہ دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”مگر اس وقت تو نہ سوچو۔ اس نے محنت کا سراپے بازو پر ٹکایا تو اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

”تا نگہ اب مزنگ چو نگ کی کمر چو رہا ہے سے گزر رہا تھا چو رہا ہے کے ساتھ دلی
دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ملازم لڑکے کو کاکرلا کی نمالی بڑکیں سیٹ رہے تھے۔
”ارے کیا مزنگ چو نگ آگئی۔“ عورت نے جیسے چونک کر دکانوں کی طرف
دیکھتے ہوئے پوچھا:

”ہاں! اُس نے بڑے دُکھ سے برا ب دیا اور پھر عورت کی طرف دیکھا
جو سٹنے کمر میں جالے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اس کی
گود میں پڑا تھا۔

مزنگ بھی اب پیچھے رہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اب دروازہ پر بعد صبحان
پلورہ آجائے گا۔ اس کی خوبصورت محبت کرنے والی بیوی اس سے چھٹ جائے
گی۔ اس کا پیارا ننھا جو بالکل اس کا سا ہے، اُسے کبھی اتنا نہ کہہ سکے گا۔ سب
کچھ چھٹ جائے گا۔ کاش وقت ختم جائے۔ کتنا اچھا ہو تا کہ سائنس دان کئی
ایسی ایجاد بھی کرتے جس سے بھاگتے ہوئے لٹوں کو پکڑا جاسکتا۔

”یہ گھوڑا اتنی زور سے دوڑ رہا ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔“ اس کی آواز
میں خوف تھا۔

”ہاں آہستہ چلاؤ، کہیں تمہارا گھوڑا پھسل نہ جائے۔“ اسے بھی اچانک
احساس ہوا کہ گھوڑا تیز چل رہا ہے۔

”بابو جی، یہ تو اپنی زندگی میں کبھی تیز چلا ہی نہیں، چاہے کھال نکال لو اس
کی اوسا پ کہہ رہے ہیں کہ تیز چل رہا ہے۔“ تا نگے والا جیسے ان کی سمجھ پر فورا
سے ہنسا۔

”لنگے والے کی ہنسی پر وہ شرمندہ ہو گیا۔ گھوڑا تو واقعی بے حد بہتہ چل رہا تھا۔ پھر بھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ گھوڑا اور بہتہ چلے، بلکہ چل ہی نہ سکے۔ اس اتھالی سردی میں اس کے پاؤں مثل جوجائیں اور پھر ساری رات ساری زندگی وہ عورت کا ہاتھ تمام کر سڑک کے کنارے بیٹھا رہے۔

”سیلم میں سوچتی ہوں کہ —“ وہ چپ ہو گئی۔

”یہی ناکہ اب ننھے کو چھوڑ کر تفریح کرنے کسی نہ نکلوں گی، بس ابھی گھر آیا جاتا ہے۔“ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

”جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسے کسی نہ چھوڑوں۔“ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری اور پھر قریب سڑک کر اپنا سر اُس کے سینے پر ٹیک دیا۔ ”مجھے چھپا لو، گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔“ وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔ ”وہاں تو درجن بھر جان کے دشمن سر پر دو دن لاتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس بیٹھنے کو تو ایک منٹ بھی نہیں ملتا، مجھ سے تو تمہارے متعلق سوچا بھی نہیں جاتا۔“ وہ اپنا سر اس کے سینے پر رگڑنے لگی۔

”اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو پا کر بھی کھو دیا۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔ وہ اور بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس وقت جذبات کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ صرف ایک بار عورت کو اپنے سینے سے لگانے کی خواہش میں مرا جا رہا تھا مگر وہ صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اسے عورت میں ایسا تقدس اور معصومیت نظر آرہی تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا

کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔

اب تانگو رحمان پورے کی ٹرک پر بیٹھا تھا۔ دُور دُور لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب اسے چمکے پھوڑوں کی طرح ٹپکتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اب سب کچھ چھین جانے کا احساس اُسے بُری طرح مستارہا تھا۔ جانے کس گلی میں، کس گھر میں اس کی بیوی اور اس کا بیٹا اس سے جدا ہو کر ہمیشہ کے لیے اُسے تڑپتا پھوڑا بن جائیں گے۔

اس نے سوچا کہ وہ تانگو سے اُترتے ہی عورت کو خود بتا دے گا کہ رات کی تاریکی نے اُسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے وہ اس کا شوہر نہیں۔ کیا فائدہ کہ وہ خود ہی اُسے پہچان لے اور جانے کیا سمجھے۔ بے لہان، ذلیل، مگر اُس نے ذلیل پن کی تو کوئی حرکت نہیں کی، وہ اسے بتا دے گا کہ وہ اس قدر پیاری ہے کہ اس نے صرف تصویر میں اسے اپنا بنالیا تھا اور سوجھا گنا۔ نہیں ہے۔ خواب دیکھنا کینگی نہیں ہے۔

اسے اپنا ضمیر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس نے جو سب سے اُٹھا ہوا تھا اس کے سر پر سے اُٹھالیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اب اس نے جینے سے ہاتھ اُٹھالیا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور مارے کرکے کسمس لے لگا۔ ”کیا بات ہے سلیم؟“ اُس نے بے تابی سے اس کے کٹ کا کارکھینچا۔ ”کچھ بھی نہیں!“ اُس نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ سوچ

رہا تھا کہ کیا کبھی وہ اس عورت کو بھول سکے گا!

”سلیم میرے پاس اور ٹرک جاؤ۔“ اُس نے پھر اس کے شانے پر سر

رکھ دیا۔

”میں تمہارے پاس ہی تو ہوں۔“ اس نے اس طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ دو سال کی بچی ہو۔

تاناگہ اب دھماں پورے کی ایک گلی میں مڑ گیا تھا۔ چیمپوں کی کٹھڑی بٹ اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر کئی آوارہ کتے سلنے آکر بھونکنے لگے تھے۔ گلی بالکل تاریک تھی اور یہاں کبہر کی چادراور بھی موٹی ہو گئی تھی۔

”آرے تم نے تو بتایا ہی نہیں تاناگہ آگے نکل جاتا۔“ اُس نے بُر قے کے اوپری حصے کو ٹھیک سے اوڑھ لیا۔ ”بس یہاں روک لو۔ آگے گلی میں تمہارا تانگہ نہ جا سکے گا۔“

تاناگہ ٹکے ہی وہ اتر گئی۔ مگر وہ اپنی سیٹ پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ اسے گزسے ہوئے وقت کا یہ انجام بڑا ہی المناک معلوم ہو رہا تھا۔

”اُتر دنا۔“ عورت نے کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ کٹھ پتلی کی طرح نیچے آگیا اور تانگے والے کو کراہ دینے کے لیے بڑی تلاش کرنے لگا۔

جب تانگے والا تانگہ موڑ کر چلا گیا تو اُسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ بھلا وہ اُترا ہی کیوں تھا، اسے تو اسی تانگے سے واپس چلا جانا چاہیے تھا۔

وہ بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے اس طرح چل رہی تھی جیسے رینگ رہی ہو۔ گلی کے موڑ پر وہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھی رک کر اس کا منہ سینکے لگی۔

”نیں۔۔۔ نہیں۔“ میں کتنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”یہی ناکہ تم میرے شوہر نہیں ہو۔ ابھی کچھ دیر اور نہ کہتے تو اچھا ہوتا، کچھ وقت اور کٹ جاتا۔“ وہ جیسے کنوئیں میں سے بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”شاید تم کو میرے اس طرح چھپانے پر افسوس ہوا مگر میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی، تم کو حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ بہر حال میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ بات یہ تھی کہ۔۔۔ وہ کہتے کہتے ٹرک گیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا، اُس نے عورت پر بھرپور نظر ڈالی۔“ منجھے کو میری طرف سے پیار کرنا۔۔۔ اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

نہٹا، جو بالکل تمھارے جیسا تھا، جو رستے میں پیدا ہوا اور میرے اس گلی میں آنے کے بعد مر گیا۔ عورت سسک کر رو پڑی۔ ”اب کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو، بھاگ جاؤ۔“ اس نے اپنا برقع کھسوٹ کر نعل میں دبایا۔ اب اتنے بہت بھوکے تمھاری جان کو روٹیں گے۔ میں خالی ہاتھ گھر جا رہی ہوں۔ اُس نے جلتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے دوسری گلی میں مڑ گئی۔ مگر وہ دکھا اور حیرت کے طے جلے جذبات کے بوجھ تلے دبا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سناٹے میں عورت کے جوتوں کی اٹیڑیوں کی کھٹ کھٹ اور سسکیوں کی آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتے ہوئے جانے کہاں کھو گئی۔ اب اسے اچانک اپنے ٹٹ جانے کا احساس ہوا اور وہ پاگلوں کی طرح گلی میں دوڑا نگہاب وہاں خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ اور ان کی کھڑکیوں سے اندھیرا پھوٹ رہا تھا۔ کہیں روشنی کی ایک

سر پہی نظر نہ آئی۔ اس کو جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں کے ایک ایک دروازے کو پیٹ کر اس کو پتہ پڑ جائے۔ اس کی تلاش میں نگر نگر ڈھنڈھوٹا پیٹے۔

اور جب وہ دُکھوں کے بوجھ سے نڈھال ہو کر واپس ہوتا تھا تو گلی کے دروازے میں ایک ننھی سی کفنائی ہوئی لاش تیر رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا ٹرک پر آگیا جہاں کنارے کھڑا بڑا مانگے والا بھی ہوئی تیزیوں میں تیل ڈال رہا تھا۔ وہ اچانک کر مانگے پر بیٹھ گیا۔

آب کہاں چلنا ہے بابو! مانگے والا ایک آفکے پیچ کر بیٹھا۔
 ”میکلو ڈروٹو“ اُس نے دھیرے سے جواب دیا اور جب اپنے ٹھنڈے
 ہونے چہرے کو اُس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ روز رہا
 تھا۔



نقد و ش

— ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(اعترافات)

پادری روزنار بولے گناہ گار جاہن سے
 کہا "تم تو اعترافِ گناہ کے لیے میرے
 پاس آئے تھے، مگر تم نے ڈنگلیں مارنا
 شروع کر دیں....."

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایک
 دن مجھے گناہگار کی صورت کھڑا ہونا پڑے گا اور اپنے وہ گناہ قبول کرنے پڑیں
 گے۔ جو کہ میں نے نہیں کیے۔ کیا اگر کیے ہیں تو اس لیے کہ مجھے فن کی سند حاصل
 ہے جو ایک طرح سے راضی و راضی کی معافی سے جو سنگین سے سنگین قتل میں بھی
 سرکاری گواہ کو میسر ہوتی ہے.....

باپ روزنار تو امیں ایک سیدھا سادا، سلالی اور قانون پرست شہری
 تھا۔ اپنے پڑھنے والوں سے پیار، ان سے راز کرتا تھا۔ انھیں چرتا پاتا
 تھا۔ حالانکہ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ سب کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور اگر
 کہیں ان کو پیر تسنم پاکی طرح سے اپنے اور پر سوار ہوتے دیکھتا تو جھٹک

بھی دیتا۔ میں ایک طرح کا جینز (JOHN JENZ) تھا جو پتا ہر دکھ سکھ اپنے پلاٹیرو (PLATERO) کو بتاتا ہے، جو ایک بڑا بڑا اور معصوم سا گدھ ہے اور جینز کی بدولت اب تک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ اس گدھے کو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں، کیونکہ اپنی خدمات کے عوض وہ جینز کو نوبل پرائز بھی دلوا چکا ہے۔

گدھے کے ذکر کا براہ امت مائے، خادروں اور بوا آپ تو جانتے ہیں، مغرب میں گدھے کو اتنا بڑا جانور نہیں سمجھا جاتا جتنا کہ ہم اسے اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ پھر آپ نوگوار کے رہنے والے ہیں اور اب ہندوستانی ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے، گدھے کی یہ قوفی ایک اسطوری بات (MYTH) نہیں جو ہم اور آپ ہی نے مل کر بنائی ہے، گدھے میں کچھ خوریاں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی غریبی تو یہ ہے کہ — وہ بوجھاٹھا ہے۔ ڈنڈا کھانے پر فقط رفتار کو تھوڑا تیز کر دیتا ہے۔ مگر شکایت کا حرف تک زبان پر نہیں لاتا، جو ایک کامیاب زندگی کا راز ہے اور جس کی تلقین ہمارے روحانی پیشوا کب سے کرتے آئے ہیں اور ہمارے نینا اب تک کرتے ہیں آپ کا خیال ہے، باب روزارو! کیا میری بوجھل تحریر پڑھ کر میرے قاری مجھے مارنے دوڑتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ایسا ہوتا تو میں روز صبح ان کو ٹانگے میں پان والے کی دکان اور دن کو کسی فلم اسٹوڈیو میں مل جاتا اور شام کو کہیں اسپتال میں اپنی پسلیاں گنتا۔ وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ مجھے سمجھ گئے ہیں اور میں ان کا راز پا گیا ہوں۔ قصہ مختصر، انھیں مجھے اور

مجھے انہیں بے وقوف سمجھنے کی پوری آزادی تھی، جواب، ان حالات میں نہیں ہے جیکو میں — جاہلی — گناہ اقبال — صاف کیجیے — اقبال گناہ کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور سر جیسے گرجھٹے میں پڑا ہے۔ اگر میں بے باک طریقے سے اعتراف گناہ کرتا ہوں تو آپ کو وہ میری ٹانگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور اگر وہی زبان سے ماننا ہوں تو حقیقت مونا لزا کی مہم سی مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے.... عجیب مصیبت ہے نا؟

فادر روزار لیر! اعتراف گناہ کا مسئلہ میرے نزدیک بہت نازک ہے میں ایک ایماندار آدمی ہوں اس لیے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ چاہے خدا ضرر ناظر ہو یا نہ ہو میرا تختہ مقدس کتاب پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہو کہ نہ جیسے گا کہ میں خدا کو نہیں ماننا یا کسی مقدس کتاب پر ایمان نہیں لاتا خدا پر ایمان نہ لانا تو اپنے آپ پر ایمان نہ لانے کے برابر ہے، فادر! کیونکہ بنانا اپنا آپ ہی خدا ہے اور کتاب بھی میری ہی طرح کے ایک انسان نے اپنے ارفع لمحوں میں لکھی ہے۔ میں ایسا ہی کافر ہوتا تو اس اعتراف کے سلسلے میں آپ جو خدا کے نمائندے ہیں، کے پاس ہی کیوں آتا؟ آپ بے جبر ہوتے ہیں؟ — یہ تو فرنگ نہیں ہے۔ ہیرکیف، میں کتنا چاہتا ہوں کہ گناہ پہلے ہو تا ہے اور اعتراف بعد میں۔ لیکن میں اپنا کیا کروں؟ میں ان گناہگاروں کی قبیل میں سے ہوں جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے اعتراف کو اہمیت نہ دے یا ان کی طرف دیکھتا نہ ہو تو

چھپکے سے ایک طرف جا کر کہانی لکھ رہے ہیں۔

پہلے میں اپنی کہانی کے کرداروں اور اس کے تانے بانے کو اپنے دوستوں پرماڑتا ہوں۔ باب روزار پوچھا مگر ساتھ ہی یہ صریح جھوٹ بول دیتا ہوں کہ میں اسے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس جھوٹ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی حرام الدہرا سے چڑھائیں پاتا اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی کہانی کے اثر کا پتا چل جاتا ہے۔ اگر وہ بہت ہی متاثر معلوم ہوں اور خوب ہی سر دھنیں تو میں اس کہانی کو سرے سے لکھتا ہی نہیں۔ ہاں، ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ فائدہ جسے چھوٹے ہی ہر شخص خیر سمجھ جائے۔ اگر ان کے چہروں پر نا سنجی کے نقوش دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آ جاتا ہے کہ میاں، اب بات بنی۔ جب میں اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی جوتی بھی بے حد کامیاب ہے۔ کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی جو کہ سرے نزدیک فن کی معرفت ہے دیکھیے تو، دنیا بھر کا آرٹ، کیا ناول اور کیا مقصودی اور کیا تعمیر سب کا دھڑ جا رہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پر دہائی نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں نہ سمجھی کے الزام سے ٹوڑتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کر لے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہ اٹھتا ہوں۔ بالکل، میرا بھی یہی مطلب تھا۔ مگر افسوس، ذہانت کے اس دیران آباد ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟..... دراصل کہانی

ہر ایک کے لیے ملکی ہی نہیں جاتی۔ یارو، میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی..... جیو.....

کیا میں پھر ٹشکیں مار رہا ہوں قادر؟

اں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اعتراف پہلے کرتا ہوں اور گناہ بعد میں۔
اعتراف پہلے ہونا گناہ لیکن ایک بات طے ہے کہ اعتراف و گناہ دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں اور بیکار ہی آپس میں الجھتے بستے ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ سے ہا کر بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن دونوں برابر اپنی ہٹ پر قائم بستے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی ہی کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک آدمی کسی مرد و عورت کے جھگڑے میں چڑ گیا۔ کیا مرد اور عورت کا جھگڑا کا کوئی حل ہے؟ باپ روزا رو کر کبھی ہوا ہے یا ہوگا۔ ایک مارنے والا اور دوسرا مار کھانے والا۔ ایک اذیت دینے والا دوسرا اذیت سہنے والا۔ اور دونوں اسی طرح سے غرض بستے ہیں۔ ہم بچ میں ماموں ہوتے ہیں؟ البتہ مرد و عورت کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا رول بدل بھی پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہر مرد میں ایک عورت چھپی ہوتی ہے اور ہر عورت میں — کئی مرد کم از کم بھرتی ہری تو اپنے شرنگار شک میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں بہر حال ان کے فحشیت کے بارے میں ازل سے کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ اور ہند تک لکھی جائیں گی، جن میں جھگڑا، مار پیٹ، ایذا رسانی ایک ضمنی اور مقامی حیثیت رکھیں گے۔ اور ہم تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی ساری رہنمائی اور اپنے تجرود

کے فلسفے میں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، جس کی لغی میں ہم اپنے بدن کے
 ہچکچاٹے کو برقاب میں ڈرو تے، درختوں پہ اٹا لٹکتے اور اذیت دینے والے
 فاقے کرتے ہیں؟ بلو کاشیکو کی داستانوں میں کتنے مردوں اور کتنی عورتوں نے
 اعتراف گناہ کیا اور پھر اپنی پہلی ہی فرصت میں گناہ کی طرف لوٹ آئے، کیونکہ
 وہ سانپ کی کھال کی طرح سے ڈراؤنا ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں
 کوئی ایسٹ اور فرائد جو خود کو خدا اور کلیسا کا نمائندہ کتنا تھا، یہ قوت بن
 گیا۔ کیا وقت نہیں آیا، فادر کہ ایسٹ اور فرائد، ملا اور قاضی، پنڈت اور
 بہاری لوگ یہ قوت بننا چھوڑ دیں؟ میری بات چھوڑ پیئے، میں اس وقت
 سچے دل سے اعتراف کر رہا ہوں۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح کنفیشن کے
 کان کاٹ کر اسے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کر رہا۔ ہاں، بعد میں کیا ہوتا
 ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ سوائے اس حسین ابہام کے جو ہمارا خدا ہے اور
 کون جان سکتا ہے؟..... تو میں کہہ رہا تھا کہ میری کافی میں وہ آدمی مرد
 اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ جس طریقے سے میں اعتراف اور گناہ کو
 الگ الگ اور منفرد حیثیت دیتا ہوں اسی طرح اس نے دونوں کو الگ
 الگ سمجھانے کی کوشش کی۔ پہلے وہ مرد کو ایک طرف لے گیا اور بڑے
 جو کہم کے ساتھ اسے سمجھایا سمجھایا اور اس کے خون آشام غصے کو ٹھنڈا کیا...
 پھر وہ عورت کو الگ ایک طرف لے گیا مگر کچ نک واپس ہی نہیں آیا.....

ہیں، فادر روزا ریلو؟!!

میرے لکھنے لکھانے کی ابتدا چوری سے ہوئی، باپ روزا ریلو! آپ

گھبرائیے نہیں۔ ذرا سیر سے میری بات سنئے۔ میں کہیں بھی اس چوری کے سلسلے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں ٹھہراؤں گا۔ آپ کے اٹھے ہوئے ابو اور چہرے کے سوا یہ نشان مجھے پریشان کر رہے ہیں اس لیے بعد کی بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ تاکہ آپ کو اپنے وجود سے بھی تسلی رہے۔ میں نے چوری کی اور پھر خود ہی اپنے منہ پر دو تین جپتیں بھی ماریں کیونکہ اس کام کے لیے اور کوئی پاس نہیں تھا۔ جیسا کہ ہر کامیاب چوری میں وہ نہیں ہوتا۔ نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ کئی لوگوں میں مہر نہیں ہوتا۔ ادھر چوری ہوتی ہے اور وہ چلتا، شور مچاتا شروع کر دیتے ہیں پہلے دور بھاگتے ہیں اور جب دوسرے مدد کے لیے آجائیں تو پھر قریب آ جاتے ہیں۔ اور کھٹکتے ہیں آپ چاہے کتنی بھی معافی مانگیں مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی سرشت میں کتنا ظلم، کتنی نا انصافی ہے کہ چوری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے اور معافی بھی آپ ہی مانگیں۔

تقصیریوں ہوا فادر کہ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر کو تلامی کہیں سب جج ہو گئے۔ کامیابی کا دروازہ ان پر کسی پاگل کے قہقہے کی طرح سے کھل گیا۔ اب ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو جو کہ بکھرے ہوئے تھے، اکٹھا کیا اور ایک لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ باپ رذرا رہو، کہ کامیابی کے دروازے پر کھڑا آدمی اندر کیوں نہیں جاتا؟ باہر ہی لیکچر دینا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اندر جاتے ہی اسے کامیابی کی اساس کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر دوسرے لیکچر دیتے ہیں اور وہ غریب

کان بند کرنے کی کوشش میں منہ کھول کر سنا ہے چنانچہ پروفیسر صاحب نے کہا۔ اس دنیا میں معمولی (MEDIOCRITY) قسم کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم پاپا ہے چچا، لیکن اس پاپے کے چور کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا تھاری ہمسری نہ کر سکے.....

اب اس عمر میں ہمیں کیا معلوم، خادروں کا ریزہ ہمارے نزدیک تو جو رکال ایک لفظ تھا جو کل روئے زمین پر گھوم پھر کر ہمارے کانوں میں پہلا آتا تھا ایک سچے کہا جان پاپے کہ پروفیسر کی زبان میں وہ ایک اصطلاحی لفظ تھا جس کا مطلب بددھان منتری بھی ہو سکتا ہے، انجینئر ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے ہم اس نئی تعلیم کو پروفیسر صاحب ہی سے شروع کرتے لیکن وہ تین ڈاؤن کلکتہ سب سے جا چکے تھے۔ ہمیں خاص بننے کا سبق دیتے ہی خود ہمیشہ کے لیے عام ہو گئے تھے۔ پھر ہم نوا آموزوں کے سامنے کوئی ایسی زندہ مثال بھی تو نہ تھی۔ ہندوستان کے بھٹوٹ اور امریکہ کے ال کپٹن جن کی زمانے بھر نے عزت کی ہے۔ عرشہ تاریخ پر بہت لیٹ آئے تھے۔

نوجوان ہونے کی وجہ سے مجھ میں بلا کا جوش تھا، خاد، جو کسی صبر کے ساتھ مصاحبت نہیں کرتا۔ میں تو راتوں رات کسب کمال کرنا اور اپنا گھوڑا وہاں اوپر کھکشاں پر دوڑانا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس باگ کے پیسے تھے اور نہ رکاب کے دام۔ غالباً اسی لیے میں نے اسے پویہ ہی چلنے دیا۔ میں نے چھوٹے ہی پوری نہیں کی، باپ روزاریا میں جاتا تھا نا کہ قید ہو جانا بڑا سامگتا ہے۔ بددھان صاحب سے کہیں پہلے ماں باپ مجھے لیے چوڑے لیکچر دے چکے

تھے اور پیٹ بھی چپکے تھے۔ لیکن پروفیسر زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا، اس لیے اس کی بات دل کو لگتی تھی چنانچہ دنیا کے ہر چور کی طرح ہر سری طور پر اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے پہلے میں نے شرافت کے سب گمراہ استعمال کیے۔ مہری آواز اچھی تھی، اس لیے میں سنگت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ، لاہور کے گاندھ سردھار دیوالیہ کی سب سے آخری بیالین میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن میرے لہجہ تھا کہ سات شروں کی قید میں نہ آتا تھا اور آنکھوں کی اجازت نہ تھی میرا گانا ٹوٹیشن میں آکر گانہ گانہ پڑھا جانا تھا میں نے ایک دو تھے مارے لیکن اسٹو بوٹے خالی مچھی مہڑ والے اور امرتسر کے چوتھہ رام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتیا پل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کے ریاض کی دلچرا کھڑی ہے اور آسمان سے بانیں کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور نوک زبان سے اسے جوار کرنا ہو گا۔ چنانچہ میں یوں الگ ہو گیا جیسا کہ کیلے کے پھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر اپنی بگڑی سنبھالتا، منہ میں کچھ منمناتا ہوا، اس منظر سے ٹل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انٹی امپریٹلسٹ جنگ کا زمانہ تھا جس میں ہمارے لیڈر ہیں شوت کے لوگوں سے لڑنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ مار کھا کھا کر انگریز کو سوڑ بنا دو۔ مار ہی کھانا ہوتی، نادور تو میں شروع ہی سے پروفیسر کی بات پر عمل کیوں نہ کرتا، جب ہم چنانچہ قسم کے لیڈر کی نوکری خالی تھی۔ کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک کنڈری میں بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونسٹ مورسی تو جوں کا توں سلامت ہوا لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہوسکتا تھا۔

باپ روزا رہو جس سے بعد میں میں نے کہا نیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوئے ان گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں۔

جوڑی کی بات میں دھکا نہیں رہا، باپ روزا رہو! میں کہانی لکھنے والا ہوں اس لیے اسے عین موقع پر فنی انداز میں کہوں گا۔ یعنی اس وقت جبکہ آپ کا تجربہ پانی نہ مانگے میں نے اور بھی بہت سے پاپڑیلے پاپڑوں میں دال کے ساتھ کالی مرچ بھی پڑتی ہے۔ لیکن مجھے اب تک صرف آٹھ دال ہی کاجاؤ معلوم ہوا تھا میں نے فن مصوری میں نکل جانے کی کوشش کی اور میں واقعی نکل بھی گیا۔ ہوا یہ کہ لینڈ اسکیپ بنانے کی بجائے میں انسانی ہیکر پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اور غلطی سے وہ بھی عورت کے ہیکر پر۔ اسے بنانے میں میں خود ہی اس پر عاشق ہو گیا اتنے ہنگے آرٹ پیپر کو ایک طرف چھوڑ کر میں زندگی میں اسے ڈھونڈنے کے لیے چل نکلا جس کا غز پر میں نے اسے بنایا تھا وہ تو اب تک گلایا، کوٹا اور پھر سے کاغذ بنایا جا چکا ہے لیکن میں اب تک اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے بدن پر کے اس خط کی تحقیق شروع کر دی۔ جو عورت کو مرد سے تمیز کرتا ہے اور اس کے دماغ میں بے پناہ فز پیدا کر دیتا ہے۔ دیکھیے نابک محولی خم سے کہا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کے بدن میں کمر سے نیچے رانوں کی طرف جو خط جاتا ہے، وہاں ایک ہلکا سا بے بضاحت گڑھا پڑتا ہے جسے انسانی جسم کے تشریحی علم والے صرف رگوں اور پٹھوں کا اتار پڑھاؤ سمجھتے ہیں۔ نامعلوم کیسے گورائے اپنی مشہور سٹینگ نامادی دیوای میں اسے نظر انداز کر دیا، سالانہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ

لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اس قسم کی باتیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایتر سن نے لکھا ہے کہ وہ سامنے کا کیفیت جس کے پیچھے سورج غروب ہوتا ہے، مشرک کا ہے۔ لیکن نہیں وہ دراصل شاعر کی ملکیت ہے.....

میں شاعر ہو گیا۔ انگریزی کے میروینک میٹر میں نظمیں لکھیں جو چھپیں بھی۔ لیکن چھپنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے کئی شاعر دوستوں کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں، چاہے ان کا ایک بھی مصرعہ آپ یاد نہ رکھ سکیں۔ ایک نابالغ ذہن کا مالک تتبع، محض تتبع میں بعض وقت ابھی چیز لکھ رہا ہے۔ انگریزی ادب کے گرتے نئے طفلی میں بڑا عمدہ لوحہ نہیں لکھا، پھر میں نے انگریزی میں لکھنا چھوڑ دیا۔ ہاں ہندوستان میں رہنا اور ہندوستانیوں سے براہِ چاند معلوم ہوا۔ جب اردو کا رواج تھا اور اردو لکھنے والے اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے، جیسے اب ہندی والے سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو روپ کہتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی اور اس کے علم عروض — معقولین نامعقولین — سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں بے جوش ٹپے تھے۔ یعنی کہ میں اور شعر کہیں راستہ نہ پا کر میں چھوٹا سا سینٹ جین ہو گیا۔ سینٹ جین کو آپ نہیں جانتے، باپ روزاریو ادہ آپ کی طرح کا سینٹ نہیں۔ وہ چور، گرہ کٹ، ناسق و ناجو ہے جو تیس تو ایک طرف اس نے نوٹوں میں بھی دلچسپی لی ہے جو کہ میں نے نہیں لی ہے۔ اس کے باوجود سارن نے مقدس باپ پوپ کے فرائض خود پر لے کر اسے معبود (DEITY)

کر دیا۔ ہر جگہ روک، ہر راستے کو سنگسار پا کر میرے بے پناہ جذبوں نے نکاس کے اور بھی بہت سے راستے ڈھونڈ لیے جن کا تعلق کسی بھی تعمیری چیز سے نہ تھا۔ میں نے اندھیروں کی پناہ لی۔ اندھیرے کی بابت آپ نہیں جانتے تو ان کے پہلے خیرہ کر دینے والی روشنیوں کے بعد ایک لق و دق اندھیرا آتا ہے اور پھر ایک نرم سی، مسلسل اور مقدس روشنی جس کا شروع ہے اور نہ آخر، اور جس کے پر تو سے پوری کائنات جیتی اور سانس لیتی ہے۔ لیکن اندھیرا اندھیرے کا جادو کا ہے آپ کو کیا بتاؤں، باپ روزاریو، کیونکہ وہ آپ کے تنگ و تاریک حجروں میں نہیں ہوتا۔ تاریکی کے باوجود وہاں بجلی رہتی ہے لیکن اپنی تاریکی خالص تاریکی ہے۔ آپ کے ہاں کا اندھیرا اُجالے سے متبادل (MUTATE) ہوتا رہتا ہے لیکن اپنے ہاں اندھیرے کی کوئی جگہ لیتا ہے تو اندھیرا۔ جیسے ایک صفر کو لاکھوں صفروں سے ضرب دیجیے تو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ اس اتھاہ اندھیرے میں عقل نہیں و جدان کام آتا ہے۔ اس میں کروڑوں اربوں دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جذبات اور اربانوں کے چھوٹے چھوٹے پتے اور بڑے بڑے شہر پر اڑتے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نہیں، اپنی پرواز سے پیدا ہونے والی تھر تھراہٹ کی مدد سے اپنے سامنے روک پا کر لوٹ آتے ہیں لیکن ان کی پرواز کسی طرح سے کم نہیں ہوتی۔ ان کی بصیرت کے ہاتھ پر لاکھوں آنکھیں اُٹھ آتی ہیں، جن سے وہ راستہ ٹھونسنے اور پاتے ہیں جس دن میں اندھیرے کی تلاش میں نکلا اس دن ہمارے ایک بہت بڑے روحانی پیشوا کا جنم دن تھا جس

کی پوری امت ایک طرف خوشیاں منا رہی تھی اور دوسری طرف مصروف عبادت تھی۔ جب ایک طرف میرے پورے بدن پہ ڈرے لرزہ چھا رہا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی خوش آئند سنسناہٹ رگ و پے میں سار ہی تھی۔ چونکہ گناہ ثواب کا مقابل ہے، فادر، اس لیے انسانی جسم و ذہن گناہ سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں جتنی کہ ثواب کی بے حرمتی ہو۔ آہ، مگر کتنی دیر کوئی اندھیرے میں رہ سکتا ہے؟ کتنی دیر اجالے میں رہ سکتا ہے؟.....

کسی حکیم نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اپنی منزل کو نہ پا سکے، اس آدمی سے زیادہ بے حیائی کی زندگی گزارتا ہے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ پسحیح، ایک تخلیقی ذہن کا مالک جب تخلیق نہیں کر پاتا تو وہ ایک عام آدمی سے بھی زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے، وہ کچھ اس انداز میں گرتا اور گرتا چلا جاتا ہے کہ اس کا الجھنا ناممکن ہو جاتا ہے، نا وقتیکہ کہیں کوئی نعمت نہ سنائی دے جائے۔ پھر وہ معصیت کی گود میں جانے کی بجائے اس کے پیروں پہ لوٹتا ہے جس سے معصیت بھی موکش پالیتی ہے..... یہ سب کچھ سلیقے سے ایک شرعہ لکھ سکے کی بدولت ہوا، فادر سوزاریو! میں نے اتنے گناہ کیے کہ میں انہیں گنی بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا۔ اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح سے خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو کوئی دوسری خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے۔ جو کہ اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ

خوبصورت یاد آتی ہے جس نے اپنے زعم حسن میں ایک فلم ڈائریکٹر کو جس نے بے شمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا — یاد ہے میں ایک بار تم نے مجھ سے شادی کی فرمائش کی تھی؟ ڈائریکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا — تب؟ میں نے کی تھی؟

جس رات میں نے چوری کی، اُس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لیے آڈی ہوئی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصہ بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے، لیکن اس دن عجیب سی بات ہوئی۔ ایک لمحے نے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا۔ اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دو پہر کا سورج تھا اور فوراً بعد دسمبر کی امادس۔ یہ کہ کوئی ہزار واٹ کے بٹلے کو آنکھوں میں گل کر دے۔ قدرت میں بھی ہوتا ہے۔ جب لاکھوں سر چٹنے پر بھی مجھ سے ایک مصرعہ موزوں نہ ہوا تو میں نے ایک پرانا رسالہ اٹھا کر اس میں سے احتیاطاً ایک گناہ شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لیے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھپانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لیے کوئی پیسے نہ مانگے ہوں، کیونکہ ایڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر نشتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا ہوا تھا! میں اسے دن میں پچیس ٹیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا

تاکہ لوگ میری طرف دیکھیں جب تک کہیں نہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن

ہمارے گھر میں ایک شاعر مجاہد رہتے تھے۔ انھوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل کی طرف اور کچھ لوگوں داد دی کہ اسی پرچے میں دُزدِ سخن، کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمہ مضمون چھپا جس میں پجوری کا نام بھی درج تھا۔ اب میں بازار بھی نہ جاسکتا تھا.....

پجوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باب روزا روبرو پجوری.... منجبر شاہیے۔ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو روک نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو ہر فلسفے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا۔ کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑیں۔ بہر حال، ایک ہاتھ ملے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرداتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو چھپانے کے لیے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے، ایک جھوٹ دوسرا جھوٹ لڑھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری، پہلی چوری سے بہت مختلف تھی۔ میرے دل و دماغ کی، تو کئی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافعِ شعری تھی۔ وہ بلا ٹیرو تھا۔ ایسا بلا ٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس آٹو کی طرح تھا، فلاؤ جو کاٹنے کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہوا درجے سے آپ عبادت کے لیے جاتے ہوئے آٹا خانہ کہیں بول پر چٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں۔ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ ٹکے آسان طریقے سے جب

وہ اپنا شیوہ بناتے تھے تو ٹھوڑی پہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنڈا رہ جاتا تھا.....

دردِ سخن والی رات میں ادھر سے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف اُن کی چوری کے ساخونات نکالے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سمجھا کالج، امرتسر سے ایک رسالہ نکلتا تھا، جس کا نام، شوالہ، تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یا ریاں سب شوالوں ہی میں ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکون قلب حاصل ہو گیا، جیسے میرے سب گناہ دھل گئے پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لرزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ برا نکھوں گا لیکن اپنا بُرا کسی کا بُرا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا باپ روزانہ ریوہ بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتداء کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔ خود انسان ہی کو دیکھیے، کیسے غلامت میں پٹا پھلا آتا ہے اور پھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ سوائے کلیسا اور دوسرے غرابوں کی دیوالاؤں کے چند کرداروں کے، سب اسی طرح سے آئے اور کیا کچھ نہ بن گئے۔ ان کرداروں کی بھی حقیر العقول پیدائش کو غفل اور عقلِ محض کی لوٹھی سانس باور کرے یا نہ کرے، لیکن میں تو کروں گا۔ بلکہ میں جو کہانیاں لکھتا ہوں اور جس نے اپنے پچھلے جنموں میں اپنے وجود سے بے شمار دیوالائیں لکھی ہیں، انسان کو ایسے ایسے طریقوں سے پیدا کروں گا کہ خود سری دیوالائیں اتریں

میں انگلی دبا کر میری طرف دیکھیں کیونکہ میرے نزدیک اس قسم کی عجیب الخفقت پیدا کشوں میں بہت بڑا راج ہے جسے میں جھوٹ پر کتابوں اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں، قادر روزاریوں سے میں جھوٹ کہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ کوئی چیز ثابت و سالم نہیں اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوائے اس خدا یا سوسا سو خناصر کے جو مرکب ہونے کے لیے تڑپتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے، مگر اس کی حیثیت بھی اس وقت بنتی ہے جب وہ میری مشرقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی ہی سب کچھ ہوتی باپ روزاریوں، نور پرانا تابو پرش ہے، مزے سے اکیلا رہتا۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے پر کرتی پیدا کر لی؟ کیوں ہر چیز کو نامکمل رکھا اور مرکب ہو جانے پر مجبور کر دیا؟ کیا اس لیے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سکھے؟ واہ! کیا فن ہے؟ وہ جذبہ جو کر کو دیا، اس کا کچھ حصہ مادہ کو بھی کیوں دے دیا؟ — میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز نیکی کے لیے تڑپتی رہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے جائیں، تصویریں بنیں اور تائیں اٹریں۔ اکائی کوئی چیز نہیں نادرا وہ صرف حساب کے کام آتی ہے اور اس سے پہلے ہو کر بے معنی اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے روزمرہ میں کوئی دھڑ سے کہ ڈالتا ہے کہ تروچن کو پار دے محبت ہو گئی۔ ٹھیک ہے، ہو گئی۔ مگر تروچن تین یا تیسری آنکھ رکھنے کے باوجود کیوں پار وہ قبضہ کرنا، اس سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ کیوں اس پر بھپٹے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ حسن کی تاب نہیں دے سکتا یا پار وہ خود ہی مقبوض و تاراج ہونا چاہتی ہے؟ چونکہ دونوں

یہ باتیں صحیح ہیں اس لیے میں جو، ان کی محبت کو آنے والی نسلوں اور اپنی کہانیوں کی خاطر سلیم کرتا ہوں، نفرت محبت کہوں گا، جو ترکیب میں نے ڈی ایچ لارنس سے لی ہے۔ اسی طرح کسی ادب باش کی ایک دو شیرازہ سے محبت کو محبت نفرت، الہی کے رشتے کو انبساط و درود کا رشتہ..... ایسے ہی بلند ولایت، اندھیرا اجالا وغیرہ..... ہیر کیفت میں اپنی اس چوری کو اسی صورت میں مراہوں گا، قادر، اگر آپ میری کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہوں تو، ورنہ منزل اور اس ننگ پہنچنے کے ذرائع وغیرہ کے فلسفے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔

افسوس! آپ نے تو میری ایک بھی کہانی نہیں پڑھی۔ ایک ایک میری چار اچھی کہانیوں کے نام مت پوچھیے گا پلاٹیرو۔ میرا مطلب ہے، قادر، کیوں کہ ایک ایک پوچھ لینے سے تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں میں نے انہی کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ایک تو بائبل کی سیمسن اور دلائیل سے مکر لیتی ہے۔ اچھا، میری کہانی نہیں پڑھی تو کرشن چندر کی کنواری پڑھی ہے مجھے وہ بہت پسند ہے۔ واقعی جنسی جذبہ انسان میں نہیں مڑتا چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا اور بیکار کیوں نہ ہو جائے۔ جنسی جذبے کا براہ راست خالق سے تعلق ہے، فادر جو اڑا اپنکایا اور دشمن ناڑیوں کی مدد سے نیچے بدن میں آتا ہے تو بچے پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے پیچھے تیسری آنکھ کے قریب آتا ہے تو افسانے میں نے بھی کنواری کی قبیل کی ایک کہانی لکھی۔ لڑکی کے نام سے لکھی ہے جس میں لڑکی اس قدر لمبی ہے کہ اسے اپنے قد کا لٹوکا نہیں ملتا۔ اسی کو صحن میں اس کی دادی مری نہیں پاتی حالانکہ سامنے

اس کو اپنا لڑکا، لمبی لڑکی کا باپ دم توڑ دیتا ہے۔ آخر نالے تنہا ایک لڑکا اس لڑکی کو دیکھنے آتا ہے جسے اٹھنے، چلنے، پھرنے کی ممانعت ہے کیونکہ اسے میں اس کی لمباں کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر شادی ہو جاتی ہے اور بچپن میں لڑکی کو دہری۔ تہری ہو کر چلنے کی ہدایت ہے۔ کیسی بے بسی ہے جس میں وہ لڑکی کی ہدایت پر عمل کرتی ہے مگر نہیں جانتی؟ شادی کے بعد دلہا دلہن دونوں دور آسام چلے جاتے ہیں اور جب مدینوں کوئی خط نہیں آتا تو بڑھیا کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے میاں نے اُسے نکال دیا ہو گا۔ سال کے بعد ایک ایک دن وارد ہو جاتے ہیں مگر اس وقت بھی بڑھیا دسب سے ہاتھ لڑکی کے سر پر راتی ہے اور اسے سچی ہو کر چلنے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات ہی نہیں بیٹھتی کہ اب تک لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر کھ لیا ہو گا یہ کیسا ڈر تھا جس کا شروع اور آخر تو تھا لیکن بیچ کی منزلیں غائب تھیں؟ جب بڑھیا کو پتا چلتا ہے کہ لڑکی پیٹ سے ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی پوتی بس گئی ہے۔ اب وہ تسلی سے مر سکتی ہے۔ لیکن سرنے سے چند ہی لمحے پہلے اس کے بوڑھے جھڑیوں سے پٹھو ہیرے پکڑا ہٹ چلی آتی ہے اور وہ لڑکی سے پوچھتی ہے: "مائے ری نہی! تیرا وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہو گا؟"..... پھر..... پھر..... پھر داتا اور میں داتو تیرا بلی ہو اٹھتا ہے اور بڑھیا کے سر پر لے رکھی ہوئی گیتا کے پتے ہوا میں اڑنے لگتے ہیں اور اپنی جگہ پر آ کر رک جاتے ہیں جہاں شدید ساہت، لکھا ہوتا ہے....

..... میں اس کہانی میں آپٹیکل انٹرن کی بات نہیں کرتا جس میں لمبی

سے بس لڑکی لپٹے میں چھوٹی ہو جاتی ہے بلکہ اس ترتیب اور ہم آہنگی کا قصیدہ کہتا ہوں جہاں انسانی دماغ ہر بے ہنگم چیز میں پیدا کر لیتا ہے اس پر بھی کوشش چاہیے کی کہانی میری کہانی سے بہتر ہے۔ ہاں قادر! میں اپنا اس مبصر کی تعریف محض رقابت کے جذبے سے کر رہا ہوں۔ لیکن اسے رقابت رفاقت کہتا ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی میرے ساتھ رفاقت رقابت کرتے آئے ہیں۔

حیف کہ آپ نے کوشش چند رکی کوئی کہانی پڑھی ہے، نہ عصمت کی اور نہ منٹو کی۔ آپ تو ناچ رنگ، سینا تاشے، قصے کہانیوں کو بسی باتیں سمجھتے ہیں جو آپ کو ازلی حقیقت سے پرے لے جاتی ہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ سب پاپ ہے جو ہندو فلسفیوں کے نزدیک پرے اور آپ کا مرکب ہے۔ یعنی کہ وہ چیز جو آپ کو اپنے آپ سے پرے لے جائے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں، قادر کہ میں نے ہمیشہ اس آپ سے پرے بٹھنا چاہا، کیونکہ میرے نزدیک یہی انسانی حصول کی معراج ہے۔ کیا آپ نے مصری رفاقت علیہ کے لچکیلے بدن کو قص کو عالمگیر اثبات میں ہاں ہاں کرتے دیکھا ہے؟ کم از کم روسی بیلے میں مارگت فونٹین اور نورڈیٹ ہی کو دیکھ لیتے تو پتا چل جاتا کہ خالق کا اپنی تخلیق سے کیا رشتہ ہے؟ روسی بیلے ڈانسز تو کثرت تعلیم کی وجہ سے اس بات کو نہیں جانتے، لیکن آپ تو جانتے ہیں؟ سو بخا سنی کو برف پر اسکیٹ کرتے دیکھنے میں تو کوئی گناہ نہیں؟ کیسے وہ برف پہ خطا اور دائرے بناتی، زندگی اور ماورا کے جگر سمجھاتی ہے؟ کچھ نہیں تو اس برف ہی کو چوم لیتے جسے آپ پسند

کرتے ہیں اور جو آپ کے جسم و ذہن کا حصہ ہو چکی ہے۔ آپ نے یہودی
 مینہوسن کی دانیلن نہیں سنی تو کیا روی شکرا اور ولایت حسین کی سنار سنی ہے
 وہ بھی تو روح ہی کی آوازیں ہیں۔ سبکدستی میرا کہہ بھی تو لگاتی ہے جس
 سے آپ اپنے مطلب کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ اور میں اپنے مطلب کی۔
 بالاسر سوتی بوڑھی ہو گئی ہے۔ خادر، یا گورو کرپ جمان ہو گیا ہے؟ جیتن
 آنا، پدوسی ادیگانی تو فڈے محل نہیں بنا سکے حالانکہ ہمارے مندر، مسجد،
 گرجے اور طبروں کی چنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ باپ ہونا رہو! آپ
 شاید نہیں جانتے کہ ہمارے دیس کی سستی ساوتری بھی وہی بات کہتی ہے جو
 امریکہ کی ریٹا ہیور تھ، جب وہ اپنے میاں آرسن ولیز سے طلاق لیتی ہے
 فرانسیسی ایکٹرس یاں مورو کی اداکاری دیکھی ہے۔ اور اس کے بعد اس
 کا بیان پڑھا ہے جس میں وہ کہتی ہے کہ فی کے سونج کو چھو لینے کے لیے
 میرے نزدیک اس ڈائریکٹر کے ساتھ سونا ضروری ہے، جس کے ساتھ میں
 کام کر رہی ہوں؟ شیک باج والے بھی آپ ہی کی طرح سے اس بدی کو
 جھٹک دینا چاہتے ہیں جو روح کا بچپا ہی نہیں چھوڑتا۔ جرمنی کی نئی یاری
 پٹو نے دو (LET KISS) کی راہ بھی روح کے کمر کو کو جاتی ہے لیکن بدن سے
 ہو کر آپ اگر مانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے
 ہیں تو پھر عیسائی کون ہے، مسلمان کون اور ہندو کون؟ پھر میری کدہوں
 سے استغنا کیسی؟ تنہا آپ ہی نہیں، باپ ہونا رہو جو کہانی کو پہل بات
 سمجھتے ہیں۔ اور بھی بہت سے باپ ہیں جب میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی

تو میں اتنا ہی خوش تھا جتنا کہ اس دنیا کی تخلیق کے بعد خدا خوش ہوا ہر گاہ کیا دنیا کے ملکات
تھی جو میرے رومان کے اندر دینی چراغ نے میرے سامنے کھل دی تھی۔ باپ ہر چہ تھے مگر میں نوجوا
کا دور دورہ تھا۔ بڑوں میں صرف میرے بڑے تاؤ ہی رہ گئے تھے جو کسی طرح ہمارے
ننان نقد کے کفیل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ ان سے اپنی چھوٹی سی زمینداری بھی چلتی تھی
ایک دن میں لہان سے کہا۔ آپ سب بھول بیائیے تاؤ جی! مجھے کہاں یاں ٹھنسی
آگئی ہیں اور میں ان سے بہت پیسے کا اوّل گام میرے تاؤ آپ بھی زیادہ بھولے تھے
قادر روزگار بڑا وہ جب تب، نیم سچ نیم سچ کے بیت قائل تھے ان کی آنکھوں میں آنسو
چلے آئے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم زندگی بھر جھوٹ ہی کہائی گوارے جاہن؟

جب سے میں برابر جھوٹ بول رہا ہوں، نادار، لیکن اسے جھوٹ پر
کہتا ہوں۔ یہ ترکیب میں نے اپنی آسائش اور سہولت کے لیے نہیں بنائی
بلکہ میں اس کا قائل ہوں۔ آپ کے خدا کی زبان بھی خالص سچ نہیں ہے
وہ بھی کتلیے میں بات کرتا ہے۔ اس نے کبھی سامنے آکر سچ کے طریقے سے
نہیں کہا۔ میں ہوں۔ اس نے کسی قتل کے مقدمے میں گواہی
نہیں دی۔ حالانکہ بعض حالات میں قتل صرف اسی نے دیکھا ہوتا ہے۔ وہ
تو کہتا ہے۔ تم ہو، اس لیے میں ہوں۔ گواہ ڈھونڈنے کے لیے دوڑو

جھاگو اور اگر کوئی مذمے تو پیدا کر لو۔ آدن سخت پریشان ہوتا ہے۔ اور
سرچسک ہے کہ آج گواہ کو پیدا کرنا شروع کیا تو کتنی دیر میں وہ پے گا اور پل کر
جہان ہوگا؟ وہ کہتا ہے، میری ملکیت میں انگلیوں کی ٹکریں مسکت گواہی
دیتی ہیں، اینٹ پتھر بھی بولتے ہیں۔ ان کا بیان نہ لے سکو تو ایسے ہی کان

کھول کر پھرد۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں قاتل کی آستین کا لہو پکڑ رہا ہوگا۔ اگر
 دیکھوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قاتل بری ہو جائے تو بھی وہ کچھ نہیں
 کہتا۔ ضرور پچھلی زندگی میں مقتول نے قاتل کو قتل کیا ہوگا۔ اس لیے اس
 زندگی میں حساب بے باق ہو گیا۔ وہ ہمیں کبھی ایک خوبصورت ساخو گوش
 ہاتھ میں تھا دیتا ہے اور کبھی بدصورت ساخو رشتہ۔ یہ اس کی کہانیاں
 اور پہیلیاں ہیں جو ہماری سمجھ کو آزماتی اور اسے معطل کرتی ہیں پنجابی شاعر
 گکیرہا کے مطابق اس نے گلاب کو بیسیوں زبانیں دی ہیں۔ لیکن وہ چپ
 ہے۔ اگر بات کرتا ہے تو اشارے کی زبان میں۔ خدا کی اپنی زبان بھی تلخ
 (ALLUSION) کی ہے۔ اور وجود التباس (ILLUSION) کا وہ خود
 مایا کی معرفت باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی ٹھیسٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیگیو منصور
 سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اسی لیے مارے گئے کہ انہوں نے خالص سچ
 بولا۔ اور جھوٹ سچ کی عظمت کو نظر انداز کر گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے
 لوگوں کو اس سلسلے میں شہادت پاتے ہوئے دیکھا مگر۔ بھول گئے کہ
 انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن سامنے کا سچ نہیں۔
 آپ کھرے کھرے سچ میں یقین رکھتے ہیں، باپ روزا رو! تو
 جیسے میں آپ کو کچھ سچی باتیں اپنی کہانیوں کے سلسلے میں بتانا ہوں وہ بالکل
 سچی ہیں۔ دسی گئی کی طرح خالص اور گارنٹی گارنٹی۔

میں نے اپنی کہانی بتلے ہیں اس بات کا احترام کیا تھا کہ مرد اور
 عورت کے بیچ خوش وقتی برقی ہے، لیکن انسانی معاشرے کا کوئی تین

نقشہ سوائے اس بات کے نہیں بنتا کہ مرد اور عورت شادی کریں اور اس کے بعد بچوں کی ذمہ داری قبولیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جنسی فعل میں تقدیس پیدا ہو سکتی ہے۔ جسے دنیا کے ننانوے فیصد لوگ گندہ اور نجس سمجھتے ہیں۔ اور اسے دردناک بلکہ شرمناک مجبوری گردانتے ہیں.....

درباری لال ایک بچے بیل کو اس کی بھکاریں ماں مصری سے کر لیے پہ لے کر ہوٹل میں لے جاتا ہے تو سب اسے خوش آمدید کہتے ہیں حالانکہ اس سے ایک ہی روز پہلے کسی دوسرے ہوٹل والے نے اسے بچا لنگھا کہ کر بھگا دیا تھا۔ وہاں جب وہ سینا کے ساتھ ہم بستری کرنے لگتا ہے تو بیل رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لیے دوڑتا ہے، لیکن نیم عریاں سینا دوڑ کر بچے کو پکڑ لیتی ہے۔ اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہے جس نے اس کام کے لیے ایک معصوم بچے کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہے بچے کے ساتھ جو عورت — ماں کا غیر متفق حصہ ہے اور اسی نظروں سے درباری کی طرف دیکھتی ہے کہ اس پر گھڑوں پانی چڑھاتا ہے۔ وہ اسی متفعل حالت میں سینا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا۔

..... جس پرچ سے میں نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، باب روزاریو! اس میں میرے مہربان دوست کی بی گناہ اور پانچ روپے والا بان کھا کر، سینا کی اس حد تک آبروریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال لے جائی گئی اور جلاب سے بچے کے پیٹ میں سے افریون اور اس کا اثر دور کیا گیا۔

اور سچ کہوں؟ ٹرمینس سے پرتے میں مورین جام و کٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پر اپنی بیوی کو پہاڑ پہ جانے کے لیے رخصت کرتا ہے گاڑی چلتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی واقف کار اچلا نے اسی گاڑی میں اپنے شوہر کو دل کے لیے رخصت کیا ہے۔ مورین جام اچلا کو اپنی کار میں لفٹ دیتا ہے۔ اور اس طریقے سے آگ اور نزل کا گھٹیا سا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تضادات ایک طرف گناہ کے محرک ہوتے ہیں تو دوسری طرف سدباب بھی۔ اچلا مورین جام کو زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور کہتی ہے۔۔۔ کیا مرد اور عورت کے درمیان اور کوئی رشتہ نہیں بننا؟ کیا وہ بھی بھائی نہیں ہو سکتے؟..... مورین جام برا فروختہ ہو کر اسے بھی کہہ دیتا ہے لیکن

ادھر مورین جام کی بیوی سو مٹرا لوٹ آتی ہے اور ادھر اچلا کا شوہر رام گدگدی۔ رکھشا بندھن کے دن مورین جام تین ساڑھے تین سو کی ساڑھی اور سو روپیہ نقد اچلا کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ اس شہر میں اپنی سگی بھی کو اس نے صرف دس روپے دیئے تھے۔ اچلا اس دن صبح ہی سے سچی بنتی رہی تھی اور اس نے جو رکھشا مورین جام کے لیے بنائی تھی۔ اس میں کلاہتوں کے علاوہ سب سے موقی ٹانگے تھے۔ مورین جام رکھشا بندھو کر، ایک سرد آ۔۔۔ بھرتے ہوئے چلا جاتا ہے جیسی اچلا کے لہصاب

جواب دے جاتے ہیں اور وہ اپنے میاں رام گدکری سے لیٹ جاتی ہے۔
 اور اسے کہتی ہے۔ ”مجھ سے پیار رکھو اور اور.....“ اب حقیقت یہ ہے۔
 کہ مہرین جام اور اچھلا نے باہمی سازش سے علی الترتیب اپنی بیوی اور اپنے
 میاں کو بھجوا دیا تھا۔ اب اچھلا کے ہاں ایک بچہ ہے جسے اچھلا کا شوہر
 رام گدکری اپنا سمجھتا ہے اور روز اس سے کھیلنے سمئے کہتا ہے میرا چھو
 ، میرا منو.....

یہ نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت اور بدکاری ہی بدکاری
 ہے۔ نیکی کا کچھ یہ ہے کہ میرے افسانے اپنے دکھ مجھے دیدوار کی آندو اپنی
 حقیقی زندگی میں اتنی بلند کر دیتے ہیں کہ اسے اپنے سوا اور کوئی آدمی
 اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے بٹے ہوئے دکھائی
 دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں، حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس
 کے پاس نہیں پھٹکتے۔ سب اپنی پہلی فرصت میں اس سے کہیں دور بھاگ
 جانا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی پوچھا پوچھ کیا کرتی ہے۔ اور کبھی کبھی کہنے جاتے
 والوں کو اس کی وحشت ناک سنہی سنائی دیتی ہے۔

سچ سننے کی تاب کس میں ہے، باپ روزا رولہ انہیں میں سچ نہ
 بولوں گا یا ایسا کچھ بولوں گا جو آپ کے سچ سے ارفع ہو۔ یعنی اس میں
 جھوٹ کی حسین سی آمیزش ہو۔ ایسا نہ کروں گا تو معاشرے میں طوائف الملوک
 پھیل جائے گی۔ لوگ مجھے مار دیں گے اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی
 سے بڑی کینہ سی محبت ہے۔ میں شہادت کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ کسی

دوسرے کی جو میں اپنی میٹھ پر صلیب اٹھاتا ہوں۔ لیکن اس امید میں کہ ایک دن اسے جھٹک دوں گا۔ پہلے میں بہت بے ضرورت قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، نادرجہ کی کاتعلق سطح، محض سطح سے تھا اب جبکہ میں نے انسان کے تحت الشحد میں جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پر لکھتا بھی ہوں، باپ روزاریو تو ایک ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لیے نہیں۔ یوں مجھے اپنے گناہ جو پوری طرح سے گناہ نہیں بن پاتے، بے حد عزیز ہیں۔ دراصل میں آپ کے پاس اتنا اعتراض گناہ کے لیے نہیں آیا، جتنا یہ بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اور گناہ کروں گا تاکہ آپ کی نوکری بنی رہے۔ میں مجبور ہوں، باپ روزاریو! جب گناہ کی گھڑی آتی ہے تو میرے جسم و ذہن بلکہ کام و دہن اسی طرح سے کانپنے لگتے ہیں، جیسے آپ حسن ازل سے دوچار ہو کر۔ میں بھی اپنے میدانِ عمل میں ایک طرح کا پادری ہو گیا ہوں۔ قاتل خود مقدمے کی سماعت کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لکھنے کے کمرے میں جوائیڈ پلانٹ ہے، اس نے روٹھ کر مجھ سے کہا — دو دن ہو گئے، تم نے مجھے پانی ہی نہیں ڈالا۔ میں کیا جواب دیتا۔ میں نے شرارت سے کہا۔ کئے روز ہو گئے، تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ وہ سبس پڑا اور میں بھی رو دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے چہرے کو چوما، ہاتھ سے اپنے بدن کی حراست دی جو کثرتِ گناہ سے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں اس لیے مجھے اپنے بدن کی

ہری ٹھنڈک دی۔ میرے گھر کے سامنے ایک ڈسٹ بن ہے جہاں محلے کے لوگ کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اس میں ڈبل روٹی کا ایک ساٹس پڑا تھا۔ میں کہیں ادھر سے گزر رہا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں سے سر اٹھا کر اس نے مجھ سے کہا۔ دیکھو، دیکھو جا، بن مجھے کہاں پھینک گئے ہیں یہ میری جگہ نہیں ہے۔ جبکہ اسی شرک کے موڑ پر، پان والے کی دکان کے پاس کئی بھوکے گھوم رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے پر وڈر لو سر نے کہا ہے کہ کچھ آگے نہیں چلے گی کیونکہ ہماری مہر دہن حاملہ ہو گئی ہے۔ اب ہم اور ہمارا پورا یونٹ اگلے چھ آٹھ مہینے تک بیکار رہیں گے۔ اور مہر دہن کی صحت کے لیے دعائیں کرنے پر مجبور۔ یا ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹل کریں گے جو کہ ہر آدمی بیکاری میں کرتا ہے!

سامنے ڈان باسکوا سکال کا گرجا دیکھ رہے ہیں نا، اس میں بچنے والے گھنٹے کی آواز بے حد خوبصورت ہے۔ میں مندر اور مسجد وغیرہ میں تو نہیں جاتا۔ لیکن گھنٹوں کی آواز اور اذان مجھے بہت پیاری لگتی ہیں میں ان کی بازگشت کا پچھا کرتا ہوں اتنی دُور نکل جاتا ہوں کہ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اپنی کی طرح لطیف سے لطیف تر ہوتا جا رہا ہوں۔ روح کا تو وزن نہیں ہوتا۔ میرا بدن بھی بے وزن ہو جاتا ہے اور میں پوری کائنات پر پھیل جاتا ہوں۔ جب میری شکل جاہن کی نہیں رہتی۔ میں وہ پناہ نامی جاتا ہوں جہاں روپ اور ذرا کا تر ہے مجھے خدا کی اس بے صفی سے بے حد محبت ہے کیونکہ اس کی اسی صفت سے ہم جو کہانیاں لکھتے اور تصویریں

ناتے ہیں، اپنے لیے گنہائش پاتے ہیں۔ جیسے ہم بھی اپنے طریقے سے چھوٹے چھوٹے
 حلال ہیں جب میں اپنے دل کی خوبصورت گھلاوٹ میں ٹیکر یا کی نظم پڑھتا ہوں۔
 اے اُدب! میں بھی تو روپ بین ہوں۔

تیرے روپ کی جوتی میرے آکا کی سیاہی کو روپ مان لے جا کر گرتی ہے۔
 تیرے روپ کی جوتی — میرا ہیون آدھا رہے،

اس کے بنا میرے وجود کا رنگ اور میرے آکا کے چتر عجیبی میں گم ہوتے
 ہیں -

خادر روزاریو! میں اپنی اس آگہی سے کبھی خود ہی متوحش ہوا اٹھتا ہوں۔
 آپ اندازہ کیجیے۔ وہ آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے جسے اپنی روح کے اندھیرے
 میں ایک ساتھ لاکھوں، کروڑوں آوازیں سنائی دیں؟ جو اس قدر لطیف ہو
 جائے کہ خود کو کبھی ڈھونڈنے پر نہ پائے۔ جب آگہی آتی ہے تو آپ اپنی ذات
 میں ہزاروں معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر کیفیت و لطیف چیز کا رشتہ
 سمجھ لیتے ہیں اور جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایک بے بضاعت سی تیونٹی بھی
 استعارہ بدوش آپ کے سامنے چلی آتی ہے۔

کیا کہا، باپ روزاریو؟ آپ کلیسا چھوڑ رہے ہیں؟ نہیں خادر خدا کے
 لیے ایسا مت کیجیے۔ میری طرح اکیلے جینا ہر کسی کے بس کا رنگ نہیں ہے
 آپ اور آپ کی قبیل کے اور لوگ جی ہی نہیں سکتے، جب تک وہ کسی مذہب
 فرقتے یا گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے جو بھی جھوٹ پرچا بولا ہے۔ وہ سر
 کسی کے کام نہیں، آپ نے کلیسا چھوڑ دیا تو آپ مراغیں گے اور وہ بھی پاگل

برکر.....

مجھے اجازت دیجیے ناوبر!..... وہ آدمی جو ایک مرد اور عورت کے
 جھگڑے میں پڑ گیا تھا اور عورت کو الگ لے جانے کے بعد آج تک لوٹا ہی
 نہ تھا، ایک ایسی کہیں سے پلا آیا ہے میں جا کر ذرا اس سے پوچھوں تو کہ
 آخر بات کیا ہوئی؟

فنون



دل دریا

میں کھڑا کھڑا تھا گیا ہوں۔

لوٹ کر دھرم شالہ جانے کو بھی من نہیں چاہ رہا۔ ایک عجیب سا دلکش عجیب
سی اداسی سارے دہر پر چھا گئی ہے۔ ایسا گہرا اور لمبہ بہ لہر پھیلتا ہوا دکھ کر کچھ
کرنے نہیں دیتا؛ شاید یہی وہ دکھ تھا جس نے گوتم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔
دریا پر بات اتر آئی ہے اور گھاٹ کی روشنیاں منہ منہ بہتے پانی پر جھللا رہی ہیں۔
منسلک میں شام کی آرتی کے بعد خاموشی چھا گئی ہے۔ ایسی خاموشی جو مقدس
بھی ہے اور رازِ اسرار بھی۔ بالکل خدا کے وجود کی طرح۔ دریا کے پار سادھوؤں کی
ایک ٹوٹی الاؤں جیسے میٹھی ہے۔ فضا میں کبیر کے دوہے کی سی نرم گھیر تاراؤں
اداسی ہے اور میں گنگا کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ سادھو ہو جاؤں کر ہی
مکتی کی راہ ہے۔

میں بیٹھ گیا ہوں۔ ہر کی پڑی ٹھنڈی ہے اور یہی جیسے جان سی ٹھنڈک
فضا میں بھی ہے۔ بالکل ہمارے گھر کی طرح۔ گھاٹ سنسان ہے۔ مجھے غور سے
دیکھنے والا جادو ساری سادھو کھڑے ہیں بھانپا کی پار کر چکا ہے اور وہ گہمی کے چراغ
ہو میں نے پاروتی کی آتما کی راہ میں روشنی کرنے کے لیے ان پور تر لہروں پر بسائے

تھے ڈولتے ہوئے دور چلے گئے ہیں۔ اُدھر جہاں سمندر ہے۔ وسیع حقیقی۔ اور وہ ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد تہی بالکل ایکلی ایکلی سی لگ رہی ہے اور یوں چپ چاپ ادا سی سے سب کچھ دیکھ رہی ہے جیسے پاروتی اپنی کھڑکی کی سلاخیں تھامے کھڑی تچوں کو کھیلے دیکھا کرتی تھی۔

پاروتی ہماری کوئی نہیں تھی۔ پڑوسن بھی نہیں۔ کبھی وہ ہمارے مکان کے ایک حصے میں کرایے دار تھی اور اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتی تھی لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ پتاجی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ماں اس گھر میں نہیں آئی تھی (یہ سب باتیں مجھے گاہے بگاہے دیدی سے معلوم ہوتی رہی ہیں جس لئے یہ سب کچھ ماں اور دادی سے سنا تھا)۔ پاروتی کے ماں باپ نہیں رہے تھے اور اس کی پرورش اُس کی بیوہ پھوپھی نے کی تھی۔ دادی نے ایک صبح اُن کا سامان اٹھا کر گلی میں رکھوا دیا کہ اُسے جگہ کی ضرورت تھی۔ پتاجی کی شادی جو تھی۔ ماں کو دادی اس کے پیدائش سے پہلے ہی پیار کرنے لگی تھی، یعنی جب وہ ہماری نانی کے پیٹ میں ہی تھی تو دادی نے اُسے اپنی بہو بنالیا تھا۔ اس طرح وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گھر میں تھی۔ دادی پڑواری کی بیٹی اور نھانڈار کی بیوی تھی اس لیے ہمیشہ حکومت کرتی رہی کہتے ہیں کہ اس کے آگے پڑیا بھی پر نہیں مارتی تھی۔ وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دادی میری پیدائش سے پہلے ہی آسمانوں میں چلی گئی، جہاں جنت میں خدا اور جنہم میں شیطان کی حکومت ہے۔ نہ جانے وہ وہاں کیا کرتی ہوگی۔ شاید چڑیلوں کو اڑتے دیکھتی ہو۔ پاروتی اور اس کی پھوپھی ہمارے مکان

سے نکل کر اس مکان میں رہنے لگیں جس میں آخر تک پاروتی رہی۔ اُس کی بچپنی غریب تھی اور بوڑھی بھی۔ اس نے بہتیرا بچا کر پاروتی کی شادی جو جائے، لیکن پاروتی ہمیشہ انکار کرتی رہی اور جب بچہ بھی مر گئی تو یہ کہنے والا بھی کوئی نہ رہا۔

پاروتی میری کوئی نہیں تھی پھر بھی اپنی، بہت زیادہ اپنی لگتی۔ ایسی جودل میں، صبح میں اپنی ہوتی ہے اور سوچوں میں بستی ہے اور ہم ہر جگہ ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ کھڑکی اُس کھوٹے میں کھلتی تھی جہاں گلی کے بچے کھینچا کرتے تھے اور شور مچاتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے پھر فوراً امن جاتے تھے کہ سکول کی طویل قید اور گھر کی پابندیوں کے بعد یہ اچھا لگتا تھا۔ میں بھی سکول سے آکر سیدھا وہیں جاتا۔ نہ جانے کیوں پاروتی کے مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونا بھی کو بھاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دیوار کے پیچھے اس مشین کی آواز ہوتی تھی جس پر پاروتی محلے والوں کے کپڑے سیال کرتی تھی۔ جب وہ کھڑکی میں آتی تو ہم سمجھ جاتے کہ اُسے سوئی، ٹپن یا دھواگے کی گولی کی ضرورت ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے ڈر لگتا کہ کہیں وہ مجھ سے نہ کہہ دے۔ کیا میں انکار کر سکوں گا کہ میں چاہتا بھی تو تھا کہ وہ اپنے سب کام مجھ سے کروائے۔ اُس کی شخصیت میں اس قدر کشش تھی، اس کی آواز اتنی میٹھی، اتنی پیاری تھی۔ اور کیا میری ٹانگیں مجھے گلی کے باہر اس دکان تک لے جائیں گی، جہاں یہ سب کچھ ملتا تھا، کہ ماں کی سخت ہدایت تھی کہ اس سے بات نہ کرو۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتی تھی۔ اس کی نظریں

ایک پل کے لیے میرے تہرے پر ٹھہرتیں، وہ مسکراتی جیسے میرے خیالات پڑھ رہی ہو۔ بڑے سورنے کے کتے فائدے ہیں؟ وہ کسی اور کو بلا کر حیر منگا لیتی۔ میرا دل اس کوئلے کی طرح بجھ جاتا جس پر پانی ڈال دیا گیا ہو اور پھر میں سارے کچے بار جاتا کر ہارنا ہی اچھا لگتا۔

”پاروتی مجھے دیکھ کر مسکراتی تھی۔ میں زیدی کو بتاتا۔
”شی! ماں سن لے گی۔“

”ماں ہیں اس سے بات کرنے سے کیوں منع کرتی ہے؟
”وہ ہماری دشمن ہے۔“

ماں کہتی تھی پاروتی اچھی عورت نہیں ورنہ کوئی اس سے شادی نہ کر دیتا، اور یہ کہ وہ جادو ٹونا کرتی ہے میں نے سن رکھا تھا کہ جادو کرنے والیاں آدمی کو بھیڑیا یا کتا بنا کر قید کر لیتی ہیں اور وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ میں کچھ کھیلتا ہوا اُسے غور سے دیکھتا تو وہ مجھے جادو گرنی باطل نہ لگتی۔ اس کا چہرہ گول اور خوبصورت تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور کالی۔ وہ بال ہمیشہ کھلے رکھتی تھی جس سے کبھی کبھی مجھے ڈر سا آنے لگتا۔ میں جب اسے دیکھتا تو مجھے ماں کے ہوجا کے کہیں میں کبھی چاندی کی لکشمی یاد آنے لگتی۔ اور لکشمی کی تو ماں پر جا کر تھی، پھول پڑھاتی تھی اور آرتی اتارتی تھی لیکن پاروتی کو گالیاں دیتی تھی اور کوشی تھی۔ میں تپاجی سے پوچھتا تو وہ ہل مری طرف دیکھتے جیسے میرے آپا رو دیکھا ہے ہوں۔ مجھان کا اس طرح دیکھنا ہمیشہ عجیب سا لگا جلد اس سے خوف ہی کیا ہے کہ ہم خود کو ان نظروں کے سامنے محض غمگین نہیں کرتے اور کئی رات راز نہیں دیتا۔ اور جب ہمسارا رات رات

نذرہ کے تو زندگی کیا ہوئی، ہمارے وجود کے معنی کیا ہوئے؟ شخصیت میں تنہو ٹرا
 سا اور ضرور ہرنا چاہیے کہ اس طرح آدمی (IMPORTANT) بنارہتا ہے
 وہ مجھے جب اس طرح دیکھتے تو میں عجیب سی سحر جی محسوس کرنے لگتا اور مجھے
 خود رخصتہ آنے لگتا کہ میں انہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں صرف اُن کا
 چہرہ، ناک، کان، ہاتھ پاؤں دیکھ سکتا تھا کہ ماں نے بہت پہلے میں بتایا تھا کہ
 یہی تھا ابا پ ہے۔ سب ایسے شاید یہی باقی ہیں، مضموم بچوں کو دوسو کا رتی
 ہیں، لیکن دراصل وہ باپ نہیں ہوتا جیسے ہم دیکھتے ہیں۔ باپ تو اُس کے
 اندر، بہت گہرائی میں کہیں چھپا ہوتا ہے، جسے ہم میں سے بہت کبھی نہیں
 دیکھ پاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہی سچائی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔
 ”پاروتی جادو گرئی ہے؟“ میں پوچھتا۔

”جادو کوئی چیز نہیں۔“

”تو پھر ماں کیوں کہتی ہے؟“

”آدمی کو وہی بات مانتی چاہیے جس کا اسے یقین ہو۔“

”اسے بھی کسی کام کا نہ چھوڑنا۔“ ماں، ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں
 سے اُپکرتی جب پتا جی کی باتیں اچھی لگنے لگتی ہیں اور دل ان کے پاس
 بیٹھنا چاہتا تو وہ چلی آتی۔
 ”چل، پڑھ جا کر۔“

پتا جی خاموش ہو جاتے۔ اُس کے بعد ایسا محسوس ہوتا کہ وہ دریاں
 ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہیں اُٹھ کر آ جاتا۔ ماں بعد میں بھی بولتی رہتی لیکن

پتاجی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ وہ ماں کی باتوں میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔
 جو وہ کھتی خاموشی سے ماں لیتے اور گھر میں بے تعلق سے رہتے۔ تب بھی
 ماں اُن سے ناراض رہتی۔ پتاجی سے بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں پونچھ
 کی گریبوں کی طرح سرور نہیں، پیشانی پر بل بوتے اور ہچے میں تلخی ہوتی۔
 اس کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہتی رگھن میں، آنگن میں، کمرے میں، اور ہم
 سب بہن بھائی ہمسے سے کونوں میں دھکے رہتے اور پتاجی کے حقے کی گڑگڑ
 اور بھی تیز ہو جاتی اور دھواں جلدی جلدی اُن کے مُنہ سے نکلنے لگتا اور
 وہ سر جھکائے اپنی مخصوص آرام کرسی پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں سو پتا وہ
 گوگ بادل کے ڈنڈی کی طرح کڑکتے، گرختے کیوں نہیں، کبھی کبھی ماں کو ڈانٹ
 کیوں نہیں دیا کرتے ؟

میں ماں کی اُن دوسے کی گریبوں جیسی سر د نظروں سے بچنے کے لیے
 پوہا کے کمرے میں چلا جاتا جہاں چاندی کی گلشنی پھولوں میں ڈھکی ہوتی اور
 کمرے میں صندل اور لوبان کی خوشبو ہوتی۔ ماں دیر دیر تک موہتی کے
 آگے جھکی رہتی۔ پتاجی اس کے کمرے میں کبھی نہیں گئے تھے، حالانکہ وہ ہمیشہ
 دھرم اور آتما اور پرمانما کی باتیں کرتے، ان کی باتیں دلچسپ تو لگتی تھیں
 لیکن تب سمجھ نہیں آیا کرتی تھیں۔ موہتی کے سامنے کھڑا میں سوچا کرتا ماں
 جب دھرم کرم کو مانتی ہے، پوہا پانچہ کرتی ہے تو پتاجی سے لڑتی کیوں ہے
 اور وہ اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہے اور میں پیار کیوں نہیں کرتی، کبھی ہمارا
 منہ کیوں نہیں چومتی، چھاتی سے کیوں نہیں لگاتی۔ دودھ بھی پیئے کو دیتی

ہے تو ڈانٹ کر، کھانا کھلاتی ہے تو گھور کر، ڈالی کی ماں۔ کتنے پیار، کتنی نرمی اور محبت سے بات کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں رہتی رہتی ہے اور اسے دروازے تک چھوڑنے آتی ہے اور مسکرا کر ٹانگہ دیتی ہے۔ ماں نے کبھی ہمارا ہاتھ منہ نہیں دھلایا۔ مجھے یاد ہے وہ کبھی ہمیں رات کو دیکھنے نہیں آئی، ہم پر رضائیاں نہیں ڈالیں اور ہمیں کہانیاں نہیں سنائیں۔ وہ لوری گاسکتی ہے کہ نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ وہ جھڑک سکتی ہے، گالیاں دے سکتی ہے، مرد جاکر میری جان کیوں کھا رہے ہو، اپنے باپ سے کہو جا کر، یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے باوجود وہ ہماری ماں ہے کہ اس نے ہمیں جنم دیا ہے۔

اس شام بھی، جب وہ پتابی کے کمرے سے بڑبڑاتی نکلی تھی اور اس کی پیشانی پر ہل تھتے اور ہونٹ بچھنے ہوئے تھے، میں چپکے سے بوجھا کر کمرے میں چلا گیا تھا اور وہاں ایک کونے میں دبکا اس چوبیا کو دیکھ رہا تھا، جو چوکی کے پیچھے سے نکلی۔ دو گول گول سی آنکھوں سے خوفزدہ سی ادھر اُدھر دیکھتی اور تباہوں پر چھپتی اور تھوڑا سا کتر کر بھاگ جاتی۔ جیونیٹوں کی ایک قطار تباہوں سے دیوار تک پل رہی تھی۔ کبھی کبھی دو جیونیٹیاں ایک دوسری کے سامنے آجاتیں تو ایک ٹانہ بے لیے رکھتیں، شاید آپس میں باتیں کرتی ہوں: بیلو، کیا حال ہے؟ کدھر چلیں؟ اور پھر اپنی اپنی راہ پر بڑھ جاتیں۔ مجھے اس کونے میں بڑا سکون ملتا۔ گھر کی کبھی کبھی، سرد و بھل اور موت سی خاموشی اور زرد فضا سے وہ کونا کہیں اچھا تھا۔ میں دیوار

سے لگا بیٹھا چہ ہوا اور پیوٹیلوں کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ماں آگئی۔ آتے ہی اس کی نظر عجیب پر نہیں پڑی تھی جب وہ پٹی تو مجھے دیکھ سکی۔ پاک کرائس نے مجھے بازو سے اٹھالیا اور گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔

”بتا شے چرانے گیا تھا؟“

بہت پہلے کبھی میں نے یہ حرکت کی تھی اور ماں سے چاٹا کھا کر اور یہ سن کر کہ یہ پاپ ہے پھر کبھی ایسا نہیں کیا تھا، لیکن ماں — وہ ہمیشہ یہی شک کرتی ہے۔ اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں اور وہ بات کہنے سے پیشتر کبھی نہیں سوچتی اور پھر کبھی پشیمان بھی نہیں ہوتی۔ چوری کا الزام لگا کر وہ مجھے گھور رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ جواب دینا فضول ہے، وہ اعتبار تو کرے گی نہیں۔ میں خاموش رہا۔

”تم سب زکوٰۃ میں جاؤ گے۔ سب کے سب پاپی ہو۔“

اس پہل پتاجی چھڑی سنبھلے کمرے سے نکلے تھے۔ وہ ماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے رُکے۔

”جائز سیر کا حرج ہو گا۔“ ماں کے لہجے میں زہر تھا۔ ”کبھی سوچا ہے کہ کوئی گھر بھی ہے۔ بچے چوری کرنا سیکھ رہے ہیں۔“

”میں نے کچھ نہیں چرایا۔“ میں نے پتاجی سے کہا۔

”فیصلہ دینے والا جھگوان ہے، ہم نہیں، کہ وہ جانی جان ہے۔“

”او نہہ۔“ ماں نے جونٹ پچا کر نفرت اور نفصے کا اظہار کیا۔ ”دیکھ لینا وہ درو شا ہوگی سب کی یاد کرو گے۔ سات جنم دکھ بھوگو گے۔“ اور پھر مجھ

سے آجارا چڑھا جا کر۔ کیوں سب میری جان کے دشمن ہو رہے ہو؟
 اس لمحے میں نے ماں کے لیے سخت نفرت محسوس کی۔ کچھ دریاں بڑبڑاتی
 رہی پھر گھر پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں کتاب لے کر دیدی کے پاس جا بیٹھا۔
 وہ تنگ کر رہی تھی۔ میرا جی پڑھائی میں نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا جی
 کہاں گئے ہوں گے، ان کا کوئی دوست نہیں تھا، غلم کا شوق انہیں
 تھا، کوئی باپنی تھی نہیں پھر وہ آخر کرتے کیا ہیں۔ رات کو دیر سے سوئے نہیں۔
 تب ماں جا کر دروازہ کھولتی ہے اور وہی سالوں پرانا جملہ سنائی دیتا ہے:
 ”ہو گئی میری نچم۔“ اور وہ پتا جی کے پیچھے سٹیر حیاں چڑھ کر اوپر آ جاتی ہے۔
 اس وقت سب سو گئے ہوتے ہیں۔ میں جاگتا رہتا ہوں۔ کسی مرتبہ میں نے
 سوچا ہے کہ جا کر دروازہ کھولوں لیکن بہت نہیں ہوتی۔

اس شام بھی میں کچے سیبوں میں بھر اس کھوٹے میں گیا تھا۔ کنجوں
 سے زیادہ مجھے پاروٹی میں دلچسپی تھی۔ میں جانا چاہتا تھا کہ ماں ہر وقت
 اسے برا کیوں کہتی رہتی ہے اور وہ کیسے جا دو کرتی ہے۔ کھلتے کھلتے
 میرے پاؤں میں کاپنج کا ٹکڑا چھب گیا اور خون بہنے لگا۔ میں ماں کے ڈر سے
 رد بھی نہ سکا کہ وہ ایسے موقعوں پر ہاتھ سے بات کرتی تھی۔ تمام سچے
 میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ شاید کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خون کو کیسے دھو
 جائے۔ اسی وقت کھڑکی میں پاروٹی دکھائی دی۔

”کیا ہوا؟ وہ پوچھ رہی تھی۔“

”بہو کو چٹ لگی ہے، بہت خون نکلا ہے۔“

چند سیکنڈ بعد وہ میرا پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر اپنے مکان میں لے گئی۔ اس نے ردی سپرٹ میں ترکہ کے میرا زخم صاف کیا سپرٹ نے زخم میں مرچیں سی لگا دیں تو وہ جھک کر پھونک مارنے لگی۔
 ”مرد ہو کر انٹی سی چرٹ سے گھبراتا ہے۔“ وہ ہنسی پھیل کھڑا ہوا۔
 کچھ نہیں ہوا، ایسی چوٹیں تو روز لگتی ہیں۔“

یہ لہجہ، یہ ہمدردی، یہ اپنا پن میرے لیے بالکل نیا تھا، ماں ہوتی تو چاٹا مار کر پوچھتی: ”آنکھیں بند تھیں؟ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیا کرو۔“ اور پھر وہ دیدی سے کہتی: ”اری پٹی باندھ دے اس کے“ میں حیرت اور شوق سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اب وہ جادو کرے گی اور میں مینا بن جاؤں گا۔ دل کی گہرائیوں میں کہیں خوف رنگ رہا تھا: اس سانپ کی طرح جو نہ ہوتے ہوئے بھی اندھیرے میں محسوس ہوتا رہتا ہے۔
 ”کیا دیکھ رہا ہے رے؟“ وہ مسکراتی۔

”تم جادو سے مجھے ٹھیرنا دو گی۔“ میں نے ایک دم کہہ دیا۔

وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ ”اچھا! کس نے کہا تجھ سے؟“

میں چپ رہا۔ اور ایک دم مجھے ماں سے نفرت کا احساس ہوا اور نہ جانے کیوں میں نے سوچا کہ ماں سے بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع ہے میں لے دے لیجے میں کہا:
 ”ماں کہتی ہے۔“

پاروتی ایک دم خجیدہ ہو گئی، پھر ہنسنے لگی میرا خیال تھا وہ ماں سے

نصرت کا اظہار کرے گی، اُسے گالیاں دے گی اور اس طرح میرے جذبہ انتقام کی تسکین ہو سکے گی، لیکن میرے اس جذبے پر اس نے ہنس کر اس ڈال دی ہیں نے چچا! ”جادو کیسے کرتے ہیں؟“

”جادو کوئی چیز نہیں“ وہ زخم پر پٹی باندھتے ہوئے بولی: آدمی کو جادو سے نہیں محبت اور پیار سے جیتا جاتا ہے، اور جو محبت کر سکتے ہیں بھگوان ان سے خوش ہوتا ہے۔“

”پتا جی بھی یہی کہتے ہیں۔“

پادوقی نے میری طرف دیکھا اور سپرٹ کی شینٹی اٹھا کر لماری میں رکھنے چلی گئی۔ اس وقت باہر ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ شاید کسی نے ماں کو خبر کر دی تھی۔ میں بہم گیا۔ پادوقی میرے قریب آئی، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے بولی:

”تمھاری ماما جی ہیں؟“

میں نے خوف زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پل تو میں نے سوچا کہ پادوقی مجھے جادو سے ٹھیکرنا ہی دے اور ماں دیکھ کر چلی جائے۔

”جو ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔“ وہ بولی ”آؤ۔“ اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

ماں نے مجھے گھور کر دیکھا اور یوں میرا ہاتھ چھٹ لیا جیسے میں اڑا سا رہا تھا۔

”اسے کپڑے چھڑ گیا ہے، میں نے زخم دھو دیا ہے، گھر جا کر عکبر لگا دیجیے گا۔
گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

”بتا ہے۔“ ماں نے سختی سے کہا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئی۔ اُمیر سچ کر
اس نے مجھے پتاجی کے سامنے کھڑا کر دیا اور غصے سے بولی:

”دیکھ اپنے لاڈلے کے کمرے کو۔ پتہ چھوڑ دے کہاں گیا تھا۔“

پتاجی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکایا۔

”میری تو اس گھر میں کوئی سناتا ہی نہیں، جو میں کتنی ہوں وہی نہیں جوتا۔“
پھر وہ تجنجنی طور پر بولی: ”بول، کہاں گیا تھا؟“
”کھیلنے۔“

”کھیلنے کے بچے میں پوچھتی ہوں تو اس کا مرنے کے گھر کیا کرنے گیا تھا۔“
”وہ آپنی لے گئی تھی۔“ میں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

”دیکھ لیا۔“ ماں نے پتاجی کی طرف دیکھا ”میں کہے دیتی ہوں اس کا نتیجہ
اچھا نہیں ہوگا۔ لے گئی تھی رائڈ مرہم پی کر نے۔ ماں سے سلی پیچھے کٹنی کجری
کوئی جادو لٹہ کرے گی میرے بچے پر۔ اپنا کوئی آگے پیچھے ہے نہیں۔ دو مشن
کے دیکھ نہیں سکتی۔ میری تو چھینال جنم جنم کی بیر ہے۔ نہ جانے میں نے اس
کا کیا بگاڑا ہے ہے جگوان مرنے بھی نہیں، بٹی کٹی پھر رہی ہے، اسے آنے
کسی کی آئی۔“

پتاجی سر لٹکائے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کا ہاتھ کمرے کے بازو پر رکھا
پکپکا رہا تھا، ٹانگیں لرز رہی تھیں اور پنچلا ہونٹ انھوں نے زور سے دائرے

کے دیا یا تھا۔ ماں کا عقد ایک دم اور بھی تیز ہو گیا۔ اس نے اندر سے میری پٹری پر دو تھپر جمایا اور لات مار کر بولی:

”اب وہاں گیا تو تانگیں توڑ دوں گی۔ سمجھا! اور وہ مجھے گسیلنی باہر لے گئی۔“
”آج تجھے کھانا نہیں ملے گا۔“

اس رات بھی پتاجی دیوے لوٹے جب ماں تھک کر اپنے بستر پر چڑھی تو وہ میرے پاس آئے۔ جھوک کی وجہ سے مجھے غیند نہیں آرہی تھی۔ پتاجی ایک منٹ کھڑے اندھیرے میں مجھے دیکھتے رہے، پھر انھوں نے میرے سر ہانے ایک پکیٹ رکھ دیا اور پہلے گئے۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹل کر پکیٹ کھولا۔ اس میں سینڈویچز پیسٹریاں اور بند پٹخا۔ میں ایک منٹ تک ہاتھ سے وہ چیزیں محسوس کرتا لیٹا رہا پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں محسوس کیا کہ میں پتاجی سے بے حد محبت کرتا ہوں، میں اس شخص کے اندر دیکھ رہا ہوں جو میرے سامنے بھی نہیں۔ میں اندھیرے میں لیٹا لیٹا کھاتا رہا پھر میں سو گیا۔

صبح اس پکیٹ کی وجہ سے ماں اور پتاجی میں لڑائی ہوئی پتاجی نے صرٹ اٹھا کہا کہ وہ بچوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتے۔ ماں اور بھی بھڑک اٹھی اور جوجی میں آیا کہ کئی پتاجی حسب معمول خاموش رہے۔

”تم پہلے سو میری گھر میں کوئی عزت نہ رہے۔ میرے بچوں کو میرے خلاف اکساتے ہو، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں کہتی ہوں تم اس کے خلاف ہو جاتے ہو۔ پہلی جاؤں گھر چھوڑ کے، پر یاد رکھو اتنی آسانی سے میں بھی نہیں جانے والی۔“

اور پھر وہی روزنا دھونا اور ٹھنڈا چر لہا اور موت کی سی سرداؤں سے
 فضا۔ اس روز پتا جی مجھے اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا
 کہ انہوں نے اپنے ساتھ کسی بچے کو لیا تھا، ورنہ ہم میں سے کسی کو معلوم
 ہی نہ تھا کہ باپ کی انگلی کچھ کر بازاروں میں سے گزرنا اور کھولوں اور پٹاریوں
 کے لیے بند کرنا کیا ہوتا ہے۔ پتا جی کی انگلی تھامے بازاروں میں سے گزرنا اور
 لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا بڑا اچھا لگا کہ اس میں ایک طرح کی حفاظت اور
 بڑے پن کا احساس تھا اور ان تمام چیزوں اور مناظر کے معنی بدل گئے تھے جو
 میں نے سکول سے آتے جاتے دیکھے تھے۔ اب ان میں وہ اجنبیت
 اور اکیلا پن اور کھردرا پن نہیں رہا تھا جو دل کو اذیت پہنچاتا تھا اور قریب
 کی چیزوں کو بھی بہت دور کرتا تھا اور بھرے شہر میں اکیلا چھوڑ جاتا تھا۔ ہم منڈ
 میں جا بیٹھے۔ میں تالاب میں مچھلیوں کو دیکھ رہا تھا اور پتا جی کی آنکھیں منڈ
 کے کلس پر جم چکی تھیں۔ دھوپ پر نقیبیں میرا مچھلیوں کے ساتھ تیرنے اور پانی
 میں غوطہ لگانے کو کر رہا تھا۔ لوگ منڈ میں آ جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں
 میں مچھول اور پرشاد تھا۔

”تم پاروتی کے ہاں کیوں گئے تھے؟“ اچانک انہوں نے پوچھا، ایک
 مچھلی سطح پر تیرتے پھول کو سونگہ کر پانی میں غوطہ لگا گئی تھی۔

”پتا جی پاروتی بری عورت ہے؟“

”وہ دیکھو مچھول۔ کوئی تم سے پوچھے تو تم خدا کہہ سکتے ہو کہ یہ پھول
 ہے۔ لیکن یہ تو تم نہیں بتا سکتے کہ پانی کے اندر تالاب کی تہ میں کیا ہے اور

سندر کی تہہ میں کہتا ہے۔ یہ تو تم بالکل نہیں بتا سکو گے کیوں کہ تم نے وہاں سندر دیکھا نہیں۔ اور جو سن کر سیکھتے ہیں وہ پوری طرح نہیں سیکھتے اور جو خود تلاش کرتے ہیں اور ڈوب کر پتا کتے ہیں وہ پوری طرح سیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مجھے اس وقت پتا بھی کی بات سمجھ نہیں آ سکتی لیکن ابھی لگی تھی ان کی بھاری گھمبیر آنکھوں میں کچھ سوچ رہی تھی اور اس وحوش کی طرح اچھی لگ رہی تھی جو سردیوں میں سرسوں کے کھیتوں پر چلتی ہے اور بدن کو میٹھی میٹھی گرمی دیتی ہے۔ پتا بھی وہاں سندر میں بیٹھے اس شیشے کی طرح لگ رہے تھے جس کے آ پار دیکھا جا سکتا ہے اور اس شخص سے بالکل مختلف تھے جو آرام کر رہی ہیں نیم دراز حشر پتیا تھا اور کوئی تعلق کسی سے نہیں رکھتا تھا۔ پتا بھی نے کہا کہ میں سندر میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔ میں اندر جہاں مرنیوں تھیں، چلا گیا۔ بڑی بڑی، سونے چاندی اور پھولوں سے ڈھکی مورتیوں اور چاندی کی چھت واسے کمرے اور سونے کی طرح چمکنے ستونوں کو دیکھ کر بڑا اچھا لگا اور میں نے ہانڈہ جوڑ کر آنکھیں موند لیں اور پراختہ ناک کی کہاں پتا ہی سے لڑنا اور پاروتی کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ (جو منظور نہیں ہوئی)۔ دعا مانگ کر میں باہر آ گیا۔ پتا بھی تالاب میں پھیلیوں کو آٹا ڈال رہے تھے، جو بڑی تعداد میں سطح پر آگئی تھیں۔

”چلیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

ہم سندر کی حدود سے نکل آئے۔ کچھ چروں کو کھلو نے اور مٹھانی لیتے دیکھ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کچھ لینا پسند کروں گا۔ میں نے

انکار کر دیا۔ پھر میں نے انہیں اپنی بہار تھنا کے بارے میں بتایا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے:

”ہاں، ماں کے لیے دعا کیا کرو۔“

”پتا جی، ماں آپ سے لڑتی کیوں ہے؟“

”اُس کا اس میں کوئی قصور نہیں۔“

”پھر کس کا قصور ہے؟“

”شاید اس میں کسی کا بھی نہیں۔“

”پتا جی، میری کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کو بُرمت، کہو کسی کا دل مت دکھاؤ اور کسی سے لڑو نہیں، سب سے محبت کرو!“

”ہاں، کتابوں میں یہی لکھا ہے!“

پھر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ پتا جی کسے چہرے پر وہی غم اور اداسی کی سیاہ چھائیاں تیر رہی ہیں اور وہی پتھر پلا پن سارے جسم پر چھا گیا ہے اور وہ ایک دم بہنئی غیر اور غور ہو گئے ہیں۔

پاروتی کئی دن کھڑکی میں دکھائی نہیں دی۔ مہین کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ پھر ایک شام گوگی سے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اور اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، لیکن ماں کا ڈر تھا۔ وہ ٹانگیں توڑ دے گی۔ میں نے ایک شام پتا جی کے ساتھ سیر کرتے ہوئے کہا:

”پتا جی، پاروتی کو بخدا آ رہا ہے۔“

وہ دورانی پر پھیلی درختوں کی سیاہ قوس کو دیکھ رہے تھے۔ میری بات سن کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی انگلیوں میں لرزہ محسوس کیا اور ان کے چہرے پر جیسے کچھ ٹپھل رہا تھا۔ وہ پھر درختوں کی اس قوس کو دیکھنے لگے۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ واپسی پر ہم مندر گئے۔ پتا جی نے باہر سے آٹا لیا اور پھلیوں کو گویاں بنا بنا کر ڈالنے لگے اور میں اندر چلا گیا جب میں باہر آیا تو پتا جی مندر کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ کہا نہیں۔

میں نے جھگوان سے کہا ہے کہ وہ پاروتی کو جلدی سے اچھا کر دے۔ پتا جی خاموش رہے، صرف ان کے ہاتھوں کا دباؤ میرے شانے پر قدرے بڑھ گیا اور وہ جیسے ٹپھل ٹپھل کر میرے وجود میں سرایت کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

”پتا جی، آپ مندر میں کیوں نہیں جلتے؟“

”بڑا ہو کر آدمی سچا نہیں رہتا۔ اسے ڈر لگنے لگتا ہے۔“

”جھگوان سے؟“

”نہیں، اپنی کمزوریوں اور گناہوں سے کہ وہ جو دکھائی نہیں دیتا اب کچھ دیکھتا ہے۔“

”پاپ کیا ہوتا ہے پتا جی؟ ماں کہتی ہے بتا دے اٹھا کر کھانے سے“

پاپ لگتا ہے اور نرک میں جاتا ہے۔“

”پاپ“ ہے جو تم ٹھیک سمجھتے ہوئے بھی نہ کرو۔ اور جن میں صحیح قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ پاپی ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ترک ہو گئے ہیں اور کبھی رہتے ہیں۔

دوسرے دن شام کو میں پاروقی کے ہاں چلا گیا۔ ماں کی ناراضگی کا ڈر ایک لمحے کے لیے سانپ کی طرح بھینکا رہا تھا لیکن میں نے اس کا سر کھل دیا۔ پاروقی کے کمرے میں زرد اور دھم روشنی والی لائٹیں جل رہی تھیں جس سے کمرے کی اداسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پاروقی دیوار کے ساتھ چارپائی پر کھل بیٹھے پڑی تھی اس کا چہرہ زرد، ہونٹ خشک اور بال کھرسے سے پھٹے، سر کھلی گھاس کی طرح اُٹھے ہوئے۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر پکارا ”بچہ!“

میں اس کے قریب چلا گیا اور بستر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پاروقی نے کھل سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے بستر پر بٹھا لیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ میں پاروقی کے وجود کا ایک حصہ ہوں اور وہ بے چینی، وہ عیش و عشرت، میری موت میں تھی اس کے چھو دینے سے ایک دم دور ہو گئی ہے اور اندر اندر باہر ایک خوشگوار سکون اور توازن ہو گیا ہے۔

”کل میں نے مندر میں پراگتنا کی تھی کہ تم جلد ہی سے اچھی ہو جاؤ۔“
”کیوں؟“

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے میں خاموش بیٹھا رہا

اور اس کی نرم انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کرتا رہا۔ اس نے شاید اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی تھی:

”تھھاری ماما جی کو معلوم ہو گیا تو؟“

”نہیں معلوم ہو گا۔ چاچا جی ماں سے کبھی نہیں کہیں گے۔ ماں ان سے شرمی ہے۔ پہلے چاچا جی کسی کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ اب صرف مجھے ساتھ لے جاتے ہیں اور ڈری اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے ڈر لگتا تھا، اب نہیں لگتا۔ وہ باہر جا کر باتیں کرتے ہیں، گھر میں بالکل نہیں بولتے۔“

”کیا باتیں کرتے ہیں؟“

مجھے پوری طرح ان کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آتی تھیں اور جو سمجھ آیا تھا شاید اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس لیے میں پھر چپ ہو گیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں خاموشی رہی پھر میں نے کہا:

”ماں کہتی ہے تم بہت بری ہو اور ہماری دشمن بھی۔“

وہ چھت کو دیکھتی ہوئی ہنس دی۔ پھر بولی:

”پھر یہاں تم کیوں آئے ہو؟“

”مجھے تم اچھی لگتے ہو؟“

پاروتی نے مجھے سینے لگا لیا۔ کئی منٹ اس طرح گزر گئے پھر اس نے وہی بات کہی جو چاچا جی نے کہی تھی اور میں جبراً برا تھا کہ دونوں نے ایک ہی طرح کیسے سوچا تھا۔

”تم نے میرے لیے برا تھا کیا ہے نا! اں کے لیے بھی کرنا؟“

پھر وہ میرے سکول اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگی اور یہ کہ میں
 پڑھ کر گیا ہوں گا اور کیسے رہوں گا۔ اتنی دلچسپی سے نہ ماں نے کبھی پوچھا
 تھا اور نہ پتا ہی تھا اور نہ مجھے ہی معلوم تھا کہ مستقبل میں مجھے کیا کرنا ہے۔
 اس روز پاروتی کی دوا لینے میں گیا۔ واپسی پر ماں نے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا
 بھی دعا کس کی ہے لیکن میں جواب دے بیڑ بھاگ آیا اور دوا پاروتی کو دے
 کر گھر چلا گیا۔ ماں اس وقت پتا ہی کے سامنے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور
 تھانڈی لڑوں کی طرح بول رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ پاروتی کا اور میرا نام
 بھی لیا تھا۔ اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری ذکر کر رہی ہے۔ میں چپ
 چاپ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا کہ ماں نے دیکھ لیا اور ایک کونجے
 گردن سے ابوجھ لیا۔

”جا کہاں رہا ہے، ادھر آ۔“ وہ مجھے گھسیٹ کر پتا ہی کے سامنے لے آئی۔
 ”جا اسے جان سے مار دے، مجھ سے کیا کہتی ہے۔ میں کیا کروں؟“ پتا ہی
 نے نہایت لالعلقی اور بے رازداری سے کہا:

”جان سے تو تم مجھے مارو گے۔“ ماں پھینکاری تا سے اور سر چڑھائی اور ساتھ
 سے لیے پھرو۔ خوب میرے خلاف سکھاؤ تھیں مگر یہی اس دن آئے گا۔
 جب میری اڑتی اٹھ گئی۔ اتنے اتنے تجھ سے میری بے عزتی کرتے ہو۔
 ماں آنکھوں پر تہ رکھ کر رونے لگی۔ دیدی اور بھتیجا بھی آگئے اور دروازے میں
 کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگے۔

”کیوں گیا تھا وہاں؟“ پتا ہی نے کوک کر پوچھا۔ میں سہم گیا۔ پہلی مرتبہ وہ

اس طرح کٹ کے تھے ان کے نختے پھول رہے تھے اور ہونٹ پکپکا رہے تھے اور سپرہ دھک رہا تھا۔ انھوں نے پورے اندر کا تھپڑ میری گال پر بٹوایا۔ میں لڑکھڑایا۔ کون لگتی ہے وہ تیری؟ کیوں گیا تھا وہاں؟ پتا جی نے حق کی لئے نکال لی تھی اور دھڑا دھڑکھڑا کر مجھ پر برسانے لگے تھے اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے: "کون لگتی ہے وہ تیری؟" وہ مجھے اس وقت تک مارتے رہے جب تک کہ نے ٹوٹ نہیں گئی۔ ماں نے رونا بند کر دیا تھا اور دہشت زدہ سی میٹھی مجھے تنکے جا رہی تھی۔ پتا جی نے پھینک کر تنکے ٹوٹے سے کرسی پر گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ تھا۔ زکیوں مجھے ان پر بے اختیار پار آگیا اور ماں پر شدید غصہ۔

"کتنی بے دردی سے مارا ہے بچے کو۔" ماں دیوار سے لگی کھڑکی کو رہی تھی۔ اس رانڈ سے پوچھو جا کر جو میرے پیچھے پڑی ہے۔ اس کے تن بدن میں کیڑے پڑیں۔ سات جنم اندھی ہو۔"

"بکواس بند کرو۔" پتا جی چیخے۔

پہلی مرتبہ میں نے انہیں گھر میں اس طرح بولتے سنا تھا۔ ایک دم ماں خاموش ہو گئی تھی اور گھر پر سناٹا چھا گیا تھا۔ مجھے خرابی ہوئی تھی کہ وہ اس طرح کہے تھے میں پریشانی تمام خود کو سنبھالنا تھا بستر پر جا کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ پتا جی کوٹ پہن کر جب چلے گئے تو ماں دیر تک پاروتی کو کوستی رہی میں بستر پر پڑا رہا۔ میرا تمام بدن ڈکھ رہا تھا اور جل رہا تھا اور میں چاہ کر بھی نہیں رو پا رہا تھا، جیسے آئسو خٹک ہو گئے ہوں۔

اس رات پتاچی بہت دیر سے سوئے۔ درحقیقت ان کے قدموں کی آواز کمرے میں سنائی دیتی تھی، جیسے وہ جلدی جلدی چکر لگا رہے ہوں گے۔ پتاچا سناٹا چھایا تھا۔ ماں اس وقت میانی میں جا سوئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ پھر وہ بھاری قدم مجھے اپنی طرف آتے محسوس ہوئے۔ میں دم سادے پڑا رہا۔ میں نے بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیا کہ پتاچی مجھ پر جھکے کھڑے ہیں اور غور سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے میرے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجھے لگا کہ وہ جلن۔ وہ دروان کی انگلیوں نے باہر کھینچ لیا ہے اور میں بھلا چنگا اور پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہوں۔ وہ آنسو جو خشک ہو گئے تھے آپ سے آپ میری آنکھوں میں آ گئے اور گالوں پر سے گردن پر بہنے لگے۔ میں آنکھیں نہیں کھول سکا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پتاچی کا چہرہ اترتا ہوا اور اس ہے اور میں اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا۔ پھر وہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور اس رات بھوک کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔

کئی دن میں سکول نہیں گیا، کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ان دنوں ماں پتاچی سے لڑی بھی نہیں لیکن فضا زیادہ بوجھل اور سرد سی رہی۔ مجھے یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ پارو کی کیسی ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ پتاچی ان دنوں اور بھی دور ہو گئے تھے۔ وہ سر ہلکائے خاموش بیٹھے تھے۔ پتھر جیسے رہتے رہتے تھے۔ وہ دور سے مجھے دیکھ کر چلے جاتے۔ پھر جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ میرے لئے گئے

اور میں بھول گیا کہ انھوں نے مجھے مارا تھا۔ نہر کی پٹری پر خشک، بھورے پتوں پر چلتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "بیرونی مار سے اندر کی مار زیادہ خطرناک ہوتی ہے؛ وہ مارجن میرا رہتا ہے۔ یہ مار تم نے برداشت کرنی، جنمیر کے خلاف کچھ نہ کرنا کہ اس کی مار برداشت نہیں کر سکو گے!"

سکول کے سال ختم ہوتے گئے اور میں پاروقی سے بے دھڑک ملنے لگا۔ اس کے بالوں میں سفید تار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اب بھی بال کھلے رکھتی تھی۔ میں نے اس سے ایک آدھ مرتبہ پوچھا بھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے، لیکن اس نے کبھی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہنس کر کہتی:

"پہلو، تو یہ سب کچھ کیوں پوچھتا ہے؟"

"مجھے اب پرمیت کہا کرو۔"

"کیوں رے؟ تو کیا بدل گیا ہے؟"

"ہاں، اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

"ہو گیا ہو گا اپنے لیے، میرے لیے تو وہی پہرے ہو کہیں کچھ جانے

سے رو دیا تھا۔"

اور ہماری باتیں اس طرح بھٹک جاتیں اور میرا وہ سوال سوال ہی رہ جاتا۔ ماں اب زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ دیدی کی شادی ہو گئی تھی اور بھیا برٹل میں چلا گیا تھا۔ ماں جیسے خشک گئی تھی لیکن پتا جی کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہی طویل سیر اور گھر میں آرام کرسی پر بیٹھ کر حقہ گراگڑاتا۔ میں کالج پہنچ گیا تھا۔ اب پتا جی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ آئے لیکن نفیس تو انھوں

نے بات کرنا کم کر دیا تھا۔ میری زندگی بھی گھر کی چار دیواری سے باہر پھیلی وسیع دنیا میں غوطے لگا رہی تھی اور سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز ہر شے کے معنی بدل رہے تھے، روپ بدل رہے تھے۔ باہر سے تو وہی روپ تھا لیکن اندر سے کچھ اور نظر آنے لگا تھا۔ اور تجھی مجھے کالج کی فضاؤں میں مالا ملی تھی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور وہ جانے کیسے پارٹی نے میرے بتائے بغیر یہ جان لیا تھا کہ میرے سینوں میں ایک راک کی آہی ہے۔

”بتانا کیوں نہیں رہے۔ کون ہے وہ؟“

”کوئی نہیں۔“ میں شرما جاتا۔

”راکیوں کی طرح شرما رہا ہے۔ مجھ سے بھی چھپائے گا۔“

”میرے ساتھ ٹپھتی ہے۔“ اور میں نے اس رات لائٹن کی زندگیوں میں ساری رات کھٹا اسے سنا دی تھی۔ وہ نہایت اہٹاک اور ڈپٹی سے سنتی رہی تھی اور پھر چپ رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا:

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”ہیں! وہ چونکی پھر لولی، کچھ نہیں، کچھ نہیں کیسی لگتی ہے؟ مجھ سے ملوئے گا نہیں؟ بلا لا کسی دن!“

پھر ہم تینوں ایک باغ میں ملے۔ پاروٹی بڑی ہچکچاہٹ کے بعد باغ میں چلنے کو راضی ہوئی تھی۔ صرف میرے لیے۔ پاروٹی مالا سے اس طرح ملی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو۔ وہ خوب گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ کچھ درمے کے لیے تو میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کرنے لگا رہا تھا مالا نے مجھ سے

باتیں کرے، میری طرف متوجہ ہو لیکن وہ پاروتی میں ہی ڈوب گئی تھی۔ بعد میں مالا نے مجھے بتایا کہ اسے پاروتی بہت اچھی لگی تھی۔

اچانک میرے اور مالا کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی اور میں پریشان رہنے لگا۔ یہ پریشانی پاروتی سے جھپٹی نہیں رہ سکی۔ ایک دن وہ بولی:

”تو نے مالا سے شادی کی بات کی؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ براہمن ہیں اور ہم کھتری۔ میرے ماں باپ....“

پاروتی کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ وہاں عجیب سا پتھر بلا پن آگیا اور وہ خالی خالی سا لگنے لگا۔ پھر بولی:

”جب تم پہلی بار اس سے ملے تھے تو کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ براہمن ہے اور تم کھتری؟“

”معلوم تھا۔“

”اور تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ تمہارے ماں باپ اس شادی پر رضامند نہیں ہوں گے اور....“

”نہیں۔ میں نے جرم کے سے احساس سے کہا۔“

”پھر تم اسے ملتے کیوں رہے؟“

”میں نے سر ہٹا لیا۔“

”لو، تم اس سے کیوں ملتے رہے؟“ پاروتی کے بچے میں سختی اور غصہ تھا

تم اسے دھوکا دیتے رہے۔ تم کیا سمجھتے تھے کہ عورت ہے، چھوڑ دو گے تو وہ دھوکہ خواہش ہو جائے گی۔ ثمرم آنا چاہیے ایسی سیکھا ہے، جب تم میں اتنی بھی محبت نہیں تھی تو اس بے چاری سے یہ کھیل کیوں کھیلا؟ اسے یہ جیون بھکی اس کیوں بندھانی؟ تم عورت کے دل کو نہیں جانتے۔ تم اس کے چہرے، اس کے ہاتھ پیر، اس کے سر پر کو عورت سمجھتے ہو تھیں نہیں معلوم عورت کی زندگی میں محبت کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

”لیکن اس کے ماں باپ۔“

”تم نے اس سے بات کی ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا، مجھ سے جھوٹ مت کہنا، میں سب جانتی ہوں۔ میں اس کے ماں باپ سے بات کر سکتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ اجازت دے دیں گے۔“

”لیکن.....“

”اپنی کمزوری کو اس کی کمزوری نہ کہو۔“ پاروتی تجھ جیلا کر بولی۔ لڑکیاں کسی حد تک ڈر پوک ضرور ہوتی ہیں لیکن جب انہیں کسی کے اٹوٹ، پریم کا سہارا مل جائے تو وہ پٹاڑے سے بھی ٹکرا سکتی ہیں جب تم نے مالا سے محبت کی ہے تو اس سے شادی کرنے میں کیا حرج ہے۔ ذات پات کا شریا اور آتما سے کیا سمبندھ؟ تم نہیں جانتے عورت شادی کے بناء۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی، پھر بولی: ”تم اپنے چاہی سے بات کرو، وہ اجازت دے دیں گے۔“

یہ بات پاروتی نے اتنے وثوق سے کہی تھی جیسے وہ چاہی سے بات کر چکی ہو۔ اس کے بعد میں کئی دن پاروتی سے نہیں ملا جان بوجھ کر نہیں گیا۔

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور پاروتی مالا سے مل چکی تھی۔ اس کے سر پر نہ جانے کیوں یہ سوار تھا کہ میں مالا سے شادی کروں۔

کچھ دن بعد اس سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ لیٹر پر بٹری تھی۔ پہلا سوال جو اس نے مجھ سے کیا وہ مالا کے بارے میں تھا میں نے اُسے بتایا کہ میں پتاجی سے بات نہیں کر سکا۔ وہ بہت بھنجھلائی اور پھر جب تک میں بیٹھا رہا اکٹھری اکٹھری سی باتیں کرتا رہا۔

جس دن اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اسے ہسپتال لے گئے پتاجی بڑے پریشان سے اپنے کمرے میں تیز تیز سے چکر لگاتے رہے۔ وہ چٹھری لے کر ایک مرتبہ سٹیرھیوں تک گئے، پھر لوٹ کر کرسی پر جا بیٹھے اور حقہ پیتے رہے۔

دوسرے دن پاروتی نے پرانے تیگ دیئے۔ اس وقت میں اور مالا اس کے پاس تھے۔ پاروتی کے سینے میں سخت درد تھا اس کے باوجود وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو ڈاکٹر نے اسے منع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مر گئی۔ اس کی (DEATH REPORT) میں ڈبل نمبر لکھا تھا۔

پاروتی کے بھول ہیں نے پرواہ کیے اور اب اس کی یاد باقی ہے گھاٹ سدا ان ہے اور وہ ذرا فاصلے پر چلتی ہوئی زرد روشنی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے۔ لیکن وہ مسلاخوں والی کٹھن اب بند ہوگئی۔ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاید مجھ کو کیدار ہے۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔

مجھ کو کیدار نہیں، پتاجی ہیں۔ وہ منہ نہ بہتے پانی اور اس پر چھلپاتی دشمن

کو دیکھ رہے ہیں۔ اور میں ان کے دل کی گہرائیوں میں دیکھ رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سامنے ایک ایسا سانپ ہے جس کا تار ٹوٹ گیا ہے۔



سہیو!

میٹھا کرٹوا جھوٹ

مجید جب ٹرین سے اترتا تو اس وقت صبح کے سات بج چکے تھے، لیکن سورج روپوش تھا، اس لئے اپنے درخشاں چہرے پر گہرے کبرے کی نقاب ڈال رکھی تھی۔ ریخ پڑ رہی تھی۔ رات میں جھل جھل برقی ہوا چل رہی تھی چار باغ جیسے بڑے اسٹیشن پر، جہاں ہر ٹرین کی آمد و روانگی کے وقت ایک میلہ سالگ جاتا ہے، مجید نے ایک عجیب طرح کا سناٹا پایا۔ اسٹیشن کیا تھا، جیسے لڑکی کی رخصتی کے بعد رات اتارنے والا گھر۔ بس پانچ سات کئی دکھائی دیئے وہ بھی منہ پیٹے ہوئے، پالا مارے پودوں کی طرح سکڑے سکڑائے۔ مجید کی اس سفر پر روانگی کے وقت بھی موسم کی یہ کیفیت لکھنؤ پر طاری تھی۔ پھر اس وقت عام طور پر ٹھنڈک کا یہ اثر نہ تھا۔ غالباً اس لیے کہ شروع شروع کا معاملہ تھا، لوگوں میں قوت برداشت زیادہ تھی۔ اب تو شاید ہر ایک کا خون جھنہ لگا تھا۔

رات کو ٹرین پر مجید نے اس سردی کو بری طرح محسوس کیا تھا۔ اس نے برقعہ پر اپنا خاصا موٹا روئی دار گدا بچھایا تھا، دود وکیل اوڑھے تھے، پھر ان پر اپنا اوپر کوٹ بھی ڈال لیا تھا۔ سوتے وقت نرا روئی قمیض اتاری تھی اور

داپنا سوئٹر۔ پھر بھی ٹھنڈک کی وجہ سے وہ گھٹری ہی بنا رہا۔ اس کا بار بار جی چاہ رہا تھا کہ وہ حمیدہ کی چپتی چادر لٹپی سے نکال کر سم میں پیٹ لے، مگر اس نے سردی کھائی، آرام کی غیند نہ سویا، مگر اس نے حمیدہ کی شال نہ نکال، ڈر تھا کہ اوڑھنے پٹینے میں کہیں نلی دل نہ جائے۔

بہت ہی عزیز تھی یہ چادر حمیدہ کو۔ اسی اپریل کے مشاعرے میں حمیدہ سری نگر بلا یا گیا تھا۔ وہیں سے یہ شال، شہر کی ساری دوکانیں چھان کر وہ حمیدہ کے لیے لایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی سب سے بڑی تمنا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسی شال ہو جو ہم چشموں میں کسی کے پاس نہ نکلے۔ جو بندہ یا بندہ۔ حمیدہ کو ایک ایسی ہی چادر دستیاب بھی ہو گئی تھی جو کچھ حاشیوں پر خاتمہ، نازک اور باریک کام کہ صنایع کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہے نہ چاہے حصہ پر کشمیر کے سارے بچوں کھلے ہوئے۔ گلاب دلالہ بھٹہ ونگس، سیلوتی اور جوہی، کنول اور کونہ۔ اوڑھنے والی کی پشت و شانہ پر گویا پہاڑ آئی ہوئی تھیں کا نظر دکھائیں گے۔

کشمیر سے واپسی میں چٹان کوٹ سے کھنڈ تک سیلینگ برتھر پر لیٹے بیٹے حمیدہ نے نہ جانے کتنے ہی حسین خواب جاگتے ہی ہیں دیکھے تھے۔ کتنی خوش ہوئی حمیدہ! اس کے گندنی گلوں میں کس طرح خون چھلک آئے گا۔ شافوں پر چادر پڑنے ہی وہ کیونکر شاخ گل کی طرح لچکے گی، اس کے گلاب کی پکھڑی جیسے لب کس طرح پھریں گے، اس کے آب دار و رنداں کیسے جھلکیں گے وہ کس طرح اٹھلا اٹھلا کر چلے گی۔ اس کی کمر اور کوٹھوں میں کیسے کیسے لٹ بابل

پڑیں گے اور وہ اس نادر تحفہ پر شوہر کا آنکھوں ہی آنکھوں میں کس پیارے انداز سے شکر یہ ادا کرے گی اور شکر یہ ادا کرتے کرتے کچھ سوچ کر غور بخود شرمایا بھی جائے گی۔

اور جب وہ لکھنؤ پہنچا تھا اور اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوٹ کیس سے نکال کر وہ چادر حمیدہ کے کندھوں پر ڈال دی تھی، تو اس کے یہ سارے خواب ہیچ نکلے تھے۔ وہ بوکھلائی بھی تھی، وہ مسکرائی بھی تھی، وہ کھلکھلائی بھی تھی، وہ چپک بھی اٹھی تھی اور اس نے حمیدہ کو پیار اور محبت کے انعامات سے مالا مال بھی کر دیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس چادر نے حمیدہ کی نظر میں ایک نوبہ نوحہ کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس نے اسے سینت کر شیشے کی الماری میں رکھا اور اس میں ایک مضبوط قفل ڈال دیا۔ یہ الماری کنوئس کے دل کی طرح ہمیشہ بند رہتی صرف اس کے شیشے دل میں دو دفعہ باہر سے جھاڑ دیے جاتے تھے۔ یہ خاص اوقات تھے گویا اس کی زیارت کے لیے۔ وہ مغل بادشاہوں کی طرح جھروکے میں بیٹھ کر درشن دیتی۔ اور حمیدہ رعایا پر دیا کی طرح پر نام کر لینا ہی اپنا سجاوٹ سمجھتی۔ ہمسائیاں، اعزہ، عورتیں وہی جن کی ایسی نادر چیز کی محرومی ملکیت میں حمیدہ کی ساری عظمت اور شان تھی انھیں بھی اس کی یونہی شیشے میں بند جھلک دکھائی جاتی۔ کیا مجال کہ کوئی اسے ہاتھ لگا سکے۔ کبھی کبھی حمیدہ نے ٹوک بھی دیا تھا کہ شال چادر اوڑھنے کی چیز ہے، پرستش کی نہیں، اوڑھنی نہیں ہو تو ہر مہینے میں ایک آدھ بار اسے دھوپ ہی دکھا

دو۔ اونی کپڑا ہے کہیں کیڑے نہ لگ جائیں۔

حمیدہ چڑ کر کہتی۔ "ارے کیسے بد شگون کی کے الفاظ اپنے منہ سے نکال رہے ہو۔ میں روز اسے دیکھتی بھالتی رہتی ہوں۔ نگوڑے کیڑوں کی کیا مجال جو میری شال کے اس پاس بھی پھٹک سکیں!"

مجید کہتا۔ "اچھا تو یہی کرو کہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اُسے باہر نکال کر اپنے پہلو میں رکھ لیا کرو۔ معلوم ہو گا بہار سے لہلہاتے باغ میں بیٹھی ہو۔" وہ کہتی۔ "آپ دیکھتے نہیں، کیسی موٹی آنکھیاں چل رہی ہیں۔ گرد چلو کے بھیلوں میں گھس کر اسے میلا کر دے گی، بس اب اسے تو میں اسی دن نکالوں گی جس دن جاڑوں میں اسے اوڑھ کر اپنے منہ کی برات لے کر چاندی بہو گھر لانے جاؤں گی! اور وہ تین برس کے کھلونوں سے کھلتے ہوئے منہ کو گود میں اٹھا کر اتنا چومتی اتنا چومتی کہ وہ لبوہ لگتا اور مجید کا جی چاہنے لگتا کہ وہ دونوں غنچہ دہنوں کی آغوش میں سمیٹ کر ایک ساتھ کچھ میں بھر کر حمیدہ کی اس چادر پر فریفتگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حمیدہ اس سے کچھ کچھ چلنے سا لگا تھا۔ اس کو یہ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ حمیدہ کی محبت میں بیٹابی نہیں شریک بن گیا ہے بلکہ یہ شال بھی اس میں حصہ لگانے لگی ہے۔ وہ شال کیا لایا، اس نے اپنے لیے ایک رقیب اپنے ہاتھوں میں پہنچایا۔ غرض شال کی پوجا جاری رہی، گرمیاں بھی گزریں، برسات بھی گزری، جاڑے کا موسم بھی آیا، مگر شال نے اپنی جگہ چھوڑی۔

لیکن مجید کے تعجب کی انتہا نہ رہی دو دن پہلے — اس روز جب وہ

اس کڑا سکے کی سردی میں اپنے مختصر سفر پر روانہ ہوئے لگا اور ہولناکی میں بستر رکھا جانے لگا تو حمیدہ کو یاد آیا کہ اب تک حمیدہ کا نیا لحاف تیار نہ ہو سکا تھا۔ مٹی اپنے پاٹ میں سلایا جاتا تھا اور حمیدہ شریک زندگی ہی کے لحاف میں شرکت کر کے روتی اور روتی دونوں نعمتوں سے فیضیاب رہتا تھا۔ مگر اس سرد سفر کے لیے نہ روتی تھی نہ روتی — حمیدہ تھوڑی در کھڑی گھبراہٹ گھبراہٹ اس شکل کا حل سوچتی رہی، پھر جھپٹ کر الماری میں سے اپنی چھپتی شال چادر نکال لائی۔ — حمیدہ نے روکا۔ ”دو دو کیل کافی ہیں، میں تمھاری چادر نہ لے جاؤں گا“ سفر میں دل دے جانے لگی!

مگر حمیدہ نہ مانی، چادر لپیچ میں رکھ کر بولی۔ ”دل دے جانے مونی! اب تمھاری جان سے زیادہ تھوڑے پیاری ہے!“ حمیدہ نے چھڑنے کے لیے کہا ”اور اگر راستے میں کسی نے جھڑ لیا تو؟“ وہ بڑے کھنڈ سے بولی۔ ”اے تم سلامت رہو، ایسی بیسیوں آ جائیں گی!“

حمیدہ کو بھری کی اس امتحان محبت کا اندازہ نہ تھا۔ حمیدہ اپنی محبوب ترین چیز بیاں پر سے بچھا کر رکھنے کو تیار تھی۔ اس میں کسی طرح کے جذباتی اشارہ قربانی کی جھلک نہ تھی۔ بلکہ بالکل پُر خلوص محبت کا اظہار تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نظر میں شوہر کے آرام کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ حمیدہ کو اپنے دل میں ایک شرمندگی سی محسوس ہوتی تھی۔ اسی خیالات کی وجہ سے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ پہلے بچہ پر جو کچھ گزر جائے حمیدہ کو یہ چادر نہ

اور حوں گا اور اسے بعینہ ایسی ہی نئی واپس لا کر دوں گا۔ اس لیے رات میں جب وہ گھڑی بنا پڑا تھا اس نے چادر اٹھچی سے نہ نکال —

اس وقت جب گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچی تھی اور اس نے جلدی جلدی ہو لڑال باندھا تھا اور گرم شوٹ پر موٹا اور کوٹ پہنا اور گلے میں آؤنی مفلر پہیٹا تھا تو اس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ گھر پر پہنچتے ہی بیوی کو اس کی شال چادر اور صا دوں گا اس لیے ہاتھوں کو دستانے سے چھپانے سے پہلے اس نے ٹمچی سے چادر نکال لی تھی اور گاڑی سے اُسے اچھی طرح سنبھلتے اُترتا تھا جیسے وہ سچ مخ نذر دی جانے والی ٹھیلوں کی چادر ہو۔ رکشے پر بھی بیٹھا تو اس کی تہیں کھول کر اسے ٹانگوں پر ڈالا نہیں بلکہ اسے گود میں اس طرح رکھا کہ کہیں سے ٹکس، دھبہ یا گرد نہ پڑے۔

رکشے والا جہان تھا۔ بھرے بھرے شانے، چڑا سینہ مضبوط کمر، موٹی موٹی پنڈلیاں، موٹی موٹی انگلیوں والے بڑے بڑے پاؤں، اُس نے سزاور گردن میں ایک سوتی مفلر گپڑی کی طرح پیٹ رکھا تھا — وہ آدمی آستین کی خاکی قمیص پر ایک پُرانا سینڈ وکٹ سوتی سوٹر پہنے تھا اور ٹانگوں میں ایک میلا خاکی نیکر۔ پنڈلیاں بھی کھلی تھیں اور پاؤں بھی ننگے تھے — اپنے جسم کی ٹھنڈک دُور کرنے کے لیے وہ رکشا تیز تیز چلا رہا تھا۔ رکشے کی تیز رفتاری نے ہوا پر مستقل رکھ دی تھی — اس ہولے جمید کی گرم موزے میں لپٹی، گرم پتلونوں میں ڈھکی پنڈلیوں میں تھمنے اور آریار نکل جانے کی کوشش شروع کر دی۔ جمید نے بُری احتیاط سے جمیدہ کی

شال کی ایک اور تہ کھول کر اسے ٹخنوں تک لٹکایا۔ اور جیب سگرٹ نکال کر اُسے جلا ناچاہا، ہوا کے جھونکے نے دیاسلائی کی کئی تیلیاں بجھا دیں۔ اس نے رکشے والے سے کہا: ذرا روکو بھی، میں سگرٹ جلا لوں!

مجید نے سگرٹ پر کش لگاتے ہوئے رکشے والے پر نظر کی۔ اس کے در اوڑھی چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے تھے۔ اس کی بغلیں بھیگ گئی تھیں اور وہ رخ زدہ ہوا کے جھونکوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔ مجید نے سوچا، کتنی گرمی ہے خور انسان کے جسم میں۔ بس محنت نہ دینی کی دیاسلائی دکھائی اور آگ بھڑک اُٹھے گی۔ پھر دھماکے کی ضرورت دیکھی شال کی!

اس نے پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟

وہ بولا: گونڈا چلا (ضلع)

مجید نے مسکرا کر پوچھا: مہر یا ہے؟

وہ بولا: اوہ نا بہت اور بالک نہ ہوتی، شاب مات! دہلا لانا

دکشا چلا ٹیٹ۔ (وہ نہ ہوتی اور پیچ نہ ہوتے صاحب تو اس سردی میں رکشا چلاتا)

مجید نے اور کُریدا۔ "میں شہر میں ہیں؟"

وہ بولا: نا میں شاب، اپنا دیش ماں (میں صاحب اپنے دس میں)

مجید نے مسکرا کر کہا: جب ہی!

رکشے والا اس جب ہی کے طنز کو کیا سمجھتا۔ مگر وہ گنگانے لگانے

لڑائی میں تو منوماں کشک ہوتی ہے کری !

مجید نے پوچھا : اچھا تو فلم دیکھنے کے لیے پیسے بچا لیتے ہو ؟

وہ بولا : ارے کب ہوں کب ہوں ، سال چھ مہینا ماں ثواب شاب ۔

(ارے کبھی کبھی سال چھ مہینے میں ثواب صاحب)

مجید تجھیلا اٹھا ۔ نہ جانے کیوں یہ سارے برہمنی لکھنؤ کے ہر مفید پوش کو

ثواب سمجھ لیتے ہیں ۔ وہی محنت ہر روزی سے عاری طبقہ ۔ ریکارڈ کی جماعت ،

پتھر سلطان بڈو کہہ کر اڑنے والے پانچ ۔ مجید توضیح سے شام تک اپنے جوتا

سازی کے کاغذات میں مگارتا ، پچیس تیس کاریگروں کی نگرانی کرتا ۔ دھوپوں

سردی پانی میں دوکان دوکان پھر کر آرڈر حاصل کرتا ۔ خون پسینہ ایک کرتا جب

جاگر چار پیسے ہاتھ آتے ۔ وہ کیا اس رکشے والے کی طرح مزدور نہیں ؟

اور یہ کتاب ہے اُسے ثواب صاحب !

وہ ہی سوچ رہا تھا کہ دُور سے غم ہوا اپنے دوش پر ایک دلدوز کراہ کی

آواز لائی کر اپنے والا کچھ منمنابھی رہا تھا ۔ مگر صاف سناٹا نہیں دے رہا تھا ۔

پھر بھی آواز میں ایک انسانی دل کے لیے ناقابلِ برداشت درد تھا ۔ مجید نے

گھبرا کر رکشے والے سے پوچھا : ارے یہ کون کراہ رہا ہے بھائی ؟

اس نے رکشا آہستہ کر کے آستین سے منہ کا پسینہ پونچھنے ہوئے کہا :

ارے اک گونگلی بو شاب ! ہرم جاوے اہ کا بھی کھراب کیس ۔ اوہ ایک چھوٹا

بانگ کا چھاتی سے نکلے شڑک پر چڑی ہو ۔ بس ہر دھت چکیٹ ہو ۔ اہ کا پیر پیر

بلکوا کا کچھو اور حادیر ! ای سردی سمرت ہو ! اور او کھڈنگی ہو ! (ارے

صاحب ایک پگلی ہے۔ حرام زاووں نے اس کو بھی خواب کیا ہے۔ وہی ایک چھوٹا سا بچہ سینے سے لگائے شرک پر پڑی ہے۔ بس ہر وقت چھٹی رہتی ہے۔ اس کو بچا لو اس بچے کو کچھ اوڑھا دو ایسے سردی سے مر رہا ہے! اور وہ خود نکلی ہے!)

مجید نے تعجب سے پوچھا: اُسے تو اتنے بڑے شہر میں کسی اشد کے بندے نے اُسے کوئی رضائی کپل نہ اوڑھایا؟

وہ بولا: ”جھگہ کاپاس رجائی کپل بہت ہے شباب، وہ کھدا اوڑھے کہ اب کاوی ہے!“ (جس کے پاس رضائی کپل ہو گا صاحب وہ خود اوڑھے گا کہ اس کو دے گا)

رکشے والے نے بڑے زور سے گھنکار کر حلق صاف کیا اور زور تھوکا۔ وہ رکشا اور بھی آہستہ کر کے بولا: ”جی نواب شباب، بڑا لوگ ہو ٹراماں سیسہ چٹا پٹوں پٹوں کُرت سن سن نکل جات ہیں، اُہ کا ہے کا پگلی کی اور دیکھی ہیں۔ او آپن دوسو، اڑھائے سو کا کپل پگلی پر ڈال دی ہیں؟ آئیہ کلابات گست ہیں!“ (اجی نواب صاحب، بڑے لوگ ہو ٹرامیں شیشہ چڑھائے پٹوں پٹوں کرتے سن سن نکل جاتے ہیں۔ وہ کا ہے کہ پگلی کی طرف دیکھیں گے۔ کیلہہ اپنے دوسو، ڈھائی سو کے کپل پگلی پر ڈال دیں گے؟ آپ بھی کیا بات کہتے ہیں!) رکشا اب پگلی کے قریب آ گیا تھا۔ ناک کے بیٹھے ہوئے ہانسی سے نکلی ہوئی منمناتی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اُسے بچا لو اس بالک کو! اس کو کوئی دستر اڑھا دو! یہ پانی نہیں میں ہوں! ہر جائے گا اس

سردی میں؛ اسے بچا لو! آہ! آہ! بھگوان کیا اس دنیا میں کہیں دیا نہیں؟ آہ!

آہ!

مجید نے دیکھا پگلی فٹ پاتھر پر آدھی ننگی ٹری ہے۔ بس ایک چھوٹی سی پٹی دھوتی رانوں میں لپٹی ہے ایک کونا پیٹ پر پڑا ہے جس کے نیچے سے ایک بچہ کا سر دکھائی دے رہا ہے۔ پگلی کے بال ٹی میں اٹھے ہیں اور اس کے چہرے اور چھاتی پر اس طرح کے نشانات ہیں جیسے کسی نے اسے تیز ناخنوں سے لٹچا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور اس کی باجھون سے خون بہہ کر جم گیا ہے۔ جیسے اس نے اپنے دانتوں سے اپنی زبان اور ہونٹ چبا ڈالے ہیں اور وہ کرا رہا جارہی ہے۔ آہ! آہ! آہ! اور اس پر کتیاں بھی بھن بھنا رہی ہیں اور چیونٹیاں بھی جاگ جاگ رہی ہیں۔

مجید کے دل نے کہا: "یہ تو کسی بھلے گھر کی بھنکی ہوئی لڑکی ہے۔ کسی فریسی نے دھوکا دیا اور ماں باپ نے گھر سے نکال دیا۔" ذرا پگلی نے کراہتے ہوئے لال لال خون کبوتر دیدوں سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چیخی، "یہ بالک اپنا دھبی نہیں؛ اُسے بچا لو! اسے کچھ اور دھاؤ!"

یہ فریاد مجید کے جسم میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی۔ اس کے دل و دماغ جھنجھٹا اٹھے۔ وہ اس طرح کا نپا کہ گھٹنے پر رکھی ہوئی شال پھسل کر جوتوں پر پڑی وہ اُسے جھک کر اٹھانے اٹھانے بے سوچے سمجھے کہہ اٹھا۔ "کوئی رکشا! رکشے والے فیر پور ایک لگایا، رکشا جھکے سے اُتر لائیں! مجید کو سوا لیمہ انداز سے دیکھا۔

مجید نے شال اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ یہ چادر تو اس نیکی کو اڑھا دو!
 رکشے والے نے تعجب سے پوچھا۔ ای نیکی کا؟ (اس نیکی کو؟)
 مجید نے جھنجھلا کر کہا۔ ہاں، اسی کو!

اس نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔ اسے ای چادر بہت بڑھا ہو
 نواب شاہ! اہ! بچن نامک پھٹکت ہو! اور سے یہ چادر بہت ہی اچھی
 ہے نواب صاحب، اسے آپ ناحق ہی پھینک رہے ہیں!
 مجید نے ڈانٹ کر کہا۔ بکومت! جا کے اسے اڑھا دو۔

مگر نہ مجید خود رکشے سے اترتا اور نہ اس نے اپنے ہاتھ سے نیکی کو چادر
 اڑھانے کی ہمت کی۔ اس کی طرف نظر کرتے ہی متلی معلوم ہوتی تھی خیال آنا
 کتنی گندی ہے وہ! نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کے جراثیم اس کے جسم سے
 پٹے ہوں گے! اور جب رکشے والا چادر لے کر کچھ ناخوش سا نیکی کی طرف
 بڑھا تو مجید نے ادھر ادھر شرک پر گھبراتے ہوئے نظر ڈالی۔ کوئی دیکھتا تو نہیں
 اس کی اس بیوقوفی کو۔ کوئی دیکھ لے گا تو نہ جانے کیا سمجھے گا اپنے دل میں۔
 رکشے والے نے نیکی کے پاس جا کر چادر کو زور سے جھٹکا دے کر پھیلایا
 اور مجید کی چھٹی چادر اس کے گندے جسم پر ڈالتے ہوئے بولا۔ لے لو! لے لو! نیکی!
 تمہارا قسمت جاگ نکلی۔ اب کھوب گراما کے لیٹ! آؤ! لے لو! نیکی، تیری قسمت
 جاگ گئی اب خوب گراما کے لیٹ!)

نیکی نے شال کی سرسراہٹ اور اپنے قریب ایک انسان کی موجودگی
 محسوس کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دانت نکال کر اس طرح مسکرائی کہ

چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔ رکشے والا جلدی سے پیچھے ہٹا۔ وہ تیز قدم رکھتا رکشے تک پہنچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے فوری تیزی سے بھاگ دیا۔ نہ جانے وہ ہنگلی سے ڈر کر بھاگا تھا یا خود اس کے اپنے کچھ ایسے جذبات خیالات غمخیز جن سے وہ بھاگ رہا تھا۔

اور مجید اس سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ کیل کھے گا، حمیدہ سے کیا وہ بھری سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس نے اس کی محبوب چادر ایک ہنگلی کو اڑھا دی؟ کیا وہ اس کو اپنی توہین نہ سمجھے گی؟ کہیں انسوا گئے اس کی چشم میگوں میں تو؟ کہیں اتر گیا اس کا سہنس مکھ چہرہ تو؟ اس نے طے کیا وہ جھوٹ بولے گا۔ ایسا جھوٹ کہ انسو کی بجائے حمیدہ کے منہ سے کلمہ شکر نکلتے۔

حمیدہ نے میاں کا بڑی گرم بوٹی سے خر مقدم کیا۔ اسے اس دور کوٹ اتارنے میں مدد دی۔ لہکے ہوئے کوکلوں سے بھری انگلیٹھی اس کے پاس لا کر رکھ دی۔ گرم گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونے کا انتظام کیا۔ جلدی جلدی کھولتی ہوئی جہانے تیار کر کے پلائی۔ جب وہ سوٹ اتارنے اور گھبرلو کپڑے پہننے دوسرے کمرے میں چلا گیا تو حمیدہ نے اچھی کیس کھولا کہ کپڑے کبڑیں رکھ دے۔ ساری چیزیں موجود تھیں، مگر شال کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے ہر ٹال بھی کھول ڈالا۔ بستر میں بھی وہ غیر حاضر نکلی۔ اس نے گھبرا کر حمیدہ سے بلند آواز میں پوچھا۔

”میری شال کیا ہوئی؟“

حمیدہ نے جھوٹی کہانی گھڑ لی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر منہ مسکھا کر بولا، ”وہ“

توریل میں چوری ہو گئی۔

حمیدہ کا چہرہ تنہا اٹھا۔۔۔ وہ بولی۔ "کون مولا گیا اُسے؟"

حمیدہ نے نظریں نیچی کر کے کہا "ذات کو ریل میں گھر سے بھی زیادہ سڑی تھی۔"

جب دو کمپلوں اور اوروں کوٹ اوڑھنے سے بھی ٹھنڈک میں کمی نہ ہوئی تو میں نے اُن کے اوپر سے تمھاری چادر بھی ڈال لی معلوم ہوتا ہے وہ کوٹ لینے میں برکت سے بچنے لگی۔ میں سو رہی رہا تھا کہ دو مسافر اُتر گئے۔ انھیں میں سے

کوئی اُسے بٹل میں دبا لے گیا۔ اب وہ آنکھیں اٹھا کر ذرا سا مسکرایا اور بولا "خیر ہی ایسی تھی کہ جو دیکھے منہ میں پانی بھرائے!"

حمیدہ کو سننے لگی۔ "اللہ کرے اس کا ہاتھ سترھلے، میری شال اوڑھنا اُسے کبھی نصیب نہ ہوا اس کی قبر میں کیڑے پڑیں!" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو ابھی گئے۔

اما بعد ناشتے کے سلسلے میں ہدایت لینے کے لیے اگر کبھی سے لگی

کھڑی تھی۔ وہ تڑ سے بولی۔ "اے بی بی۔ اتنی سی چادر کے چلے جانے پر

آپ روتی ہیں۔ خدا کا شکر کیجیے کہ میاں کو کوئی چوٹ چپیٹ نہیں آئی۔"

سنتی بولی "آج کل پلٹی گاڑی میں ڈاکے پڑتے ہیں۔ مومے ڈاکو لوٹتے ہی نہیں،

مسافر کی جان تک لے لیتے ہیں۔ اللہ آمین سے میاں صحیح سلامت ساتھ

خیریت کے پلٹ آئے، صدقہ اُتر دایئے! شکر کا سجدہ ادا کیجیے!"

حمیدہ کا مٹو ہاتھ بدل گیا۔ اس نے جھٹ پر س میں سے سو روپیہ

نکال کر عدن کی طرف بڑھایا۔ "سچ کہتی ہو تو! صدقہ ان پر سے ایسی

سینکڑوں چادریں، تم ایک سو سنی میں سوا سیر کھڑا ماش اور ایک پیالے میں سوا پاؤ گڑ اٹل اور اس میں سوا دور دسپے رکھ کر ان کے ہاتھ سے چھو اگر کسی فقیر، یتیم کو دے دو اور میں باقی ہوں ابھی دو گناہ پڑھنے۔ اور وہ وضو کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مجید نے سوچا۔ چلو کام بن گیا۔ ایک ذرا سے جھوٹ نے بڑانیک انجام دکھایا اور اُس نے زبان پر عجیب طرح کی شیرینی محسوس کی۔ دوسرے دن جب ٹھنڈی ہوا ذرا گرمائی، تو پانچ بجے کا زمانے سے پلٹے وقت مجید اسی سڑک پر مڑ گیا بدھ صرنگلی فٹ پاتھ پر پڑی تھی۔ اس نے دیکھا میونسپلٹی کے مہتر اس کی اکڑی ہوئی لاش ایک ٹھیلے پر لا رہے ہیں۔ اس کے جسم پر وہی میلی بھٹی دھوئی ہے اور اس کا مہر ہوا تپہ اسی طرح اس کی چھاتی سے چپکا ہوا ہے۔ مگر حمیدہ کی چھاتی چادر کا دُور دُور کہیں پہنچیں اور مجید کا منہ کڑے لعاب سے بھر گیا!



لغوش!

جب سوزِ عشق جاگا

نور چاچا گاؤں کی آبرو کار کھوالا تھا۔

یوں تو بڑے شاہ جی مرحوم کے مزار کا بھی گاؤں پہ سایہ تھا اور اب ان کی گدی پرچن چراغ شاہ بیٹھے تھے جن کی دعا و برکت سے گاؤں شر شرابھو بدست بن، چریل، پکڑ، سایہ اور ہریلا سے محفوظ تھا اور دشمن کا بھی سر نہ چا رہتا تھا، لیکن گاؤں کے دشمن جن چراغ شاہ سے کم اور نور چاچا سے زیادہ بدکتے تھے۔ نور چاچا کی کرامات ہی ایسی تھیں۔

گاؤں کے دشمن کہیں دور دراز نہیں رہتے تھے، ان کا گاؤں دہ سائے نظر آتا تھا یہی کوئی پون کوس کا فاصلہ ہو گا۔ نور چاچا کے گاؤں اور اُس گاؤں کی کھیتوں کے مینڈھ۔ اٹھتے تھے، دونوں گاؤں کے درمیان ہوتا سرکاری کٹھ بھی سانجھا تھا، ہری کھیتوں کی آغوش میں شیشم کے ٹیڑوں تلے قبرستان بھی سانجھا تھا۔ ادھر کی بیٹیاں ادھر اور ادھر کی بیٹیاں ادھر رہا ہی ہوئی تھیں۔ ڈرٹھ کوں پہ سے ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بھی سانجھا تھا دونوں گاؤں کے فوجی جوان اسی اسٹیشن پر اترتے تھے اور اپنے اپنے گاؤں میں چھٹی کاٹ کر اسی اسٹیشن سے رات کی مسافر گاڑی سے دور پر دس چلے

جایا کرتے تھے۔ اس اسٹیشن پر یہی ایک گاڑی رکا کرتی تھی، وہ بھی رات بارہ بجے۔ ڈھور ڈنگر جتنے چگتے اور بچے کو کڑے لگاتے اس گاؤں سے اس گاؤں تک جا پہنچتے تھے، لیکن دلوں میں جو فاصلے سائل ہو گئے تھے وہ بڑی کٹھن مسافت تھی جسے نہ اُس گاؤں کے کھجور پاٹ سکے نہ اُس گاؤں کے جیالوں نے کبھی طے کرنے کی ہمت کی

کرتے بھی کیسے؟ صرف سرکاری کٹھ ہوتا تو وہ پھلانگ کے پار کرتے لیکن درمیان میں ناک سائل ہو گئی تھی۔ ناک پر پاؤں رکھ کر گزرنا ممکن نہ تھا حالانکہ اسی ناک پر پاؤں رکھ کر دونوں گاؤں کے بیسیوں آدمی جیل جا چکے تھے۔ کئی عرصہ بھگت رہے تھے اور کئی نعرے لگاتے پھانسی چڑھ گئے تھے جو قتل ہو گئے تھے اُن کے بھی اور جو پھانسی چڑھ گئے تھے اُن کے بھی، جنازے دونوں گاؤں نے مل کر پڑھے تھے اور قاتلوں اور مقتولوں کی قبریں بھی پہلو بہ پہلو کھدی تھیں۔

یہ سلسلہ ایک مدت سے جاری تھا اور طویل مدت تک جاری رہنے کے امکانات بھی روشن تھے۔ بارہنیں بھی آتی تھیں، ڈوبیاں بھی جاتی تھیں اور جنازے بھی اٹھتے تھے۔ رشتے تلے جو گڑ شکرے طے ہوتے تھے، ڈھولک کی تھاپ پر کنوارے گیتوں میں پروان چڑھتے۔ بینڈ باجے بجاتے، گولے چلتے، پھر میکے اور سسرال کے تین چار پھیروں میں کوئی بات پیدا ہو ہی جاتی تھی جس سے سماگن جوڑولی پہ جاتی تھی طلاق لے کر پایادہ لوٹ آتی تھی اور اس کے جواب میں کوئی ایک دو بچوں کی ماں سسکیاں لیتی اسی آنگن میں جا بیٹھتی تھی جہاں

سے برسوں پہلے اُس کی ڈولی اُٹھی تھی !

نور چاہا نے نور شتوں ناطوں کا سلسلہ ہی توڑ دیا تھا اُس کی عمر آج پچاس برس ہو چکی تھی لیکن اسے وہ واردات کل کی بات کی طرح یاد تھی جب وہ دس گیارہ برس کا بچہ تھا تو اس کا باپ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا تھا۔ آج نصف صدی گزرنے والی تھی، لیکن باپ کی لاش ابھی تک اس کی نظروں تلے ٹرپ رہی تھی۔ جو بڑے قریب لڑائی ہوئی تھی۔ یہ جو بڑے پمپل کی چھانٹے دو نوں گاؤں کے درمیان تھا۔ دونوں گاؤں کی بھینسیں اس میں بیٹھا کرتی تھیں اور دونوں گاؤں کے بچے اس میں تیرا کرتے تھے۔ نور چاہا جو اس وقت نور چاہا نہیں نادان سا نور تھا، اپنے باپ کے ساتھ تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ اُن کی بھینس پارواڑوں کی ایک بھینس سے لڑ پڑی۔ نور کے باپ نے دوسری بھینس کو لاکھی دے ماری تھی۔ اس گاؤں کے دو آدمی قریب ہی کھیتوں میں پانی لگا رہے تھے۔ وہ کدالیں لیے نور چاہا کے باپ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دو آدمی اِدھر سے بھی پہنچ گئے تھے۔

نور چاہا کو آج صرف اسی قدر یاد تھا کہ اُس کے باپ کا سر کھل گیا تھا اور وہ بیٹھ کی جھلستی دھوپ میں دھرتی پر ٹرپ رہا تھا۔ لڑائی تو بظاہر بھینسوں پر ہوئی تھی لیکن اس کے پس منظر میں نصف صدی کی سیاست تھی جو اب روایت بن گئی تھی اور جسے بڑے بوڑھے ورثے کے طور پر گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔ نور چاہا کا باپ قتل ہو گیا اور چار ہی سال بعد اُس کی ماں بھی مر گئی اور وہ تینتے غلاموں میں بٹکنے کے

یسا کیلارہ گیا تھا۔ باپ کی زمین خاص تھی۔ تنصیال والوں نے اُسے گود لے لیا اور گاؤں والوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور تعلیم بچے کی کھیتیاں دیران نہ ہونے دیں، مگر بچے سے جو پیار چھین گیا تھا وہ اُسے کوئی نہ دے سکا۔ شفقت اور پیار کی محرمی نے نور چاہا کہ ذہن میں باپ کی طرحی لاش کے تصور کو اور زیادہ اجاگر کر دیا تھا اور انتقام کا زہر اس کی سوچ اور فکر پر تباہ چلا گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا، بڑوں کی طرح سوچ سکتا تھا نہ ہو سکتا تھا، لیکن وہ جلد اور بہت ہی جلد انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا وہ بھولوں میں کم اور بڑوں کی اُن چٹال چکرلوں میں زیادہ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ جہاں پاروائے گاؤں کے خلاف نت نئی سازشیں تخلیق ہوا کرتی تھیں۔ وہاں اُن کے مرثی چوری کر لائے، کھلیاں جلا دینے، کسی لڑکی کو اٹھا لائے اور پانی کی باری پر دنگا سدا کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ یہ تحریری باتیں نور چاہا کے بچے ذہن میں قندیلیں روشن کرتی جا رہی تھیں اُس کی نفسیاتی خلش اور جذباتی ہیجان کو ان ہی باتوں سے تسکین ملتی تھی۔ وہ جب بڑوں کی محفل سے اٹھتا تھا تو تنہائی میں کتنی ہی دیر تصوروں میں انتقام کے منصوبے بنا مارتا تھا اُس کے ذہن میں نفرت و حقارت اور انتقامی جذبات کے سوا کچھ نہ رہا۔

لڑکیوں میں وہ بڑوں کی سی پختہ باتیں کرنے لگا تھا اور حسبِ لڑکیوں جوانی میں مدغم ہو گیا تو اس کے چہرے پر مردوں کی پختگی کا پُرکشش روپ چڑھ گیا۔ اس کا خوب صورت گاؤں کی گوریوں کو کنواری تہائیوں میں گود گوانے

لگا لیکن نور چاہا کی تنہائیوں کو باپ کی لاش تلخ بنائے رکھتی تھی۔ وہ جب تنہا ہوتا تھا تو قصورتوں میں باپ کی لاش اور زیادہ نکھر آتی تھی اور نور چاہا کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

بیس برس کی عمر میں نخصیالی والوں نے اس کے باپ کی تمام زمین اس نے نام غفلت کرادی اور نور چاہا جو چہرے سے خوب وادور جسم و جیش کا دل نشین گھبرو تھا، اُن تمام دلدین کو پیارا لگنے لگا جن کی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ وہ اب گاؤں کا راجہ تھا اور کئی جیسین لگا ہوں اور پر شہاب آہوں کا مرکز، لیکن نور چاہا کی نگاہیں کٹھے کے پار اس گاؤں پر جمی رہتی تھیں جس کے دو آدمیوں نے دس برس گزرے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا اور عدالت میں جا کر صاف بری ہو گئے تھے۔ نور چاہتا تو کسی بھی روز بانی کی باری پہ یا جو پٹر پڑھو رڈنگروں سے ہی کوئی بات پیدا کر کے لڑائی کر سکتا تھا۔ اب تو اس کے بازوؤں میں بے پناہ قوت تھی اور دماغ صرف لڑنے مرنے کی ہی سوچتا تھا، لیکن اس کے دل میں پیچیدگی تھی کہ قتل کروں گا، بدلہ لوں گا لیکن ایک بار نہیں بدلہ لیتا ہی رہوں گا اور ہر روز تماشہ دیکھا کروں گا۔

”نور بیٹا! ایک روز بڑے چوہدری نے اُسے پیار سے کہا تھا، اب گھر بسا لو، جوانی یوں اکیلے نہیں کٹا کرتی۔ گاؤں والے الگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔“

”چاہا جی! نور نے پراسرار سی مسکراہٹ سے کہا تھا، شادی!

گافوں سے نہیں کروں گا۔ نہ میری بات جائے گی، نہ میں کہیں سے ٹول
لاؤں گا، پاروائے چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت، جوان ہو گئی ہے، اسے
اٹھا لاؤں گا، اپنے گافوں کے بیچ بیٹھ کر نکاح پڑھاؤں گا اور ایک مہینہ بعد
طلاق دے دوں گا۔ نور نے مناسبت سے کہا تھا۔ پھر اسی گافوں کی ایک
اور لڑکی اٹھا لاؤں گا اور زبردستی نکاح کر کے تھوڑے دنوں بعد طلاق
دے کر گافوں سے نکال دوں گا۔

چوہدری نے چونک کر نور کو دیکھا لیکن وہ خراماں خراماں کٹھے کی طرف
جاریا تھا۔ رُت چیت، بیساکھ کی تھی۔ گندم کے خوشہ پک کے سنہرے ہو
چلے تھے اور بیساکھ کی برکیٹ پیش لے جوان سینوں میں ہل چل مچا رکھی تھی۔
خوشے تن کے جھوم رہے تھے اور اٹھڑیاں مشک مشک کر گھوم رہی
تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ دونوں کی باتیں زیر لب متسم میں
آ بسی تھیں اور اس متسم میں انگڑائیاں مسکرا رہی تھیں۔ بازو آپ ہی آپ
انگڑائیوں کے لیے پھیل جاتے تھے۔

”نور! اسے یوں آواز سنائی دی جیسے گندم کے کسی خوشے نے مرغوشی میں
بالایا ہو۔ وہ رک گیا، کہاں چلے نور! — اس نے دیکھا، دو کھیتوں کے
درمیان میں بیٹھ پر سرائیں بیٹھی تھی۔ وہ کہیں جا رہی تھی لیکن نور کو دیکھ کر بیٹھ گئی
تھی۔ سرائیں گافوں کی جیسے لڑکی تھی اور کنواری۔ جانے کتنے امیدواروں کی
آنکھیں اس کی راہ میں سجدہ رہ رہ رہتی تھیں، لیکن جہاں کی اپنی جیسے نور کے قدموں
میں جھکی جا رہی تھی۔ نور کو معلوم نہ تھا۔

”کیوں مہراں! فوراً نہ مسکرا کر پوچھا: یہاں کیوں بیٹھ گئی؟“
 ”کوئی دیکھ نہ لے۔“ مہراں نے مسکراتی ہوئی سی آہ لے کے کہا: ”تم کہاں
 پہلے؟..... بیٹھ جاؤ نا۔“

”کیوں؟“

”کوئی دیکھ نہ لے۔“

”پنگلی مہراں! اُس نے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے
 لگا۔

مہراں نے اس کا راستہ روک لیا۔ فوراً ہی ٹک گیا اور سنجیدہ سے سمجھ میں
 بولا: ”مہراں! میں گلاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں اور تم گلاؤں کی بیٹی ہو۔“
 ”میں بے آبرو تو نہیں۔ فوراً مہراں نے دھیمے مگر باوقار لہجے میں کہا: ”میں
 گلاؤں کی آبرو ہوں اور اپنی رکھوالی بھی کر سکتی ہوں، پر فرق اتنا سا ہے کہ تم
 مرد ہو میں عورت ہوں۔“ اُس نے آہ لی اور سسکی سی لے کر بولی: ”جاء فوراً
 پھر کبھی تیری ماہ نہ آؤں گی۔“

فور کے جی میں جانے کیوں آئی کہ مہراں کے پاس بیٹھے جلنے لگی مہراں
 آنچل سے آنسو چھپتی اٹھ بیٹھی تھی۔ فور کو دھچکا سا لگا۔ بولا: ”برائے مہراں؟“
 میں تو گلاؤں کی ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔“

”اؤنٹھ! مہراں گردن کو پیار سا خم دے کر بڑی سادگی سے بولی: ”ہر
 لڑکی کو بہن سمجھتا ہے تو یہاں کس سے کرے گا؟“

”پارولے چوہدری کرم دیسی کی مٹی زینت سے۔“

”بائیں! مہراں چمک اٹھی۔ اپنے باپ کے قاتلوں سے باز رشتہ جوڑے گا؟“
 ”نہیں۔“ نور نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا: ”رشتہ مانگنے نہیں جاؤں
 گا نہ رشتہ جوڑوں گا، زینت کو اٹھاؤں گا۔“
 اور وہ مہراں کو خلاؤں میں بٹکتا چھوڑ کے آگے چلا گیا۔

اس رات نور بہت دیر بعد گھر آیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو گیا تھا۔ اگلی
 صبح پڑوسیوں نے پوچھا کہ رات کہاں رہے تو وہ مسکرا کر بات گول کر گیا۔
 اور کسی کو پتا نہ چلنے دیا کہ وہ شام کے اندھیرے میں باپ کے قاتلوں کے
 گاؤں کے گرد گھومتا رہا ہے اور زینت کے باپ چوہدری کرم دین کے
 گھر کا جائزہ لیتا رہا ہے۔

پھر نور اکثر غائب رہنے لگا اور رات بہت دیر سے گھر آنے لگا۔
 فصل کٹ کے کھلیاؤں میں ڈھیر ہو گئی۔ کھلیاؤں میں پکی گندم کی
 پہاڑیاں سی کھڑی ہو گئیں اور دھوپ میں سوکھنے لگیں۔ ایک رات نور بچا چا
 کے گاؤں والوں کو پار والے گاؤں کے کھلیاؤں سے میب سے شعلے
 اٹھتے نظر آئے۔ تاریک رات سرخ ہو رہی تھی، کھلیاں جل رہے تھے
 اور دھوئیں کے بھوت شب کی تیرگی میں اٹھ اٹھ کر گم ہو رہے تھے۔ دوسری
 صبح نور کے گاؤں میں خوشیاں دلج رہی تھیں۔ ہر کوئی برکسی سے فاتحانہ لہجے
 میں پوچھ رہا تھا: ”کس نے لگائی تھی؟“ — لیکن ہر کوئی سر ہلا کے چپ
 ہو رہتا تھا۔ گاؤں والے اُس ردِ کامنہ جرم لینا چاہتے تھے جو اُن کے دشمنوں
 کی فصل جلا آیا تھا۔ صرف نور تھا جو ابھی ہلکا سا نہیں تھا۔ دن کا پھپھلا

پہر گزر چکا تھا جد، نور آنکھیں ملتا باہر نکلا تو تین چار آدمیوں نے اُسے گھیر لیا۔ پوچھا۔ نور! سنا تو نے بھی رات بار والوں کا ایک کھلیان جل گیا ہے؟

ایک کھلیان؟ نور کے چہرے کا تاثر یوں بدل گیا جیسے اُسے دکھ ہوا ہو۔

”کیوں؟“ ایک آدمی نے طنز آلود لہجے میں کہا: تجھیں رنج ہوا ہے کہ تیرے باپ کے قاتلوں کا کھلیان جل گیا ہے؟

”بہت رنج ہوا ہے بھائیو! نور نے کہا: میں نے تو ان کے دو کھلیانوں میں انگارے رکھے تھے اور آگ بھڑکنے سے پہلے بھاگ آتا تھا۔“

”ارے دونوں جل گئے ہیں۔“ ایک نے اس سے ابتکیر ہوتے ہوئے کہا: تو نے انتقام لے لیا نور! اور نور کے چہرے پر رونق آگئی۔ بولا: ابھی نہیں، انتقام تو میں تمام عمر لیتا رہوں گا۔ یہ تو بسم اللہ کی ہے۔“

بڑے بوڑھوں نے نور کو سینے سے لگا لیا، وچ خوش تھے کہ پاروالے دشمنوں کے خلاف جنگ کو زندہ رکھنے کے لیے ایک اور ہیرو میدان میں اتر آیا ہے۔

عین اس وقت پاروالے گاؤں کے بیس بچپیں آدمی لالٹھیاں اور کلہاڑیاں لیے کھٹے پر آصف آرا ہوئے اور لالکار لالکار کر نور کے گاؤں والوں کو گالیاں دینے لگے۔ سوہ ہانتے تھے کہ ان کے سوا ان کے کھلیانوں کو اور کوئی آگ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ نور کے گاؤں کے چھوٹے

بڑے چھتیاں اور کلہاڑیاں لے کر نکل آئے۔ لیکن نور نے راہ روک لی اور بولا
 ”سر کھل جائیں گے مردو! بچوں کو قسیم نہ کرو، بچوں کی ماؤں کو بچہ نہ کرو
 ان گالیوں کا جواب اب نور دے گا۔ اب ڈانگ سوٹا نہیں چلے گا۔ تم اپنے
 کھلیاؤں پر پیرے بٹھاؤ، باقی میں سنہال لوں گا۔“

لیکن نور کے گاؤں کے مرد اس کی ایک بھی سننے پر آمادہ نہ تھے اور
 سے گالیاں تیروں کی طرح سنسناتی چلی آرہی تھیں۔ اور نور اپنے گاؤں
 والوں کی راہ روکے کھڑا تھا۔ بول بول کر اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔
 آخر یہ جھاگ ضائع نہ گئی اور اس نے خونی خرابہ ہوتے ہوئے بچایا۔

دوسری روز بعد نور نے گالیوں کا انتقام لے لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک
 رات وہ پھر گھر بہت دیر سے آیا اور دوسری صبح تپا چلا کہ پار والے چھپرے
 کرم دین کے دو بیل اور چوہدری رب نواز کی ایک بھینس مر گئی ہے چند
 دنوں بعد خبر ملی کہ کسی نے چارے میں زہر ملا دیا تھا۔ یہ مریشی گریسوں کی
 وجہ سے باہر کی کھڑی پہ ہند سے تھے اور نور گاؤں کے چوکیدار اور باہر سونے
 ہوئے آدمیوں کی نظر بچانا کھڑی میں زہر کی ٹپریاں بکھیر آیا تھا۔ نور بے حد مسرور
 تھا اور اس کے چہرے پر انوکھی سی رونق آگئی تھی۔

دوسرے روز پار والے گاؤں کے تین آدمی نور کے گاؤں کے دو آدمیوں
 سے الجھ پڑے۔ وہ اپنے دو بیلوں اور ایک بھینس کا انتقام لینا چاہتے تھے
 جو ڈر کا کنارہ میدان جنگ بن گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کوئی قتل نہ ہوا۔ نور
 جن چراغ شاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ دونوں گاؤں کا راضی نامہ کرا دیں

دونوں گاؤں شاہ جی کی مریدی میں تھے، اُن کا اہنا حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ جی دونوں فریقوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔ اور لوگ بچا منی چڑھ جانے تک اُن کے تعویذ گلے میں لٹکائے رکھتے تھے۔ وہ انتقام لینے کی شجہ گٹری بھی بتایا کرتے تھے۔ اب نوران کے پاس فریقوں میں راضی نامے کے لیے گیا تو انھوں نے دونوں گاؤں کے بچوں کو بلا کر دونوں گاؤں کی تاریخ میں ایک اور راضی نامے کا اضافہ کر دیا اور بات تھانے تک نہ پہنچنے پائی — نور کا مقصد ہی یہی تھا۔

کھلیانوں سے دانے گھروں میں آگئے تھے، دھن کے کھلیان جل گئے تھے وہ سینے کی آگ کو ٹھنڈی آہوں سے بجانے کی کوشش کر رہے تھے جہاں ایک مہینہ پہلے کھڑی فصلوں کی لہریں تھیں وہاں اب ڈور ڈور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔

راضی نامے کو دس روز گزر گئے تھے جمعرات کا دن تھا۔ دونوں گاؤں کے بوڑھے، بچے، عورتیں کھیتوں کے میدان میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور گرد کے دیہات کے لوگوں نے بھی اسی میدان میں آکر بھرم کیا اور میلے کا سا سماں بند گیا۔ دونوں گاؤں کے میراثی ڈھول پیٹ رہے تھے اور دس بارہ بیل گاڑیاں میدان میں گھم رہی تھیں گاڑیوں سے جتے بیلوں کو صابن سے نہلیا گیا تھا۔ گردنوں میں گشتیاں، اٹھتیسوں اور چونتیسوں کے ہار اور ٹانگوں سے بندھے گھنگھروں سے زیناں میں چھنک رہے تھے۔ بعض نے بیلوں کے سینگوں سے ریشمی رومال اندھ لکھے تھے اور اُن کی ٹیٹیوں پر رنگ برنگے دوپٹے پھیلا کر

باندھ دیئے تھے۔

یہ گڈوں (بیل گاڑیوں) کی دوڑ کا مقابلہ تھا جو فور نے پاروائے گاؤں سے طے کیا تھا۔ راضی نامے کے دوسرے روز نوں پاروائے چوہدری کرم دین کے ہاں چلا گیا تھا اور اُس کے گھٹنے چھو کر بڑے سادب اور احترام سے کہا تھا۔ ”چاچا جی، میں ثبوت دینے آیا ہوں کہ یہ راضی نامہ پہلے راضی ناموں کی طرح ٹوٹنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اگر آپ بھی ہماری طرح سچے دل سے دشمنی ختم کر دینا چاہیں تو آئیے مل جل کر مہینے کھیلیں اور ایک دوسرے کے غم بانٹ لیں۔ دونوں گاؤں کے گھروں حرام موت رہے ہیں۔ کوئی قتل ہو جاتا ہے اور کوئی بھانسی چڑھ جاتا ہے۔“

فور نے ایسے لمحے میں بات کی تھی کہ چوہدری کرم دین کے آنسو نکل آئے تھے اور اُس نے فور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: ”نور بیٹا! یہ عہد تیرا باپ کرتا تو قتل نہ ہوتا۔ بہت خون خرابہ ہو چکا بیٹا!.....“ اور کرم دین پر رقت طاری ہو گئی تھی۔

یہ وہی چوہدری کرم دین تھا جس کی بیٹی، زینت، کو فور نے اٹھا لایا، زبردستی نکاح طے ہوا اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔

کرم دین کے آنسو دیکھ کر فور نے سر جھکالیا، پھر بولا: ”چاچا، آؤ ہم دنیا کو دکھائیں کہ ہم ایک ہو گئے ہیں۔ آؤ چاچا، اس جمعرات کے روز دونوں گاؤں مل کے گڈوں کی دوڑ کریں اور مہینے کھیلیں۔“

اور یوں نور نے دونوں گاؤں کو گڈوں کی دوستانہ دوڑ پر رضی کر لیا تھا لیکن نور کے اپنے گاؤں کے چند آدمی نور کے اس اقدام پر خوش نہیں تھے اور وہ جگہ جگہ کہتے پھر رہے تھے کہ رضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن دشمنوں سے یوں گھل مل جانا کہاں کی غیرت ہے۔ خود نور کا باپ انہی دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

اس احتجاجی چیمپیونیز کے باوجود گڈوں کی دوڑ ہو رہی تھی اور جمعرات کے روز دونوں گاؤں کے درمیان خالی کھیتوں کے وسیع میدان میں ہزاروں دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔

نور کا گڈا ابھی دوڑ میں شامل تھا۔ اُس نے اپنے کالے پیل کو دو لھا کی طرح سجا رکھا تھا اور گڈے اور پیل کے سینگوں کو کڑوائیل مل کر چپکایا ہوا تھا۔ نور نے چار خانہ کالا چہرہ، دو گھوڑے کی بوسلی کا لمبا کڑوا اور سر پر فیروز زنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ اُس کا کلفت سے اکڑا ہوا شملہ سب سے زیادہ اونچا تھا۔ وہ فائن خانہ انداز سے گڈے کو میدان میں چکر دے رہا تھا اور پار دالے گاؤں کے بچے بچے کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر، منس منس کر، سلام کر رہا تھا۔ پار دالے گاؤں کا ایک گڈا اس کے قریب آکر ٹکا۔ نور نے گھوم کر دیکھا وہ پار دالے محمدی حسین کا گڈا تھا۔ محمدی حسین، نور کا ہم عمر تھا اور اسی کی طرح گھڑو اور خبر برد۔ نور کے باپ کو محمدی حسین کے باپ نے ہی قتل کیا تھا۔ لیکن وہ عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا اور اب بڑھاپے نے اُس کی کمر دوہری کر دی تھی۔ محمدی حسین کو اس نے دشمنوں کے سامنے

کبھی نہ بھکنے کے سبق دیئے تھے اور اُسے لٹھ بازی میں طاق کر دیا تھا گاؤں۔
 دالے کما کرتے تھے کہ مہدی حسین کی لائٹھی سنتر گز تک مار کرتی ہے۔

اس لئے اپنا پیل اور گڈا نور کی طرح سجا رکھا تھا۔ نور کے قریب
 گڈا بدک کر اُس نے نور کو مسرت اور انہیت سے سلام کیا۔ نور اپنے
 گڈے سے اُس کے گڈے میں کود گیا اور اس قدر نور سے بغل گیر ہوا کہ مہدی
 حسین کا چہرہ لال ہو گیا اور اس کی ہنسی نکل گئی۔ میدان میں بکھرے ہوئے
 ہجوم میں سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو سمٹ سمٹا کر ایک قبر آلود ٹھنے میں
 سمٹ آئیں۔ ”بے غیرت، باپ کے قاتل کے بیٹے کو سینے سے لگا رہا
 ہے۔“ نور کے گاؤں والے اُس سے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

بچ میدان میں آگئے۔ ڈھول یکبارگی بج اٹھے۔ بکھرے ہوئے ہجوم میں
 کھلبلی مچ گئی اور میدان خالی ہو گیا۔ گڈے ایک طرف چل پڑے اور دُور
 ایک صف میں جا کھڑے ہوئے، تماشا ٹائی میدان کے دونوں طرف دیواروں
 کی طرح کھڑے ہو گئے۔ دونوں گاؤں سے چھ چھ گڈے دوڑ کے لیے
 آئے تھے جو بدری کوم دین میدان کے وسط میں ہاتھ میں چادر لیے
 کھڑا تھا۔ گڈوں کے پیل صف میں کھڑے بنے تابی سے کھڑا رہے تھے سولہ
 کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کو کانکھوں سے
 دیکھنے لگے۔

نور نے اپنا گڈا درمیان میں رکھا۔ دو گڈے بائیں، مہدی حسین کا گڈا
 تھا۔ نور بار بار مہدی حسین کو دیکھ کر مسکراتا تھا اور مہدی کی پُرشاب

مسکراہٹ اور زیادہ کھیل گئی تھی۔ فوڈ کے گاؤں والے نور کو قبر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”کم عمل کو ناشابی پتا نہیں کہ راضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن راضی نامے کا یہ مطلب تو نہیں کہ دشمنوں کو یوں منہیں منہیں کر سلام کرتے پھریں۔“

میدان کے وسط میں کھڑے چھبدری کرم دین نے چادر اوپنی کر لی۔ ڈھول یکبارگی خاموش ہو گئے۔ تماشا یوں کے ہجوم پہ سناٹا چھا گیا۔ سواروں نے سیلوں کی رستیاں تان لیں اور جابک لہرانے لگے چھبدری کرم دین نے چادر ہلا کر جھٹکے سے نیچے کی، اور بھاگ کر میدان سے نکل گیا۔ کائنات کا یہ جھباہا جیسا سکوت۔ ”ہلا نیلے..... اللہ بیل گئے..... اللہ ای اللہ“ اور سیلون کے گھنگھروؤں، گھنٹیوں اور قدیموں کی بے سنگم آوازوں اور مہیب جھنکار، ہجوم کی بلا شیری اور نعروں اور ڈھولوں کے شور سے قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

سائے پون کوں کھلا میدان تھا۔ راہیں اوپنی تھی میڈرھیں اور کہیں کہیں دھنٹ بھی تھے۔ کٹھے کاموڑ بھی تھا اور گڈوں کو پون کوں کی یہ نامور رسات چشم زدن میں ملے کر کے سبز جھنڈے تک پہنچا تھا بدویران سے ریلوے اسٹیشن سے ڈیڑھ دو سو گز اس طرف نصب کیا گیا تھا۔ ہجوم گڈوں کے ساتھ ساتھ بھاگ پڑا اور گڈے سو ڈیڑھ سو گز تک جس طرح ایک صف میں بھاگے تھے ابھی تک ایک ہی صف میں بھاگ رہے تھے۔ تازہ دم ہیل ہیے سمجھ گئے تھے کہ یہ اُن کے گاؤں کی عزت اور ناک کی دوڑ ہے مگر نیچے

رہ گئے تو نہ کوئی انہیں صابن سے نہلائے گا، نہ سینگوں پر تیل چھڑے گا، نہ یوں چھٹی کے دنگ رنگیلے دوپٹوں سے سجائے گا۔ بیل عزت و ناموس کے نام پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ گڈے نامہوار کھیتوں میں فٹ فٹ بھر اُچھلتے تھے اور اُن کے پیسے اچھل اچھل کر گھوم رہے تھے۔

اُگے جا کر گڈوں کی ترتیب بکھر نے لگی۔ نور نے اپنے بیل کی رستی کو بائیں طرف جنبش دی تو اُن کا گڈا مہدی حسین کے قریب چلا گیا۔ مہدی کے پیچھے اُسی کے گاؤں کا گڈا تھا، جس کا سوار مہدی اور نور کی طرح گٹھا ہوا جوان تھا۔ یہ دونوں پار والے گاؤں کی آمد اور لالچ کے رکھوالے تھے۔ ذرا آگے جا کر مہدی اور نور کے گڈے پہلو بہ پہلو ہو گئے۔ دونوں سینہ بھاڑ بھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ دونوں گڈے بائیسوں سے آگے نکل گئے تھے مہدی حسین سے پیچھے والے سوار کو آگے بڑھنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ اُس نے اپنے بیل کی رستی کھینچ کر گڈا نور کے پہلو میں کرنا چاہا لیکن نور نے دیکھ لیا اور اُس نے گڈا دائیں کر کے اُس کا راستہ روک لیا۔ پھر اس نے گڈا نور اور مہدی حسین کے درمیان سے نکالنا چاہا تو نور نے اپنے بیل کو مہدی کے قریب کر لیا مگر تیسرے گڈا مہدی کے پیچھے ہی رہا۔

گرد کے بادل اور نعرے آسمان تک جا پہنچتے تھے۔ ہجوم بھاگ بھاگ کر پسینہ پسینہ مرنے لگا۔ سب کی نظریں اب نور اور مہدی حسین پر تھیں۔ باقی گڈے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اگلی مینڈھن زیادہ اونچی تھی۔ تینوں گڈے بڑی زور سے اُچھلے۔ نور شکل سے سنبھلا۔ مہدی حسین گڈے میں گر

پڑا لیکن اٹھ بیٹھا۔ اس کا بیل جانفشانی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مہدی کے گاؤں کا دوسرا گڈا جڑاُس کے پیچھے چلا آ رہا تھا مہدی کے بایں پہلو میں ہونے لگا مگر فور نے اپنا گڈا مہدی کے پہلو میں دبا کر اسے دیکھیں ہو جانے پر مجبور کر دیا اور تیسرا گڈا مہدی حسین کے پیچھے ہی رہا۔ یہ نور کا کمال تھا۔

میدان آدھا طے ہو گیا تھا اور تماشا بینوں کا ہجوم تھک کر تتر بتر ہو گیا تھا۔ صرف وہی ساتھ دے رہے تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ نور نے اچانک اپنا گڈا دائیں کو کر لیا اور مہدی حسین کے گڈے سے آٹھ دس قدم پرے چلا گیا۔ نور کا بے ہوشنا تھا کہ مہدی حسین کے گڈے کا ایک پتہ کسی گڑھے میں دھنس گیا، پھر گڈا کی فٹ ہوا میں اچھلا مہدی گیند کی طرح اچھل کر بیل کے آگے جا پڑا اور اس کا گڈا اور بیل لڑھکنی کھا کر مہدی کے اوپر جا پڑے۔ پیچھے اسی کے گاؤں کا دوسرا گڈا اس کے ساتھ لگا چلا آ رہا تھا۔ ایک دو گز کا ہی فاصلہ تھا۔ گڈا روکنے کا دقت ہی نہ تھا۔ یہ گڈا بھی اچھلا اور مہدی کے اوندھے پیرے گڈے سے دھماکے سے ٹکرایا اور اس کا سوار اس تصادم میں پس گیا۔

گرد گشاک کی طرح اٹھی اور اس گڈا سے صرف نور کا گڈا بدستور بھاگتا ہوا نکلا۔ دوسرے دونوں گڈوں کو گرد نے چھپایا تھا۔ تھکا ہارا ہجوم تیزی سے بھاگا۔ پچھلے گڈوں نے دُخ موڑ لیے اور رک گئے۔ ان کے سوار کو دکر بھاگے، گھوڑا سواروں نے باگیں موڑ لیں اور یہ سارا انہرہ گرد پہ ٹوٹ پڑا

دیکھا مہدی حسین بھی اور اس کے گاؤں کا دوسرا سوا بھی مر چکے تھے۔

ایک میل کی گردن اور دوسرے کی کمر کی بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ آخری سالیں لے رہے تھے۔ مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں خوں میں لت پت تھیں۔ نور گڈے سے اتر کر بھاگ کر آیا اور اس نے اپنا شعلہ دار صاف سر سے اتار کر چہرے پر رکھ لیا جیسے سسکیاں لے لے کے رورہا ہو۔ سب نے دیکھا کہ وہاں ایک گہرا گڑھا تھا جس میں مہدی حسین کے گڈے کا ہتھیرا گیا تھا۔ مہدی کے گاؤں کے لوگوں نے نور کو قبر آلود نکا ہوں سے دیکھا اور ایک نے لڑتے، مڑھٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔ ”نور، تو مہدی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے گڈا پر سے کیوں لے گیا تھا؟“ ایک اور آواز آئی۔ ”نور، یہ خون تھیں بھنم نہیں ہو گا۔ تجھے معلوم تھا کہ یہاں گڑھا ہے۔“

”جو اللہ کو منظور تھا، بھائیو! نور نے اداس اور ملتی بچے میں کہا، میرا بیل بے قابو ہو کر پرے چلا گیا تھا۔ اپنی اپنی تقدیر ہے بھائیو، کمزور میں بھی اپنے گڈے تلے آکر مر جاؤں۔“

اس میدان میں جہاں نعرے گونج رہے تھے اور ڈھول بج رہے تھے مردوں کی ہچکیاں اور عورتوں کے بین گونجنے لگے، بیلوں کی گھنٹیوں اور گھنگھروں کی اداس اداس جھنکار نوحہ کرنے لگی۔ شام کو دونوں گاؤں نے ٹی کر مہدی حسین اور اس کے ساتھ مرنے والے کا جنازہ پڑھا قبرستان میں ایک اور آواز سنائی دی۔ ”نور، تمہارا اس طرح بدلہ نہیں لیا کرتے

تجھے معلوم تھا وہاں گڑھا ہے، ورنہ تم گڈا پرے کرتے، مہدی کو بھی خبردار
مکرو دیتے۔

”فورے؟ ایک اور دشمن سی ادا نہ آئی۔ تو نے باپ کے خون کا بدلہ
لے لیا ہے۔ اب ہماری باری ہے۔“

نور نے سن کر پراخ شاہ کے مرحوم باپ کے روضے کی قسم کھا کر کہہ دیا:
”مجھے معلوم نہ تھا وہاں گڑھا ہے میں نے انتقام نہیں لیا جس روز انتقام
لوں گا لٹکا کر لوں گا۔“

لیکن نور نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ اُس نے انتقام لے لیا تھا جو جس
موضع پارو لے گاؤں میں گڈوں کی دوڑ کا دن مقرر کر کے آتا تھا۔ اسی رات،
جب سارا گاؤں سو گیا تھا وہ کدال لیے میدان میں چلا گیا تھا اور اس
نے اطمینان ہے یہ گڑھا کھودا تھا، اس میں سوکھی جھاڑیاں رکھ کر کاریگری
سے ادھر مٹی بچھائی تھی اور مٹی ادھر ادھر بکھیر کر گندم کے خشک پودے
اور جھاڑیاں رکھ دی تھیں۔ دوڑ میں بھی تین روز باقی تھے۔ ان تین دنوں
میں سورج نے تازہ مٹی کو خشک کر کے کھیتوں کے رنگ سے ملا دیا۔ دوڑ
کے دوران نور نے بڑی ہوشیاری سے اپنا گڈا مہدی حسین کے قریب رکھا
تھا اور مہدی کے پیچھے والے گڈے کو اُسی کے پیچھے ہی رہنے دیا تھا اس
نے گڈے پر نشانی لکھی ہوئی تھی جو قریب آئی تو نور نے اپنا گڈا ایک
طرف کر دیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے خون کا انتقام تانل کے بیٹے سے
لے لیا تھا۔

استادی سے دو آدمی قتل کر دینے کے باوجود نور کی نظروں تک اس کے باپ کی لاش تڑپتی ہی رہی۔ اُس کے سینے میں جواگ بھڑک رہی تھی وہ صرف ایک ہفتہ تک ٹھنڈی رہی۔ جب مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں قبروں میں اتر کر نور کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس کی نظروں کے سامنے اس کے اپنے باپ کی خونچکاں لاش تڑپنے لگی۔ سینے کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ بچپن کی جو خون آلود یادیں ذہن میں جم گئی تھیں وہ دو خون کر کے بھی نہ دھل سکیں۔ اس سے پہلے وہ دشمنوں کے دوہل اور ایک بھینس زہر دے کر مار چکا تھا۔ ان کے کھلیاں جلا چکا تھا۔ پھر بھی وہ بے چین تھا۔ وہ شفقت اور پیار کی محرومی میں پل کے جوان ہوا تھا اور اس کے ذہن میں پیار کی جگہ باپ کی خونی آلود لاش کا بسیرا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ دونوں گاؤں کی دشمنی اور گہری ہو گئی۔ پہلے راضی نامے ٹوٹا کرتے تھے، اب رشتے ناٹے بھی ٹوٹ گئے۔ اب نہ ادھر سے بارات جاتی تھی، نہ اُدھر سے ڈولی آتی تھی۔ گاؤں کی شادیاں گاؤں میں ہی ہو جاتی تھیں۔ دونوں گاؤں میں اب دو دو چوکیدار رات بھر جاگتے تھے۔

نور اب گاؤں کا بیرو بن گیا اور لوگ اُسے گاؤں کی آبرو کا رکھوالا کہنے لگے۔

نور شام کے بعد گاؤں سے غائب رہنے لگا۔ کسی کو معلوم نہ تھا وہ کہاں جاتا ہے۔ پھر اس کے متعلق مشہور ہو گیا کہ وہ پاروائے گاؤں کے

چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت، کو اٹھا لانے کی فکر میں ہے، جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھا۔ کیونکہ گاؤں میں اب سبھی اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ وہ شادی کرے اور اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ”پار واسے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کو اٹھا لاؤں گا، زبردستی نکاح پڑھواؤں گا اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا۔“

اس دوران مہراں نے کئی بار اس کی راہ روکی اور ایک بار نور کو کہہ دیا۔ ”نور ایسا کروں گی تو تیرے ساتھ کروں گی، کسی اور نام کے ساتھ رجسٹر پر انگوٹھا نہیں لگاؤں گی، نہیں تو جس روز تیری بارات جائے گی اس روز میرا جنازہ اُٹھے گا۔“

نور مسکرا دیا۔ مہراں کی آنکھوں میں آنسو اڑا آئے۔ اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر نور کا گریبان پکڑ لیا اور ٹھپیاں بٹخ کر بھل : سچ بتا نورے ! تیرے سینے میں دل ہے یا پتھر؟

”جو کچھ تھا، دے آیا ہوں۔“ نور نے متانت سے کہا۔
”کس چڑیل کو؟“ مہراں نے اُس کا گریبان چھوڑ کر یوں پوچھا جیسے صدے سے پہلی لے رہی ہو۔

”مہراں ! وہ چڑیل ہی ہے۔“ نور نے دُکھی ہوئی سی آہ لے کر کہا :
”دیکھتا ہوں وہ مجھے کھاتی ہے یا میں اُسے کھاتا ہوں۔“ مہراں کا سر جھک گیا۔ نور نے اس کی ٹھوڑی تھام کر کہا ”چند روز اور انتظار کر لے مہراں نظر تو یہی آتا ہے کہ میرا گھر تو یہی بسائے گی۔“ اور نور مہراں کے دل میں

ایک مہرہ ڈال کر کھٹے کی طرف چل دیا۔
ایک سال گزر گیا۔

پاروائے گاؤں سے راتوں کو ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے
گیت سنائی دینے لگے اور نورے پر خاموشی چھاتی چلی گئی۔ پھر ایک روز
اُس گاؤں سے گلوں کے دھماکے اور ڈھول کے ساتھ باجے بھی بجتے
سنائی دیئے۔ نور جو شام کو غائب ہو جایا کرتا تھا اُس شام کھانا کھائے
بیغیر لیٹ گیا اور اندر سے دروازہ بند لیا۔ اس شام پاروائے چھبڑ
کرم دین کی بیٹی زینت کی شادی اسی گاؤں کے ایک آدمی سے ہو گئی تھی
— اسی زینت کو نور اٹھانا پاتا تھا، لیکن وہ نور کے انتقام کا نشانہ
بننے سے صاف بچ گئی تھی۔

ایک وہ وقت تھا کہ مہراں نور کی راہ روکا کرتی تھی اور اب یہ وقت آیا کہ زینت
کی شادی کے تیسرے روز نور نے مہراں کو راہ میں روک لیا اور اس سے
مسکراہٹ سے کہا — ”مہراں! کہو، تمہارے ماں باپ سے بات کروں؟“
اور اُسی چاند کی سحر صوبی رات مہراں کی ڈولی نور کے آگے آئی
اتری۔ وہ رات بڑی حسین تھی۔ سارا گھر اُن کا اپنا تھا۔ مہراں کی نہ ساس تھی نہ
شسر نہ خند، نہ بھانج۔ بس اللہ کا نام تھا اور مہراں نور کی پوجا کر رہی تھی۔
پھر عروسی کی شب گزر گئی، پچیس برس گزر گئے۔

نور اور مہراں اکیلے ہی رہے، نہ بچی نہ بچہ۔
نور کی جوانی اب گئے وقت کا قصہ کہانی بن گئی۔ نور آج وہ بھروسہ نور نہیں

نور چاچا بن گیا تھا۔ عمر کے بچاس برس بیت گئے تھے۔ سراور منچھوں کے بال کچھڑی ہو گئے تھے چہرے پر جوانی کی جو رونق تھی اُس پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھنے لگا تھا۔ تہراں نے جوانی نور چاچا کی خدمت میں گزار دی یا تھا ہوا اور مزاروں پر اولاد کے لیے نذر نیا ذریعے گذر گئے، پر تہراں کی گود بھری نہ ہوئی لیکن نور چاچا کو چنداں افسوس نہ تھا۔ گاؤں کا ہر بچہ اس کا اپنا ہی بچہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو کر گاؤں کے بچوں میں گھل مل گیا تھا اور انھیں اپنی جوانی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ بچوں میں وہی زہر گھول رہا تھا جو بڑے اس کے سینے میں بھر گئے تھے۔ لیکن نور چاچا اُن بزرگوں سے مختلف تھا۔ وہ نوجوانوں کو شوٹن کے آمنے سامنے آکر لڑنے سے روکا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دشمن کو استاد سے مارو۔ سانپ بھی مر جائے اور لالچی بھی نہ لوٹے۔

مہدی حسین کے استادانہ قتل کے بعد اُس نے زندگی کے بچیس برس پارواہوں پر زمین دوز حملوں میں گزار دیئے۔ اُس نے یہاں تک کیا تھا کہ دس برس گزرے قریب کے ایک اور گاؤں کا ایک آدمی جو بڑے قریب ایسے پُر اسرار طریقے سے قتل ہو گیا تھا کہ مہینہ بھر قاتل کا سراغ نہ ملا تھا۔ نور چاچا نے جھوٹی شہادتیں اور ثبوت فراہم کر کے پارواہ لے گاؤں کے ایک بے گناہ آدمی کو پکڑا کر عمر قید دلوا دی تھی۔ نور چاچا نے بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے کڑیاں ملائی تھیں جنہیں قانون نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

چند ہی برس گزرے ایک رات نور چاچا شہر سے لوٹ رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا جب وہ گاؤں میں داخل ہوا، ہر سواند صیرا سکوت تھا۔ اُسے

ایک آدمی کا سایہ ساقط رہا جو دبے پاؤں گل میں دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ نور چاچا اُسے دیکھنے کے لیے رُک گیا پھر دبے پاؤں اُس کے تعاقب میں چل پڑا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور بعض گھروں کے ڈھورے ٹگر باہر کی کھڑکیوں پہ بند تھے۔ وہ آدمی ایک کھڑکی کی طرف بڑھا تو نور چاچا کو اپنی جوانی کی ایک رات یاد آگئی۔ وہ بھی پارو اے گاؤں اسی طرح آدمی رات دبے پاؤں گیا تھا اور ایک کھڑکی میں زہر کی ٹپیا بکھیر رہا تھا۔

نور چاچا دبے پاؤں تیزی سے بڑھا اور دیکھے سے اُس آدمی کی گردن بازو کے گھیرے میں لے کر بازو کا شکنجہ دبا دیا اُس آدمی کے ہاتھ سے کوئی چیز زمین پہ گری۔ نور چاچا نے بازو کا شکنجہ اور تنگ کر کے اُس آدمی کے ہمیشہ میں زور زور سے گھونٹے مارے۔ ذرا دیر بعد بازو ڈھیلا کیا تو وہ آدمی لڑا ہک کر گر پڑا۔ نور چاچا نے بھینس دیکھیں، پھر دل پر ہاتھ رکھا، وہ مر چکا تھا۔ نور چاچا نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ سے جو چیز گری تھی وہ ایک پٹیا تھی۔ ویسی ہی پٹیا جیسی وہ برسوں گذرے، پارو اے گاؤں کی ایک کھڑکی میں ڈال رہا تھا۔

وہ آدمی پارو اے گاؤں سے آیا تھا۔ نور چاچا نے اُس کی لاش کو کندھے پہ ڈالا اور گاؤں سے باہر نکل گیا۔ رات کی گاڑی گندے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ریلوے لائن کو س بھر دوڑ تھی۔ نور چاچا لاش اٹھائے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔

دوسری صبح ریلوے لائن پر لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور ہر سو یہ خبر پھیل

گئی کہ پاروالے گاؤں کا ایک آدمی گاڑی تلے آکر کٹ گیا ہے۔

ایسے شمار ہی تھے تھے جواب، عمر کے بچا سو برس، نور چاچا گاؤں کے بچوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس کی فتح کا قابلِ داد پہلو تو یہ تھا کہ اُس نے دُھور ڈنگر بھی مارے تھے، کھلیان بھی جلائے تھے، قتل بھی کیے تھے اور پار والوں کو رہ رہ کے ایسے ٹرک مارے تھے کہ وہ رو پیٹ کر چپ ہو رہے تھے۔ لیکن پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے نہ بچوں میں بیٹھے کے کوئی جواز پیش کر سکتے تھے۔ پار والوں نے جی چراغ شاہ سے بڑے بڑے نوردار اور تباہ کن تعویذ لکھوائے تھے جن میں کچھ نور چاچا کے کھیتوں میں دبائے گئے لیکن جی چراغ شاہ کی کرامات نور چاچا کی استادی کے سامنے بے اثر رہی۔

جن چراغ شاہ کے باپ کے مزار اور دونوں گاؤں کے مشترک قبرستان کے درمیان پتھر والی کا گھنا جھرمٹ تھا جھرمٹ تلے جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ قبرستان سے مزار کی طرف جاؤ تو جھرمٹ کا چکر کاٹ کے جانا پڑتا تھا۔ جھرمٹ گھنا بھی تھا وسیع بھی۔ اندر سے گذرنا آسان نہ تھا اور اس وجہ سے کوئی جھرمٹ کے اندر سے نہیں گذر کرتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی تھیں گاؤں کے اکثر لوگ جن چراغ کی گدی کی فیسیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے وہاں چڑیلوں کو دیکھا ہے۔ ایک روز نور چاچا وہاں سے گزر رہا تھا تو ٹھٹھک کے ایک پٹر کے تنے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اُسے جو منظر دکھائی دیا اس سے اس کا پسینہ نکل آیا۔ اُسے یوں لگا جیسے پاروالے اُس کی

لاش پہ ڈھول پیٹ رہے ہیں اور اس کی ناک کتے چاٹ رہے ہیں۔
 اُس نے دیکھا کہ پیڑوں کے جھڑمٹ تلے، جھاڑیوں کی اوٹ میں اُس
 کے گاؤں کی ایک کنواری لڑکی، رضیہ، پارو اے گاؤں کے ایک جوان سال
 آدمی کے ساتھ بیٹھی بنس کھیل رہی تھی۔ رضیہ کا باپ فوج میں مجبور تھا۔ وہ
 اپنے باپ کے ساتھ چند مہینے گراچی بھی رہ آئی تھی اور وہ آدمی فوج میں
 لیفٹیننٹ تھا۔ اور ان دنوں چھٹی آیا ہوا تھا۔ نورچاچا کو حکم سنا آیا اور اُس
 نے معاً سوچا کہ پہلے جا کر رضیہ کے باپ کو قتل کر دے، جس نے لڑکی کو شہر
 کی ہوا لگا کر اس قدر بے حیا بنا دیا تھا۔

نورچاچا کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت چمکدار بھل والی کلہاڑی تھی
 وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کی جس آبرو کا وہ رکھوالا تھا وہ دشمنوں کے ایک
 جوان سال آدمی کے قدموں میں پڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور وہ
 دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر رہے۔

جوانیاں دنیا سے بے خبر ہو کے ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔ نور
 چاچا اس آدمی کو خوب جانتا تھا اس کا نام انور تھا۔ پچیس پچیس برس
 کا وہ خوبصورت نوجوان چہرہ پر کرم دین کی اسی لڑکی زینت کا بیٹا تھا
 جسے نورچاچا جوانی میں اغوا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نور جو آسمان سے تارے
 بھی توڑ لاتا تھا اسے اغوا نہ کر سکا تھا۔ آج وہ بھی پچاس برس کی بڑھیا
 ہو چکی تھی اور اس کا بیٹا انور، نور جو، نورچاچا، فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔
 نورچاچا، انور اور رضیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اُس کی

طرف پٹھے کیے بیٹھے تھے۔ وہ اُن کی طرف بڑھا تو رضیبہ نے اپنا سر انور کے کندھے پر بھینک دیا اور انور نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھائیں۔ نور چاچا رُک گیا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھجک گیا اور طویل آہ بھر کر بے پاؤں پیچھے کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح سر جھجکاتے گاؤں میں داخل ہوا گھر گیا اور لیٹ گیا۔ وہ بچت کو گھسور رہا تھا۔ اس پر ایسی خاموشی کبھی ٹاری نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سر کبھی یوں نہیں جھکا تھا۔ مہراں نے بہت پوچھا لیکن اس نے ادا اس سی مسکراہٹ سے اُسے ٹال دیا۔ صرف ایک بار کہا: مہراں! بڈھا ہو گیا ہوں، اب تھک جاتا ہوں۔“

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ اُس نے دونوں کو قتل کیوں نہ کر دیا لیکن یہ خیال بھی اُگیا کہ اچھا ہوا وہ وہاں سے کھسک آیا اور انھیں قتل نہ کر بیٹھا۔ وہ مطمئن بھی تھا، بے قرار بھی اور اطمینان اور بیقراری کا تضاد اُسے بے حال کر رہا تھا۔

اسی رات کے دوسرے پہر نور چاچا کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے باہر آکر دروازہ کھولا۔ باہر بچے پرانے کپل میں لیٹا ہوا ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بغیر سلام کیے اندر آگیا اور بولا: پرانی سی ہوں، بڑی دُور سے آ رہی ہوں، صبح چلا جاؤں گا۔“

نور چاچا اُسے اندر لے آیا۔ جب اُس نے لائٹن جلائی تو اس آدمی نے کپل اتار پھینکا اور بولا: — نور چاچا اچھا ہو تو مجھے بھی قتل کر دو خالی ہاتھ تمہارے گاؤں آیا ہوں۔“

وہ پاروائے گاؤں کا انور تھا۔ مہراں ہی جاگ اٹھی تھی اور حیرت زدہ نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”ایک بات کرنے آیا ہوں چاچا! انور نے کہا۔

انور چاچا نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور گہری سانس لے کر کہتا ہے بولا: ”بیٹھ جاؤ۔“

”میں جانتا ہوں ہمارے گاؤں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔“ انور نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے گاؤں میں یوں چوروں کی طرح آکر زندہ لٹل جانا ممکن نہیں۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں میں تم داسدا دی ہو جو صحیح معنوں میں مرد ہو۔ تمہارا دل گردہ ٹھنڈا دُور مشہور ہے اور نور چاچا جو مرد ہو وہ گھراٹے مہمان کو بے آبرو نہیں کیا کرتا۔“

نور چاچا عجیب طرح ہنس دیا۔ خالی خالی لمبے میں بولا: ”میں تم لوگ اس قدر وحشی سمجھتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم فرج میں ایفینٹ بن گئے ہو لیکن ہم کوئی ایسے گئے گذرے تو نہیں۔“

”مہدی حسین اور افضل کو تم نے قتل کیا تھا چاچا! انور نے مسکرا کر کہا۔

”شب خال کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر تم نے پھینکا تھا....“

”تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، انور! نور چاچا نے اُسے

گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: تمہیں کمائیاں سنانے والوں نے

شاید یہ نہیں بتایا کہ مجھے مہدی کے باپ نے اس وقت قتل کیا تھا جس

وقت میں خفا سا بچہ تھا..... خیر، یہ قصے بڑے لمبے ہیں، بیٹا! اُس نے گھر آئے دشمن کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا: کہو تم میرے گھر کیوں آئے ہو؟

”میں تمہیں طعنے دینے نہیں آیا، چاچا! انور نے کہا: تم وحشی ہو تو ہمارے گاؤں والے بھی درندے ہیں، خود غار وہ تم سے اچھے تو نہیں۔ میں اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے جا رہا ہوں، صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں کے رشتے ناطے کھباڑیوں، برھسیوں اور ٹوکوں سے کٹ گئے ہیں میں نے سنا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب دونوں گاؤں سے برائیاں اور ڈولیاں آتی جاتی تھیں۔“

”خون خرابے اس وقت بھی ہوتے تھے۔“ مہراں بول اٹھی: ”سہاگنوں کے سہاگ اُڑ جاتے تھے اور.....“

نور چاچا نے ہاتھ کے اشارے سے مہراں کو چُپ کرادیا اور بولا: ”تم بات کیے جاؤ بیٹا! لیکن ایک بات بتا دوں۔ میں راضی نامے کی بات نہیں سنوں گا۔ راضی نامے بہت ہوئے تھے، اب نہیں ہوں گے۔ تم پڑھ لکھ کر عزت غیرت شہر دوں میں ڈلو آئے ہو۔ لیکن ہم لوگ اب بھی یہاں ناک کی قدر خوب جانتے ہیں۔“

”نہیں نہیں چاچا! انور نے کہا: میں تم پر یہ الزام دھرنے نہیں آیا، نہ اپنے بزرگوں کی وکالت کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور مہراں کی طرف دیکھ کر ملتی لہجے میں بولا: چاچا جی

اگر تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ تو..... نور چاچا نے مہراں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ تو انور نے آہ بھر کر کہا: ہمارے رشتے ناٹے ٹوٹ چکے ہیں، نور چاچا! لیکن دونوں کے رشتے ٹوکوں سے نہیں کاٹے جاتے..... انور کے بچے میں جذباتیت کا رنگ نکھر آیا اور اس نے رنجیدہ سی آہ بھر کر کہا: میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں چاچا!..... پتہ نہیں تم نے جوانی میں کسی کو دل دیا تھا یا نہیں؟ پتہ نہیں تم نے کسی سوسنی کو اپنی ران کے قتلے جنوں کے کھلائے غصے یا نہیں؟ کوئی سوسنی تیرے لیے کبھی چناب کا سینہ چیر کر تیرے پاس سنبھلی تھی یا نہیں.....؟ معلوم نہیں چاچا! تم نے جوگی بن کے اپنے کان کسی چھداوائے تھے یا نہیں اور در در پہ سدا لیں لگائی تھیں یا نہیں؟..... تیرا دل مرجھا گیا ہے، نور چاچا! تجھے شاید دل کی دھڑکنیں یاد نہیں رہی ہوں گی.....؟

رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا اور سکوت اس سے بھی زیادہ گہرا۔ انور کی جذبات بھری باتوں نے نور چاچا پر کچھ اور کیفیت طاری کر دی۔ عین اس وقت فور کہیں رات کے سکوت سے کسی کی بڑی ہی سریلی اور بڑی ہی پُرسوزے سنائی دی۔ جانے کون شب کی خاموش تیرگی میں بیت الاتپا جا رہا تھا۔

رے رات کالی تانگ یار والی دل چاہ شوق من دتر کٹر کے
اک در بند رو جا در بان دشمن جے میں در کھولاں در بے پر کھڑ کے
مُستے ہوئے در بان نوں دیکھ کے تے بُریں چلا تے پیر نی بخیر کھڑ کے

سایاں جنہاں نوں غم اے یار والا سنے بُدیاں انہاں سر پر کھڑکے
ادھر انور کی باتیں عشق کا سحر بگا رہی تھیں، ادھر رات کی تاریکی سے
اُبھرتے ہوئے مترلہ بولِ طلسم طاری کر رہے تھے۔ نور چاچا کے جسم نے
بھر جھری لی۔

”میں نے وہ سو سنی دیکھی تھی، انور! نور چاچا یوں بولا جیسے خواب
میں بڑبڑا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بڑی دُور جھانک رہی تھیں تو مجھے
چناب کی لہروں پر نہیں، جلتے کھلیا نوں اور خون کے بہتے دریا میں تیر
کے ملنے کیا کرتی تھی۔۔۔۔۔ نور چاچا کی آواز دب گئی۔

”آج ایک اور سو سنی بھڑکنے شعلوں میں تیر کے میرے پاس آتی ہے
نور چاچا! انور نے جذباتی لہجہ میں کہا: ”آج رات میں بھی ان شعلوں میں
کو دکر آیا ہوں۔ انگ انگ جل رہا ہے، چاچا!“

نور چاچا کے چہرے کا تاثر یکسر بدل چکا تھا اور اس کی آنکھیں بے
چینی سے خلاءوں میں بھٹکنے لگی تھیں، جیسے یادیں اور تصور اسے بڑھاپے
سے اٹھا کر انور کی عمر میں لے گئے ہوں۔

”انور! نور چاچا نے اپنائیت سے کہا: تمہیں رضیہ کا رشتہ نہیں مل
سکے گا۔“

انور نے چونک کے کہا: ”تم نے کیسے جانا کہ میں رضیہ کا رشتہ مانگنے
آیا ہوں؟“

”میں کیا نہیں جانتا، بیٹے! نور چاچا نے کہا: لیکن میرے گاؤں کا رشتہ

تیرے گاؤں نہیں جائے گا۔ کوئی صورت ہی نہیں۔“

”تم چاہو تو اس کے ماں باپ راضی ہو جائیں گے! نور نے کہا۔

”نہیں! نور چاہا نے سر ہلا کر کہا۔ میں اس گاؤں کی آبرو کا رکھوالا

ہوں، میں کس طرح کہہ دوں کہ آبرو دشمن کے حوالے کر دوں میں بھی ہاں

کر لوں؟ یہ ممکن نہیں۔“

”رضیہ میرے سامنے ساتھ لکل جانے کو تیار ہے۔“ نور نے کہہ کر دیا

لیکن وہ لرز اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ نور چاہا اپنی ناک پر اتنی غلیظ کھچی نہیں

بیٹھنے دے گا۔

”تو نکال لے جاؤ۔“ نور چاہا نے مسکرا کر کہا۔

”لیکن تمہارے گاؤں سے ایک تھکامی اٹھالے جانا آسان تو نہیں۔“

انور نے کہا: اگر رضیہ کو نکال لے جانا آسان ہوتا تو میں تمہارے پاس آنا

ہی کیوں؟ مجھے اپنا ڈر نہیں چاہا! پکڑے گئے تو تم لوگ رضیہ کی بوٹی بوٹی

کر دو گے اور تم اپنا بڑھا پامیر سے خاندان کا تچہ بچہ زمین کے نیچے نیچے آکر

ختم کرنے میں گزار دو گے۔“

”تم نے زینت سے بات کی ہے؟ نور چاہا نے پوچھا۔

”زینت؟“ انور نے پوچھا: یعنی اپنی ماں سے؟

”ہاں، ہاں! نور چاہا بولا: تم زینت کے بیٹے ہو، نا؟“

”ہاں چاہا!، نور نے کہا: میری ماں میری رازداں ہے۔ سچی بات

بتاؤں چاہا، مجھ سے ماں نے ہی کہا تھا کہ چوری چھپے نور چاہا کے پاس

چلے جاؤ۔ وہ نہ ملنے تو اسے کہنا کہ زینت لے کہا ہے، یہ کام ضرور کرتا ہے۔
 نور چاچا کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا، دروازے تک گیا اور سر
 جھکانے لوٹ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹپکنے لگا۔ رات کے سکوت کو گیلڈوں
 کی بھیا بھیا جھنجھکیوں نے جھنجھوڑ کے لکھ دیا۔ جب گیلڈوں کی چیخ چنگھاڑ بند
 ہوئی تو کتے یکبارگی بھونک اُٹھے۔ نور چاچا سرتاپا کانپ اٹھا۔ جی سی
 آواز میں بولا: ”اُو چلیں۔“

تھوڑی دیر بعد مہراں اس کمرے میں آئی تو کمرہ خالی تھا اس نے آہ
 بھری اور زیر لب بولی: ”آہ بیٹوں بھی ٹوڑے کے نام کھاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ
 تو نے نہ یاد اے کسی انسان کو کبھی نہیں بخشا۔“

بہت دیر بعد نور چاچا آگیا۔ مہراں نے فوراً پوچھا: ”لاش کہاں پھینک
 آئے؟“

نور چاچا چپ چاپ کمرے میں ٹپکنے لگا اور افسردہ سے لہجے میں بولا:
 ”نہیں مہراں میں اُسے کشتے سے پار چھوڑ آیا ہوں۔۔۔۔۔ وہ میرے ہاتھ سے
 زندہ نکل گیا ہے میں اسے خود ہی چھوڑ آیا ہوں۔۔۔۔۔“ نور چاچا رنجیدہ تھا
 اور رنج بھی دیا۔ سوگوار سی سنسی حیرت زدہ مہراں کو پیار بھری نظروں سے
 دیکھتے ہوئے بولا: ”تم حیران ہو رہی ہو، لیکن مہراں! یہ لڑکا آج میرے سامنے
 وہی خواب بکھیر گیا ہے جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ بھولی بسری باتیں یاد کرا
 گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے مہراں جب ہم نے جراتی میں مجھے رام میں روکا تھا تو
 میں نے کہا تھا کہ میں دل کسی کو دے چکا ہوں۔ تم نے بہت پوچھا تھا لیکن

لیکن میں نے نہیں بتایا تھا۔ پھر تم شادی کے بعد بھی پوچھتی رہی تھیں کہ وہ کون ہے؟ لیکن میں نے یہ راز اپنے سینے ہی میں رہنے دیا تھا..... آہ، مہراں آج تمہیں ایک کہانی سناؤں۔“

مہراں حیران تھی کہ نور چاہا کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے اُس نے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نور چاہا پلنگ پر بیٹھ گیا اور جذبات سے زندگی ہوئی آوازیں بول لگتے تھے شاید سنا ہو گا کہ میں نے جوانی میں قسم کھائی تھی کہ میں پاروالے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت، کو اٹھا لاؤں گا۔ اس سے نکاح پڑھاؤں گا، اور طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا، مہراں!..... میں کئی راتیں پاروالے گاؤں چوروں کی طرح جلتا رہا اور اندھیرے اندھیرے میں چوہدری کرم دین کے گھر کے بکرا کاٹ کر اس کی بیٹی کو اٹھا لائے گا۔ لیکن وہاں چوہدری بھی تھے اور کتے بھی۔“

نور چاہا نے آہ بھری اور آنکھیں سکیڑ کر بولا: ایک شام میں گاؤں سے جلدی نکل گیا سورج غروب ہوئے میں ابھی کچھ دیر تھی میں پیڑوں کے جھنڈ سے گھنٹا تھا کہ مجھے چوہدری کرم دین کی وہ بیٹی اکیلے آتی دکھائی دی جسے میں راتوں کے اندھیرے میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ مزاحیہ سلام کے ساتھ آئی تھی..... آہ، زینت! وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ تمہیں اس کی جوانی اور حسین یاد ہے، نا مہراں؟ اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہے، لیکن مجھے اسی طرح نظر آ رہی ہے، جس طرح پیڑوں کے جھنڈے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اسے زبردستی

اٹھالائے کی جو قسم کھائی تھی اُسے دیکھ کر ٹوٹنے لگی ایکسو میں سنبھل گیا اور اسے روک کر کہا: "میں تجھیں اٹھالے جاؤں گا زینت! اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی: "سچ کہتے ہو نور؟ قسم کھاؤ تم مجھے اٹھالے جاؤ گے، اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ اللہ قسم نور! میں ابھی ابھی شاہ جی کے مزار پر زینت مان کر آئی ہوں کہ نور میرے ماں باپ کے ہاں رشتہ مانگنے آئے اور وہ ہاں کر دیں، مہراں! میں نے کلباڑی پھینک کر اسے سینے سے لگا لیا، نور زینت نے اپنا لال انگارہ گال اس قدر نور سے میرے ہونٹوں پر رکھ کر دبا دیا کہ میری قسیں ٹوٹ گئیں۔ جہانے ہم کتنی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ اس نے کہا، میں مرد کی سچی ہوں اور کسی مرد سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ جو حوصلہ تم میں ہے وہ دونوں گلاؤں کے کسی مرد میں نہیں۔"

مہراں کے آنسو جاری ہو گئے۔

نور پلنگ پر مہراں کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "پھر ہم بیڑوں کے اسی گھنیرے جھرمٹ تلے ملتے رہے۔ وہ مجھے اپنے ماں باپ کے پاس جا کر رشتہ مانگنے پر مجبور کیا کرتی لیکن میں نہ اسے دل سے اتار سکا نہ اس سے ملنے سے باز رہ سکا اور اس کے ماں باپ کے پاس رشتہ مانگنے بھی نہ جاسکا۔ باپ کے قاتلوں کے گلاؤں میں غیرت دالے بھیج مانگنے نہیں جایا کرتے مہراں!....."

"پھر وہ روز آیا کہ زینت کو کھڑے اٹھالے گئے شادی سے چند باتیں

پہلے وہ مجھے ملی اور کہنے لگی: "ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ لیکن نور! آ قسم کھائیں کہ ہم اپنے بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے سے بیاہیں گے، اور میں نے سب کدورتیں بھول کر مولا علیؑ کی شکل کشا اور بیچ تن پاک کی قسم کھالی کہ میں اپنی پہلی بیٹی تمہارے پہلے بیٹے کو دوں گا۔"

نور چاہا نے چپ چاپ بیٹھی مہراں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "لیکن میرے اولاد نہ ہوئی، اور آج زینت کا بیٹا مجھے میری قسم یاد دلا گیا ہے!"

"اوہ، مہراں نے چونک کر پوچھا: "نور زینت کا بیٹا ہے نا؟ اور کو معلوم ہے کہ تم نے قسم کھائی تھی؟"

"نہیں، نور چاہا نے کہا: "یہ راز خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ آج صرف تمہیں سنار یا ہوں۔ اور نے کہا تھا کہ مجھ سے اس نے کہا ہے نور کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ رضیہ کا رشتہ دلا دے، لیکن مہراں، اور کو معلوم نہیں کہ جس اوش میں اس کی ماں مجھے ملا کرتی تھی وہیں آج وہ میرے گلاؤں کی سے آکر ملتا ہے۔ اپنی کوئی بیٹی نہیں، پر رضیہ، اپنے گلاؤں کی بیٹی تو ہے! میں نے اسے گود لیا ہے، اسے کہانیاں سناتی ہیں، میں شہر سے اس کے لیے روڑیاں لایا کرتا تھا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھو، مہراں! تم نے بھی مجھ سے محبت کی ہے۔۔۔۔۔ نور چاہا چپ ہو گیا اور یک لخت بلند آواز سے بولا: مہراں، عمر کے پچاس برس انسانوں کو ڈنگ مارتے گذار دیئے ہیں۔ میں نے تمام عمر بھوٹی قسیں کھائی ہیں، مہراں! جی میں آتی ہے ایک نیکی کر

مردوں - زینت کو جو قسم دی تھی وہ پوری کر دکھاؤں۔ بھیس برس گزرسے
 زینت نے مجھے کہا تھا کہ مرد کی پتی ہوں اور جو حوصلہ تم میں ہے وہ کسی مرد
 میں نہیں..... مہراں! زینت یہ نہ کہے تو مرد نہیں تھا۔... کہو مہراں!
 میرا ساتھ دو گی؟

”تجیں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا، نور! مہراں نے آپنچلی سے آنسو
 پونچھتے ہوئے کہا، امرنا جینا تیرے ساتھ ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟
 ”بس یہی کریں جو کچھ کروں اسے راز سمجھ کر اپنے سینے میں لے کر
 مرجاتا۔“

نور چاہا پہ خاموشی طاری ہو گئی۔ رات گزر گئی پھر سات روز گذر
 گئے اور نور چاہا پہ خاموشی ہی طاری رہی۔ اس نے دھچکار مارتے ارادہ کیا کہ رضیہ
 کے ابا باپ سے کہے کہ رضیہ کا رشتہ انور کو دے دیں لیکن دونوں گاؤں
 کے رشتے اسی نے خود توڑے تھے، اب اپنی ناک کی لیے حرمی گوارا نہ تھی۔
 آٹھویں رات نور چاہا گھر سے غائب ہو گیا۔ مہراں بہت بے چین
 تھی اور بے تابانی سے نور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی لیکن نور چاہا آج
 کی رات لوٹ آئے کے لیے نہیں گیا تھا۔ مہراں کے سینے میں ایک لہریلا
 راز ڈنک مار رہا تھا۔

دینازر سے پہ دستک ہوئی۔ مہراں نے بھاگ کر دروازہ کھولا لیکن
 نور نہیں تھا، رضیہ کا باپ تھا اس نے نور چاہا کے سعلق پوچھا تو مہراں نے
 کہا کہ کسی کام سے نکلا تھا ابھی لوٹا نہیں۔ بس آ ہی رہا ہوگا۔

رضیہ کا باپ اندر آ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مہراں اس کے دل کا حال جانتی تھی لیکن اُن جان بن کے بولی۔ ”کیوں بھائیاجی! کوئی خاص بات ہے؟“

”رضیہ کا کچھ پتہ نہیں۔“ باپ نے کہا۔ ”ہر جگہ تلاش کرائے ہیں۔ شام کو کہ گئی تھی کہ مزار پہ دیا جلائے جا رہی ہوں پھر واپس نہیں آئی۔ بوڑھے باپ کے اَلسو نکل آئے۔“

رضیہ کا مہراں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا۔ نور چاچا کے بندے مجھے پر دو گرام کے مطابق رضیہ شام کو رہی اس کے گھر آجھی تھی اور تھوڑی سی دیر پہلے نور چاچا اسے کسل میں لپیٹ کر ساتھ لے گیا تھا۔ اُدھر سے انور سوا کو س دور، ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے گھروالوں کو اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر جا رہا ہوں اور رات دیر سے لوٹوں گا۔ اس کی چھٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ وہ بہت دیر سے ریلوے سٹیشن کے اُدھر اندھیرے میں کھڑا نور چاچا اور رضیہ کا انتظار کر رہا تھا آدھی رات کو ایک مسافر گاڑی ایک اُدھ منٹ کے لیے رکتی تھی۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ نور چاچا جیسا زہری آدمی اپنے گاؤں کی بیٹی اس کے لیے اغوا کر لائے گا۔ اسے خدشہ نظر آ رہا تھا کہ نور چاچا اکیلا آئے گا اور اُسے قتل کر کے لاش ریلوے لائن پر پھینک دے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر اس نے اپنا پستول ساتھ لے لیا تھا۔

مسافر گاڑی آنے ہی والی تھی اور ریلوے سٹیشن کا ایک ہی قفل تھا

جوان گھٹے ہوئے سیٹھن ماسٹر کے پاس کھڑا تھا۔ انور کو اندھیرے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن انور چاہنے کبیل میں بیٹھی رضیہ اس کے سامنے لاکھڑی کی!

”انور! انور چاہا نے رقت آمیز لہجے میں کہا: میں اپنی عزت اور غیرت تیرے قدموں میں ڈالے جا رہا ہوں۔ اب اپنا وعدہ نبھاؤ، کہ تم میرا زانچہ سینے میں لے کے مر جاؤ گے اور یہ بھی کہ تم اپنے گاؤں کبھی واپس نہیں آؤ گے۔“ اُس نے انور کو سینے سے لگایا اور زیر لب بولا: ”تم زینت کے بیٹے ہو۔“

”انور چاہا! انور نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبایا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا: میں نے اُس روز بھی قسم کھا کر کہا تھا کہ رضیہ مل جائے تو ساری عمر گاؤں نہیں آؤں گا۔ اس گاؤں میں آکر کروں بھی کیا؟ یہاں افسانوں کے روپ میں بدردھیں بستی ہیں اور ایک دوسری کو برباد کرتی رہتی ہیں۔ یہاں پیروں اور ان کے تعویذوں کی حکمرانی ہے۔ لیکن میں تلوار کا دھنی ہوں۔ میں اس دہلیں کا باسی نہیں۔ میری دنیا اور ہے میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔“

”انور چاہا! رضیہ بول پڑی چمن چراغ شاہ کی ڈیوڑھی کی قسم مر جاؤں گی پر تیری ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دوں گی۔“

گاڑی ابھی دُور تھی لیکن انجن کی مدھم سی پتی دکھائی دے رہی تھی۔ انور چاہا نے انور اور رضیہ کے سروں پر ہاتھ بھیرا اور بولا: ”سنبھل کے اندھیرے میں گاڑی میں بیٹھ جانا۔“ اور اس کی آواز حلق میں ٹانگ گئی۔

نور چاچا تیزی سے چل پڑا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا لیکن وہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسی سمت جا رہا تھا جس سمت گاڑی کو جانا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ انور کی ماں سے اس نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا تھا۔ آج بچپن برس بعد اسے نبھا رہا تھا۔ لیکن اُسے خیال آ گیا کہ وہ گاؤں کی آبرو دشمنوں کی اولاد کے قدموں میں ڈال آیا ہے، وہ تو اس آبرو کا رکھوالا تھا۔ اس کے سینے میں بچپن کا ڈنک مارنے لگے۔ وہ تڑپ اٹھا اور رگ گیا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن پر رکنے ہی چلنے کی وسلیں دے رہی تھی۔ نور چاچا بہت دُور نکل گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ بھاگ کر رضیہ کو انور سے چھپیں لائے اور انور کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن چھینک دے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، خون آنکھوں میں چڑھا آیا اور وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا لیکن اس کے سامنے انور کا بھرا ہوا خوبصورت چہرہ آ گیا اور اسے آواز سنائی دی: "نور چاچا! تو نے کسی سوہنی کمری اپنی ران کے قتلے بھون کے کھلائے ہیں!"

وہ رگ گیا اور اندھیرے میں سے ایک رنجیدہ سی فسوانی آواز ابھری "نور! ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ آؤ قسم کھائیں کہ ہمارے بیٹے بیٹیاں....."

ایک آواز کل پرسوں ہی اس نے سنی تھی اور دوسری آواز بچپن سے چھبیس برس پرانی تھی، لیکن دونوں آوازیں کتنی قریب آگئی تھیں۔ نور چاچا

رک گیا اور اس کی نظروں کے سامنے انور کا تصور اور زیادہ نکھر آیا۔ جب تصور نکھرا تو انور کی آنکھوں سے زینت جھانکنے لگی۔ زینت کے رس بھرے ہنٹ ہٹنے لگے جیسے کہ رہے ہوں: نور! انور میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اسی جگر میں تیرے پیار کو چھپا رکھا ہے نور!

اور نور سر جھکاتے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ تصورات اسے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ پچیس برس گذرے۔ بیتے لمحوں کا تاننا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوٹ آیا اور نور زینت کو گھٹے ہوئے بانوؤں کے گھیرے میں لے کے ادھکسنے لگا۔ وہ چلتا چلا گیا جیسے خوابوں کی دنیا میں چل رہا ہو۔ زینت کے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے زینت یاد آگئی تھی۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ نور چاہا تو قریب ہی انجن کی وصل سنائی دی۔ تصوروں کا طلسم لوٹ گیا۔ گاڑی اس کے قریب آگئی تھی۔ انجن کی چھک چھکا چھک سے شب کی تیرگی لرز رہی تھی۔ گاڑی کے شور نے نور چاہا کو بھیجھوڑ کر یاد دلایا کہ اس گاڑی میں انور اور رضیہ جا رہے ہیں۔ اس کے پیچھے پرنفانتانہ مسکراہٹ آگئی: انور میری زینت کا بیٹا! اس نے زیر لب کہا: جس مردوں کی طرح اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

جب انجن اس کے قریب آیا تو بیہوش تاک کر گرٹا ہٹ سے نور چاہا کا سینہ دھٹنے لگا اور اس بھیانک شور سے اسے برسوں پرانی گتوں کی دھڑلاد آگئی، پھر اُسے مہدی حسین یاد آگیا اور یہ بھی یاد آیا کہ مہدی حسین اس کے باپ کے فانی کا بیٹا تھا اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ اپنے گاہوں کی

بیٹی کا ہاتھ اپنے باپ کے ٹانگوں کے گاوڑ کے لٹکے کے ہاتھ میں دے آیا ہے۔۔۔ وہ تو خود گاوڑ کی آبرو کا رکھوالا تھا!

انجن اور قریب آگیا۔ نور چاہا کاسینہ بڑی زور سے کپکپایا جب انجن بالکل قریب آگیا تو نور چاہا کلباڑی تان کر ریل کی پٹری کے وسط میں انجن کے سامنے آگیا اور تیز رفتار انجن پہ کلباڑی کا بھرپور وار کر کے لٹکا کر بولا ت رک جا، میرے گاوڑ کی آبرو کو یہیں اتار جا،۔۔۔۔۔“

کلباڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی اور نور چاہا کے جسم کے کئی ٹکڑے کرتی، مل کھاتی، انور اور رضیہ کو آغوش میں لیے، اندھیرے میں گم ہو گئی۔



سادات

بوتا

ڈائی روڈ پر پہلی بلڈنگ سات منزلہ ہے۔ اس کے بعد چار منزلہ بلڈنگوں کی ایک لمبی قطار بہت دُور تک چلی گئی ہے۔ میرے دوست نے سات منزلہ بلڈنگ کے قریب لوک کر مجھ سے کہا۔ تو دیکھو۔ اس سات منزلہ بلڈنگ کی چار درواری کے باہر سڑک کے کنارے جاس کے پٹر کے نیچے جو مچی مچی ہے نا۔۔۔

!.....

”ہاں!“

”یہ سات منزلہ بلڈنگ پانچ سال پہلے اسی مچی کی تھی!“

”پھر کیسے۔۔۔“ بتائیں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

یہ تم اسی مچی سے بوجھو۔ میرا دوست بولا۔

مگر اس وقت پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک انٹرویو کے لیے اسی بلڈنگ کی پانچویں منزل پر جا رہے تھے۔ جب انٹرویو سے ناکام ہو کر لوٹے تو میرا دوست تو اس قدر خفا اور بیزار ہوا دنیا سے کہ اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ اپنا انٹرویو ختم کر کے چلتا بنا۔ حالانکہ معاملہ صرف ڈیڑھ سو روپے کی دگری کا تھا!

بلڈنگ سے نکل کر میں شہلا شہلا مریچی کے پاس چلا گیا۔ مریچی بلڈنگ کی طرف پیٹھ کے پیڑ کے نیچے اپنا سامان رکھے آلتی پالتی مارے بدھ کی طرح گم مہم بیٹھا تھا۔ اس کا جسم کمزور نہ لگا تھا۔ نیچے صرف ایک دھوٹی تھی۔ سانوں سے سینے کے بال کچڑی تھے۔ ٹائٹ گنچی تھی۔ ہاتھ کھڑوے اور چہرہ گول ٹول تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، بے حد عکیلی اور مسکراتی ہوتی سی تھی۔ وہ اپنی بہیت اور شخصیت سے کسی طرح سات منزلہ بلڈنگ تو کجا، سات گز زمین کا مالک بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ — اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہ تھی سوائے اس کے کہ اس کی صحت بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور اس کے جسم کی کھال کھائے ہوئے چڑے کی طرح چمکتی تھی۔ مگر ایسے صحت مند اور کمزوری جسم تو اس شہر میں لاکھوں کے پاس ہوں گے۔ — سات منزلہ بلڈنگ کتنوں کے پاس ہوگی ؟

”پالش کہ مرمت ؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”دونوں !“ میں نے جواب دیا۔

مریچی نے میرے جوتے اتار لیے اور انھیں الٹ پلٹ کے غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا، یقیناً میرے دوست نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ — پھر خیال آیا۔ آخر پوچھ لینے میں ہرج کیا ہے ؟

”میں نے سنا ہے۔ تم کہی اس سات منزلہ بلڈنگ کے مالک تھے !“

مریچی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے اطمینان سے میرے جوتوں کو الٹ پلٹ کر انھیں بڑے غور سے دیکھتا رہا، جیسے وہ میرے جوتے دیکھنے

کی بجائے انہیں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اس نے اپنی نگاہ اٹھا کر میرے چہرے کی طرف دیکھا، گویا جوتے کے چڑے کو پڑھنے کے بعد میرے چہرے کے چڑے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

معلوم نہیں اس نے کیا دیکھا کیا پڑھا وہ آہستہ سے مسکرایا معلوم ہوتا ہے اس شہر میں نئے نئے آئے ہوئے مورچی نے مجھ سے کہا۔

”ہاں، نوکری کی تلاش میں آیا تھا!“

”اور وہ ملی نہیں! مورچی نے پھر کہا۔

”ہاں! مگر تمہیں کیسے معلوم ہے؟ میں نے پوچھا۔

مورچی نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھڑا سٹول میرے لیے پٹر کے سایے میں رکھ دیا اور میرے جوتے کو لکڑی کے ایک اڈے میں اٹا پھنساتے ہوئے بولا تاس سٹول پر بیٹھ جاؤ اور سٹول میں مام طوط پر سناٹا نہیں ہوں — مگر تم حقدار ہو سننے کے —“

”میں بچپن سے بیالیس برس تک کی داستان نہیں سناؤں گا، کیونکہ بچے سے پیر تک کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں درخت بہت سے گناہ کرتا ہے اور بہت بے گناہ اس پر وارد کیے جاتے ہیں۔ لوگ اس کی شانوں سے ٹٹک کر خود کشی کرتے ہیں۔ اور ڈاکو اس کے شتے سے ٹٹک لگا کے ٹوٹ کا مال سنبھالتے ہیں۔ اور درخت چڑیوں کو گھونسل بنانے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سانپ ان کے ٹٹے چراگے۔ درہن سے آسمان تک

سفر کرتے ہوئے ہری کوئیل کی کھال کس قدر موٹی ہوجاتی ہے۔ یہ ایک الگ
امتیہ ہے۔ اسے سنانے کے لیے نہ میرے پاس فرصت ہے۔ نہ تمہارے
پاس وقت !

موجی کا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں نے سٹول
اس کے قریب کھسکا لیا تاکہ اس کا کوئی لفظ مجھ پر ضائع نہ ہو !
”میں تمہیں اپنی پرانی زندگی کا صوف آخری واقعہ سناؤں گا جب میں
یہاں بیس برس کا تھا۔ اور جب میں نے زمانے کے سرد و گرم سے گزر کر ٹھیکہ
پر مٹ، کوڑھ، سمگلنگ، رش، بے ایمانی، رشوت، دھکی، عاجزی، خوشامد،
چاپلوسی، دھوکا دھڑی، غرضیکہ ہر طرح کی تگ و دم استعمال کر کے پانچ کروڑ
روپیہ اکٹھا کر لیا۔ کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور کسی معمول بے ایمان سے نہیں
ملتی ہے۔ اس کے لیے ایمان داری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہی ایمان داری
جو بے ایمانی کا طرح استعمال ہو سکے اور بینک سا سچ چاہیے جسے جھوٹ کی
طرح خرچ کیا جاسکے ! تم اسے نہیں سمجھو گے..... ڈیڑھ سو روپے کی
نو کرنی تلاش کرنے والے سے نہیں سمجھ سکتے۔ اتنی بڑی رقم کو حاصل کرنے
کے لیے جھوٹ اور سچ، معصیت اور معصویت، نیکی اور گناہ کو اسٹائن
کی اضافیت کی طرح استعمال کرنا پڑتا ہے۔“
میں چونک گیا۔

موجی نے میرے جوتے کا تالا گھولا کیا۔

لیکن کبھی میں بھی ہری کوئیل تھا۔ میری جلد بڑی نازک تھی اور ذرا سی بے

ایمانی مجھے گرم لو کہ طرح مجلس دینی تھی۔ اور صبح کی ہوا میرے لیے آسمان کی خوشبودیں لاتی تھیں۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ آسمان کی طرف دیکھنے کی بھی ایک سزا ہے!

”بیالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میری کھال موٹی اور کھردری ہو گئی تھی اب مجھ پر نہ کسی ٹوکا اثر ہوتا تھا نہ کسی خوشبو کا۔ بیالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میں نے دس کروڑ روپے کما لیے اور یہ سات منزلیں بلڈنگ جو تم قصبہ میں دیکھ سکتے ہو۔ یہ بھی کھڑی کر لی۔ اور سب سی جائداد — وزیر لوگ مجھے لینے کے لیے ہوائی اڈے پر آتے تھے۔ اور میں نے سوچا اب میں سب کچھ خرید سکتا ہوں۔ اور سب کو خرید سکتا ہوں۔“

”اور پھر دس کروڑ روپے انٹی میں رکھ کر جو میں خریدنے کو نکلا تو معلوم ہوا ہر چیز بکتی ہے۔ سیاست، مذہب، اخلاق، شہرت، دوستی، وفاداری، خوبصورتی، عشق، ادب، سائنس، شاعری..... ہر چیز مناسب بھاؤ سے بکتی ہے۔ دام لگاتے جالیے مال اٹھاتے جالیے.....“

”یہ جان کر دماغ اور بھی خراب ہو گیا۔ اور میں ہر ایک کو جو جس کی لو کہ پر رکھے نکلا۔“

”میرے دوست رام دیال ترپاٹھی نے مجھے بہت سمجھایا۔ تم زندگی کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ سٹے، کوٹے، پروٹ، لائسنس اور اسٹالنگ کے دھندوں نے تمہاری مت ماری ہے۔ زندگی کی اخلاقی قدروں سے تمہارا ایمان

اٹھ گیا ہے۔ تم سب کو اپنے ایسا ہی چوراہہ غرض کا بندہ سمجھتے ہو۔ حالانکہ آج بھی اس دنیا کیا، اسی شہر میں لاکھوں لوگ ایسے بستے ہیں جنہیں تمہارے روپے کی بالکل پروا نہیں ہے۔ اور جو تمہیں اور تمہارے روپے کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ اُ

”میں زور سے ہنسا۔“

”میری ہنسی سن کر ترپاٹھی کا چہرہ تھمتھانے لگا۔ عجبی کو دیکھو۔ کیا میں نے کبھی تمہارے دس کروڑ روپوں سے ایک کوڑی بھی مانگی ہے؟“
”تم بے وقوف ہو۔“

”میری طرح بے وقوف اور اپنی عزتِ نفس کی خاطر اپنی آن پر مٹ جانے والے اس شہر میں لاکھوں لوگ موجود ہیں؟“
”مجھے یقین نہیں ہے۔ میں نے کہا۔“
”آنا دیکھو۔“ وہ بولا۔

”مجھے بھی فوراً ہی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ روپے کی گرتی تھی، دماغ بھی گرم تھا۔ میں نے اسی وقت ایک اسٹینو کو بلا کے ایک اشتہار کا مسودہ اسے بتایا۔ جو دوسرے دن ٹائمز میں چھپ بھی گیا۔“

جوتے کھانے والے کو پانچ سو روپے انعام
جو شخص راتِ الحروف سے دس جوتے کھائے گا اسے پانچ سو روپے انعام
دیا جائے گا جو تے کھائے گا ٹائم وہی ہے جو دفتر جانے کا ٹائم ہے یعنی صبح
دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک!

جوتے کھانے والے ملاقاتی اپنی بی اے کی ڈگری ساتھ لائیں — بی اے کی ڈگری اور اپنا فوٹو دونوں کو ساتھ لانا لازمی ہے ورنہ جوتے نہیں پڑیں گے!

گوری چرن باگڑیا

، ٹرنز روڈ — بیٹی

دوسرے دن ٹائٹلز میں اشتہار دیکھ کر رام دیال ترپاٹھی دوڑ دوڑا کر سے پاس آیا —

”یہ کیا حماقت ہے؟“

”میں نے کہا تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ملک میں جوتے کھانا کس قدر میسر سمجھا جاتا ہے؟ آپ ایک آدمی کی لڑکی بھگا سکتے ہیں لیکن اسے جوتے بیس مار سکتے۔ پہلی بات وہ برداشت کر لے گا — دوسری نہیں..... ہرگز نہیں..... کسی طرح نہیں.....!“

”ہاں ایہ تو سچ ہے۔“ ترپاٹھی نے اقرار کیا۔

”اسی لیے میں نے اشتہار دیا ہے میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ زندگی کی قدیں کس قدر مل گئی ہیں!“

”مگر یہ بی اے کی پانچ کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”کیونکہ مجھے غریبوں پر بھروسہ نہیں۔ غریب کا اخلاق کیا اور اس کی اوقات کیا؟ وہ تو دس روپے کے لیے دس جوتے کھانے پر تیار رہتا ہے اسی لیے میں نے ٹریفول میں اشتہار دیا ہے تاکہ تم پر شرارت کی تلکدچی طرح کھل جائے۔“

”ترپاٹھی چپ ہو گیا۔ ہم دونوں انتظار کرنے لگے۔ گیارہ بج گئے، دو بج گئے تین بج گئے۔ ایک آدمی جوتے کھانے کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ جب چار بجے تو ترپاٹھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کیا کرتا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب ایک دبلا پتلا فوجی جو شکل و صورت سے بے حد ناقذ اور معلوم ہوتا تھا۔ ڈرتے ڈرتے انٹرویو کے لیے آیا اس نے اپنی ڈگری دکھائی، فوٹو دکھایا۔ جوتے کھانے کے لیے کسی پرائیویٹ کیبن کا بندوبست کیا ہے آپ نے؟“

”نہیں جناب، میں نے اس سے بڑی سختی سے کہا۔ جوتے سرعام ڈریں گے، پبلک میں، اس بلڈمگ کے باہر کے گروؤں میں؟“
 ”وہ کچھ لمبے سوچتا رہا۔ عجب پس و پیش میں تھا۔ پھر اس نے ایک مرد آہ بھری۔ اپنی بی اے کی ڈگری کو دکھایا۔ فوٹو کو جیب میں رکھا، وہ کچھ کچھ سنے بغیر چلا گیا۔“

”ترپاٹھی خوشی سے چکنے لگا۔“

”میں سوچنے لگا۔ سوچ سوچ کر میں نے کہا۔ غلطی میری ہے۔ میں نے انعام اس قدر کم رکھا ہے۔ ٹائٹل کو غریب لوگ تو پڑھتے ہی نہیں۔ ورنہ اب تک بہترے جوتے کھانے کے لیے آجاتے اور جو لوگ ٹائٹل پڑھتے ہیں ان کے لیے پانچ سو کی رقم بہت کم ہے۔ یعنی میں سوچتا ہوں کہ جب ان لوگوں نے اپنے ذہن کی ترازو میں ایک طرف اپنی عزت نفس اور دوسری طرف پانچ سو روپوں کو رکھا ہوگا تو روپوں والے پڑے کو بہت ہلکا پایا ہوگا۔ غالباً

عزت نفس کی فروخت کے لیے یہ طرح بہت کم ہے۔

دوسرے دن کے اشتہار میں میں نے نرخ بڑھانے کے ایک ہزار کر دیا۔
پھر بھی صرف تین آدمی آئے۔ انیسرے دن میں نے نرخ اور بڑھانے کے
دو ہزار کر دیا۔ اب کے پانچ آدمی آئے۔ یعنی کل آٹھ آدمی۔
سہارے شہر میں۔۔۔ میں غصے سے مات پیٹنے لگا۔ میرا فلسفہ ناکام ہوا چلا ہوا
تھا۔ اور ادھر تیرپاٹھی مجھے دیکھ کر قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ آپ لوگوں نے شاید
تیرپاٹھی کی تلخ ہنسی نہیں سنی ورنہ آپ وہی کرتے جو آگے چل کر میں نے کیا۔
میں نے تیرپاٹھی سے صلاح و مشورہ کیے بغیر انعام کی رقم دس ہزار
کر دی اور جوتوں کی تعداد بڑھا دی۔ جو شخص مجھ سے پچاس جوتے کھائے
گا اسے دس ہزار روپیہ یک مشت ملے گا۔ یہ پیش کش صرف دو دن کے
لیے کھلی تھی۔

دوسرے دن سورہے آٹھ بجے کے قریب تیرپاٹھی بھاگا بھاگا میرے
پاس آیا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
”کیا ہوا ہے میں نے پوچھا۔

”بلڈنگ کے باہر دو سو آدمی لائن لگا کر کھڑے ہیں۔ اور ابھی صرف
آٹھ بجے ہیں!“

”میں خوشی سے چپکنے لگا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے کہا۔ میں نے بینک سے پچاس لاکھ روپیہ
منگایا ہے۔ میں انہیں سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر ایک کروڑ روپیہ بھی صرف

ہر جہانے تو مضائقہ نہیں.....!

دس بجے کے قریب کیونتا تالیا ہو چکا تھا کہ پولیس کو بلوانا پڑا۔ اور ایک مجسٹریٹ کو بھی۔ — مجسٹریٹ ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ لیتا آیا کہ اسے میری ذہنی حالت کے معذوش ہونے کا شبہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرا دماغی معائنہ کر کے مجھے صحت مند قرار دیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ دماغ ضرورت سے زیادہ گرم ہے۔ میں اپنا کمپوٹر مہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔!

”ڈاکٹر ذرا سا مسکرایا۔ اپنا سامان سنبھالتے ہوئے بولا۔ اسے بھی ذرا — ہوتے کھلنے کا شوق ہے۔ — امید ہے آپ اسے نامی نہیں کریں گے۔“

”ڈاکٹر بھلا گیا تو باقاعدہ طور پر جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا۔ — مجسٹریٹ اور اس کے ساتھ دو حیوڑ بشل کلرک باقاعدہ ہر جوتے کھانے والے کافوٹو چیک کرتے تھے اور ڈگری دیکھتے تھے۔ اور اس سے ایک فارم پر دستخط کراتے تھے جس پر لکھا تھا، میں خود اپنی مرضی سے پچاس جوتے کھا رہا ہوں۔ — اس کی اخلاقی یا مالی ذمہ داری میرے سوا کسی پر عاید نہیں ہوتی۔!“

”اس کے بعد میں جوتے مارتا تھا۔!“

”اشرفیہ میں سے ہر طرح کے لوگ آرہے تھے، ہر مذہب کے اور ہر قوم کے، ہر رنگ کے، ہر نسل کے اور ہر پیشے کے میں ہر ایک کو جوتے مارتا تھا اور رام دیال ترپاٹھی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتا تھا۔ — اور

رام دیال تریاٹھی تھا کہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اور مارے شرم کے مجھے سے اٹکے نہیں ملا سکتا تھا۔ دو پہر کے قریب وہ کہیں غائب ہو گیا۔ مگر دو پہر کے قریب کیونرا شاہر ہو گیا تھا کہ ٹرر روڈ سے مارس، روڈ کے ناکے سے نکل کر یاٹھ سینما کے چوک تک پہنچ چکا تھا۔ لوگوں کا وہ شرمناک و ہم غصہ کہ پوس کو دوبارہ لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ کیونکہ دیر میں آئے والے لوگ کیڑے کے آگے والے حصے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جوتا کھانے کے لیے آپس میں وہ جوتا چلا کہہ الاماں!

”تین بجے کے قریب میرا جوتا ٹوٹ گیا۔ اور میں نے اس تلاش کو بند کر دیا چاہا۔ مگر میرے سامنے اس وقت ایک سفید ریش بڈھا کھڑا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

”مجھے جوتے مارو۔ مجھے جوتے مارو۔ مجھے دس ہزار روپے دے دو۔!“

”مگر میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے!“

”اس نے اپنے پاؤں سے اپنا پچھا چیل نکالا اور میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ کوئی ہرج نہیں۔ میرا جوتا لے لو۔ مجھے میرے ہی جوتے سے مارو۔ مگر مجھے دس ہزار روپیہ دے دو۔ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔“

”اس کے پیچھے ایک بڈھی کھڑی تھی۔“

”میں نے بڈھے کو بھگنا کے اس سے پوچھا۔ اماں! تو یہاں کیسا کرنے آئی ہے؟“

”جوتے کھانے آئی ہوں، بیٹا! وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تو، تو ماں ہے..... اپنی نذر دیکھو۔ اپنے سفید بال دیکھو..... تو عورت ہے میں تجھے کیسے جوتے مار سکتا ہوں؟“

”عورت تو سدا سے مرد کے پاؤں کی جوتی رہی ہے۔ چاہے وہ گریوٹ کیوں نہ ہو جائے۔“ بیٹا عجیب پر اتنا ظلم نہ کر، مجھے جوتے مار پچاس کے بجائے سو جوتے مارے مگر مجھے دس ہزار روپے دے دے اب میں اس دنیا میں کیلی ہوں۔ دس ہزار سے میرا بھلا ہو جائے گا۔“

”وہ دونوں بات پھیلا کر مجھے دعائیں دینے لگی!“

ٹھیک شام کے پانچ بجے میں نے جوتے ماننا بند کر دیا مگر لوگوں کی بھیڑ کسی طرح کم نہ ہوئی۔ ٹر ٹر روٹ پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بالکل کسی مذہبی یا قومی تہوار کا سا ہوا سماں تھا۔ خواہنے والے، روٹھی والے بھابھی والے طرح طرح کی صدا میں لگانے لگے۔ کیونکہ کترو میں کھڑے ہونے والے لوگوں نے رات بھر یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹنے کو تیار نہ تھا کیونکہ میں کھڑے ہونے والوں کی جگہ لینے کے لیے سو دے ہونے لگے۔ پانچ سو سے لے کر پانچ ہزار تک بولی دی جانے لگی۔ لوگوں نے اپنے گھروں سے کبیل اور سبز منگالیے۔ چائے والے گرم گرم چائے اور نان خطائی بیچتے پھرتے تھے۔ سگریٹ اور پان کباب اور کھجے، پوری اور بھاجی، سوڈا اور کوکا کولا بلکہ ٹھڑے کی بوتلیں تک بچنے لگیں۔ انعام حاصل کرنے کے لیے سنڈکیٹ بن گئے اور کئی امیر لوگوں نے جو خود آئے ہیں عار محسوس کرتے تھے، دس، بیس، تیس، چالیس چالیس نوٹ دے کترو میں گھسادیے۔

ان غنڈوں کو صرف ایک ہزار روپیہ ملے گا۔ باقی سب سیٹھوں کی حسیب میں جائے گا۔ راتوں رات بنی اسے کی ڈگری کے نرخ بڑھ گئے۔ جس ڈگری پر ڈرٹھو سر کی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ اسی ڈگری کے کاغذ کے لیے ڈیڑھ ہزار روپے تک کی آفر آنے لگی۔ گویا جوتیوں میں دال بٹنے لگی!

ترباٹھی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رات بھر وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صبح بھی نہیں۔ دس بجے پھر سے جوتے مارنے کا پروگرام شروع ہوا۔ اب کے پورس کا بندوبست زیادہ تھا۔ اور محشر بٹ بھی تین تھے۔ گویا روپے کے قریب ایک آدمی اپنے منہ پر چادر ڈالے میرے سامنے جوتے کھانے کے لیے پیش ہوا۔ میں نے اعتراض کیا۔ منہ پر سے جب تک چادر نہ ہٹائی جائے گی۔ میں جوتے نہ ماروں گا۔

”بہت پس و پیش کے بعد اس آدمی نے اپنے منہ سے چادر ہٹائی۔“
”یہ رام دیال ترباٹھی تھا!“

”تم.....؟ میں نے سحرت سے پوچھا۔“
”ہاں! وہ کھسیانا ہو کر بولا، مجھے سبق مل گیا ہے۔ اب تم یہ کیل بند کرو،“
”کیسے بند کر سکتا ہے یہ؟“ ترباٹھی کے پیچھے کھڑا ہوا ایک شخص بڑنے کر اسے پیچھے میں چلا یا۔

”میں نے آگے جھک کر دیکھا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا ٹھیکیدار ماما پرشاد تھا جس نے میری یہ سات منزلہ بلڈنگ تعمیر کی تھی!“
”تم یہاں کہاں سیٹھ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اے میری نسل کا رہبر! میں نے کہا کہ ایک کانٹریکٹ ملتا ہے جس میں لکھا ہے کہ اگرچہ اسے پچاس سو روپے کے عوض دیا جائے گا تو اسے پچاس سو روپے کے عوض دینا ضروری ہے۔“

”میں نے کہا، مگر میرے بنگ میں تو میرے پانچ کروڑ روپے جمع تھے وہ سب ختم ہو چکے ہیں۔“

”کوئی مضائقہ نہیں — یہ بلڈنگ بیچ دو۔ میں خریدتا ہوں!“

”میں نے کہا — میں جوتے مارتا مارتا تنگ کیا ہوں!“

”جوتے تو تمہیں مارنا ہی پڑیں گے!“

”ہم تو جوتے کھالے کھالے ہیں اور جوتے کھا کر بائیں گے۔“

”میں بہت سے لوگ چلائے۔“

”ہم نے کسی نے نعرہ لگایا — جوتا زندہ!“

”سینکڑوں لوگ جو زندہ باد کے نعرے لگاتے لگے۔“

”لیکشن اور وٹنگ کی فضا پیدا ہو گئی!“

”پھر ہر سوسے گولی چلنے کی آواز آئی۔“

”ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید لوگوں کو تپا پھیل گیا تھا کہ میں مزید انسان بائیں سے انکار کر رہا ہوں۔“

”دو آدمی گولی چلنے سے ہلاک ہو گئے تھے۔“

”پٹریش نے کہا — تمہاری پیشکش دو دن کے لیے ہے۔ تم لوگوں کو جوتا کھانے سے نہیں روک سکتے۔“

”ورنہ شدید بلوہ ہو جائے گا!“

”میں نے دو کروڑ روپے کی بلڈنگ ڈیزائن کر دی۔“

”میں نے دو کروڑ روپے کی بلڈنگ ڈیزائن کر دی۔“

”تین بجے تک باقی بلڈنگیں بھی نیلام ہو گئیں۔ اب صرف ایک، بنک کے حصے بچ گئے تھے۔ اس لیے میں بہت دھیرے دھیرے جوتا لگا رہا تھا کہ کسی طرح پانچ بجادوں اور بنک، بچالوں۔ مگر چار بجے کے قریب بنک کے حصے بھی فروخت کر دینے پڑے اور جب پانچ بجے تو میرا کل اثاثہ ختم ہو چکا تھا۔ میں جوتے بغل میں دبا کے بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔“

شام ہو رہی تھی۔ اور لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ سڑک کی حالت ایک ایسی لٹی پٹی شاہراہ کی تھی جس پر ابھی فرقہ دارانہ فساد ہو چکا ہو۔ بلڈنگ کے باہر اسی جامن کے پٹر کے نیچے گھسیٹو مچی جوتے بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”اے گھسیٹو، تو نہیں آیا۔ جوتے کھانے کے لیے؟“

گھسیٹو میری طرف دیکھ کر بڑی سادگی سے بولا: ”میرا میں جوتے بناتا ہوں۔“ جوتے کھاتا نہیں ہوں۔“

اس کی سادگی میرے دل کو لگ گئی۔ میں دہیں اس کے پاس اس سٹول پر بیٹھ گیا جس پر تم بیٹھے ہو!

”جب سے میں یہیں ہوں۔“ مجھے لوگوں نے طرح طرح سے مدد دینا چاہی میرا سدا بار پھر سے شروع کرنا چاہا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے بھی بدھ کی طرح گیان حاصل ہو چکا ہے۔“

میری لہیرے جوتے کو لے کر ماتھے سے لگا یا پھر اسے بڑی محبت سے

بوسہ دیا۔ اور بولا۔

”تب سے میں اسی جامن کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر جوتے بنا رہا ہوں اور ہر روز جوتے کو سلام کرتا ہوں جو تاجرا س جہد کا آقا ہے اور جو بوٹی ہے!“



خسوف:

راضی نامہ

محشریٹ کے سامنے لوگ پیش ہوئی۔

درخواست اس کے ہاتھ میں دی — اور رضی اتار کر محشریٹ کے پاؤں میں پھینکی — اور دونوں ہاتھ باندھ کر زار و قطار رونے لگی۔

”کیا قصہ ہے بی بی؟“ محشریٹ نے پوچھا

”میرے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہے — میری جان بچاؤ —“ دہکتے ہوئے لگی۔

”کیوں؟ کون مارتا ہے؟“

وہ روتے روتے بولنے لگی۔ جیسے گراموفون کی پیاپی کم ہونے لگے کچھ بھی سمجھ نہ آتا تھا۔ عاجز آکر محشریٹ نے عرضی پر نگاہ ڈالی۔ سائلہ نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے درخواست دی تھی۔ میرا چچا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ مقدمہ جو کس میں گیا۔ مگر وہ جوگہ ممبروں کو رشوت دے کر بری ہو گیا۔ اب میری جان کو خطرہ ہے۔ اس کو پابند ضمانت کیا جائے کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے اور نہ ہی میری شادی میں رکاوٹ ڈالے۔“ وہ تمہیں قتل کیوں کرنا چاہتا ہے؟“ محشریٹ نے پوچھا۔

لوگ نے سسکیاں بھرتے ہوئے سراٹھایا وہ میں بائیس برس کی

خوبصورت لڑکی تھی۔ گورارنگ، سرسبز نیلی اور لال پھولدار اوڑھنی۔ اس میں سے رنگتی ہوئی بالوں کی میٹھھیاں۔ آنکھوں کے گرد سرخ رنگ کے چھینٹے۔ ان میں سے ایسے ہوئے آنسو جو میلے زخموں پر بہتے ہوئے ٹھوڑی سے ٹپک رہے تھے۔ تپلی ستواں ناک کے ایک طرف پانڈی کا بڑا سا چکر۔ اور کانوں میں لٹکتے ہوئے پانڈی کے زیور۔ لباس پر ایک نظر سے مجسٹریٹ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ فلاں بلوچی قبیلے کی ہے۔

وہ مہراٹھا کراسے بکھیتی رہی۔ اور سسکیوں کو دبانے میں چہرے کی جلد مسکوڑتی رہی۔

”وہ کہتا ہے۔ تم قبیلے سے باہر شادی نہ کرو۔“

”تو تم کیوں کرتی ہو؟“ اس کا قبیلے میں زور ہے۔ اور وہ اپنے بھانجے کے

علاوہ میری شادی قبیلے میں اور کہیں نہیں ہونے دے گا۔“

”مختص عبا بھانجے سے شادی میں کیا اعتراض ہے؟“

”وہ تو نعم پاگل ہے۔“

”تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”وہ ایک پنجابی ہے۔“

”اور تمہارے چچا کو کیا اعتراض ہے؟“ وہ کہتا ہے۔ میں اس سے وٹو لاؤنگا۔

بلوچی قبیلوں میں دولہن کے والدین لڑکے سے دولہن کی جانی، عمر، حسن

اور سماجی درجے کے مطابق کچھ رقم دیتے ہیں۔ جو وٹو (Walu) کہلاتی ہے

— مجسٹریٹ سمجھ گیا کہ لڑکی کا چچا وٹو کی رقم کے لالچ میں اسے باہر نہیں

شادی کرنے دیتا۔

”تو وہ پنجابی کیا کہتا ہے۔“

”وہ بولتا ہے، میں دُلور نہیں دوں گا۔ ہمارے ملک میں رواج

نہیں ہے۔“

”اور تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں بھی دُلور نہیں مانگتی۔“

”کیوں تمہاری اس سے دوستی ہے کیا؟“

”نہیں۔“

”پھر تم کیوں ملکی رسم کے خلاف دُلور معاف کرتی ہو۔“

”میں معاف نہیں کر رہی۔ میرا چھوٹا بھائی ہے، وہ نا سمجھ ہے، مہصوم

ہے میں نے شرط یہ رکھی ہے کہ وہ پنجابی دُلور نہ دے۔ بلکہ اسے میرے

پاس رہنے دے۔ اور اس کو قلعیم دلوائے۔“ وہ راضی ہے؟

”ہاں۔۔۔ بالکل، مگر میرا چچا کہتا ہے کہ میں دُلوروں کا نہیں تو شادی

نہیں ہونے دوں گا۔ اور تمہیں قتل کر دوں گا۔“

محشریٹ کو لڑکی کی بات بہت مناسب معلوم ہوئی۔ اس کے دل میں لڑکی

کے لیے عزت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جو اپنے بھائی کی تربیت کی خاطر قبائلی رسم رواج

چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ ایسی کڑی روایات سے اتنی کھلی بغاوت کرنے

والے کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اُس نے قلم اٹھایا اور چچا کی طلسمی کے لیے

حکم لکھ دیا۔ لڑکی کو دوسری تاریخ دے دی۔

اگلی تاریخ پر چچا بھی آگیا۔ وہ کوئی چالیس سالہ صحت مند مرد تھا۔ سر پر
 بڑی سی پگڑی۔ اور نیچے گھجیر ڈالنے کی جھال میں سرخ چہرہ نانہ کی طرح دکھتا
 تھا۔ ڈھیلے ڈھالے بھاری کپڑوں میں وہ غصے سے بے کل بدبو ہاتھ تھا۔

اس لڑکی نے ہماری غیرت کو ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ قبیلے سے باہر نہیں جا
 سکتی۔ اس کو کوئی حق نہیں کہ قبیلے کی رسم توڑے۔ میں تو حجاب اسی
 کی بھلائی کے لیے کہتا ہوں۔ اگر رسم کے خلاف جائے گی۔ تو قبیلے والے
 ساری عمر مجھے طعنے دیں گے اور اسے مار ڈالیں گے۔ پہلے اس کی ماں بھی
 ہماری رسموں کا مذاق اڑاتی تھی۔ تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس لڑکی کو
 ہماری غیرت کا خیال نہیں جو یہ باہر جانا چاہتی ہے۔

لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ اُس نے اپنے چچا کو ظالم، غاصب، قاتل اور بدو
 تک کہ ڈالا چچا بھی اسے گالیاں دیتا رہا۔ دونوں کو جھگڑے سے روکنے کی
 بجائے مجھ پر بیٹ خاموشی سے اُن کو دیکھتا رہا۔ اور اُن کی باتوں سے کوئی
 نتیجہ نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔

”تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو۔“ بالآخر اس نے پوچھا۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بلا میں کلہ پڑھ کر کہتا رہا

کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں ہے۔ میں تو اس کے بھلے کی بات کرتا ہوں
 کہ قبیلے میں شادی کرے۔ یہ بے وقوف ہے۔ اور جوانی کے جوش میں اندھی
 ہو رہی ہو۔ اگر اس نے کوئی خراب حرکت کی تو قبیلے والے اسے مار ڈالیں گے
 — اس کا کوئی بزرگ نہیں ہے۔ اس لیے اسے سمجھانا میرا تو فرض ہے۔

محشریٹ نے غور سے اس آدمی کو دیکھا وہ بڑا سمجھدار اور جھانڈیدہ لگتا تھا۔ گھیری سیاہ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور گفتگو میں اعتماد تھا۔
 ”لڑکی کے والدین نہیں ہیں..... وہ بالغ ہے۔ تم اسے اپنی مرضی سے شادی کرنے دو۔ تمہیں اس بچائی پر کیا اعتراض ہے؟“
 ”وہ وٹور نہیں دیتا۔“

”مگر میں ہرگز نہ لوں گی۔“ لڑکی چلائی، ”اس حالت میں وہ میرے بھائی کو نہیں رکھے گا۔ اور وہ گلیوں میں در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔“
 ”بکو اس بند کر۔“ بچپانے اسے ڈانٹا۔ ”تمہارے بھائی کو میں جو رکھنے کے لیے تیار ہوں۔ تم خواہ مخواہ اس کی بات کیوں بچک میں لے آتی ہو۔“ آخر وہ میرا بھی تو بھتیجا ہے۔ مجھے نہیں اس کا درد۔“

بات جائز اور مقبول تھی۔ محشریٹ لے لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا: ٹھیک ہے۔ اگر لڑکی کو اپنے پاس رکھ کر تعلیم دلوائے تو تمہیں کیا ٹھکر ہے؟
 ”میں نہیں مانتی۔ اس کی بیوی اس سے گھر کے بڑے بڑے کام کر داتی ہے اور کھانے کو کچھ نہیں دیتی۔ اُسے توکر سے بھی بُری طرح رکھتی ہے۔ میں اس کو کیوں خوار کروں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ اور میں والدہ پر چچے کو کہاں ہو سکتا ہے۔“

محشریٹ لڑکی کی بات سے کچھ قائل ہو گیا۔ وہ پھر حجاب کی طرف متوجہ ہوا۔
 تم میری بات کا جواب دو۔ اگر وہ وٹور نہیں لینا چاہتی تو تم کیوں اصرار کرتے ہو؟

میں معمولی آدمی نہیں ہوں۔ قبیلے کے ستمبر میں شکار ہوتا ہوں۔ دُور کے
 بغیر تو فقیر سی بیٹی نہیں دیتا۔ ساری عمر لوگ مجھے طعنے دیں گے کہ کوڑے کے ڈھیر
 پر لڑکی پھینک دی۔ اس سے جناب میرا قبیلے میں ناک کٹ جانے کا عجیب
 اتنی تہمت نہیں ہے کہ رواج توڑ کر بے غیرت کہلاؤں۔
 ”مگر کئی لوگ دُور نہیں بیٹتے۔“

”وہ صاحب ان کے اپنے قبیلے کے رواج ہیں۔ ہمارا تو ایسا نہیں ہے۔
 مجسٹریٹ نے روہی قانون کی کتاب اٹھائی۔ بلوچستان کے قبائلی علاقوں
 میں روہی قانون چلتا ہے۔ اور صرف عدالت کی بجائے مجسٹریٹ اور جوگے
 ل کر اُسے نافذ کرتے ہیں۔ ہر قبیلے کا اپنا رواج ہے۔ اس لیے قانون کی پابندی
 بھی اس کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہیں۔“

کتاب میں لکھا تھا کہ اس قبیلے کی جوان کنواری لڑکی کا زبردور ایک ہزار
 سے تین ہزار تک ہے۔ اور بیوہ کا سات سو ہے۔ یہ لڑکی کے والدین وصول
 کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو اس لڑکی کا بالغ بھائی وصول کرتا ہے۔

”تمہارے بھائی کی عمر کیا ہے۔“ اس نے لڑکی سے پوچھا، وہ بھاگی گئی باہر
 سے ایک بچے کو لے آئی۔ اور اٹھا کر مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مجسٹریٹ اُسے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ مخصوص قبائلی لباس کے
 ٹخنوں تک لمبے کھلے کرتے میں بالکل گڑیا سی لگتا تھا۔ گورے لال چہرہ کے
 اوپر سنہری بالوں کی جھال رہا تھے پر گرہی تھئی۔ اور وہ موٹی موٹی معصوم آنکھوں
 سے مجسٹریٹ کو سہم کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی چار یا پنج برس کی ہوئی

اوں ہوں۔ کچھ عقل کرتا ہوں۔ آگے جھپٹا۔ لڑکی کو دھکے سے پرے کیا اور بچے کو اتار لیا۔ بچہ کچھ سمجھے بغیر اپنی گول گول انگلیاں لکھا کر حیرت خیز اسی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر بہن کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

بچہ اسی نے بچے کو اتار کر نیچے کھڑا کر دیا۔

محشریٹ پھر سے رواجی قانون پڑھنے لگا۔ اگر لڑکی کا بالغ بھائی نہ ہو۔ تو اس کا بچا یا دیگر پدری ورثا مال کی اجازت سے وکروصول کرتے ہیں۔ ان کے بعد سوتیلے بھائیوں کا نمبر آتا ہے۔ محشریٹ نے مال کی اجازت کے نیچے لکیر کھینچی۔ وہ سوچنے لگا کہ رواج کے مطابق مال کی اجازت بچا کے لیے ضروری ہے۔۔۔۔۔ مگر اس مقدمے میں تو مال بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں کیا مکمل اختیارات بچا کو مل جاتے ہیں۔ یا بالغ لڑکی کو مال کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور وہ آزادانہ رائے دے سکتی ہے۔۔۔۔۔ یا شاید بچا مال کی جگہ لے لیتا ہو۔۔۔۔۔

وہ کافی دیر سوچا رہا۔ اس نکتے پر کتاب کی ورق گردانی بھی کی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تب اس نے دو نمبر لڑکی کی مرضی کے چنے۔ دو بچا کی مرضی کے اور ایک اپنی مرضی سے ڈال کر پانچ آدمیوں کا جرگہ بنا دیا۔ اور اس مسئلے پر ان کی رائے طلب کی۔ جرگے کے سامنے کئی دن تک مقدمہ پیش ہوتا رہا۔ طریقہ نے گواہ پیش کیے۔ سابقہ فیصلوں اور راپیلوں کے اقتباسات پیش کیے گئے۔ بڑے بڑے معتبروں اور سرداروں نے جرگہ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور بالآخر رائے جرگہ محشریٹ کے سامنے پیش کی گئی۔

مگر اس میں اتفاق رائے نہ تھا۔

لڑکی کے نمائندوں نے کہا تھا کہ لڑکی کو مرضی کی اجازت ہے۔ اور چچا کے ممبروں نے لکھا کہ رواج کے مطابق ماں کی بغیر موجودگی میں چچا جائز نگہبان ہے۔ اور لڑکی کو اس کی بات ماننی چاہیے۔ انھوں نے اپنے اپنے خیال کی تائید میں کئی صفحے کا لے کر دیئے تھے۔ پانچوں ممبروں نے گول مول سی بات کر کے فیصلہ عدالت یعنی مجسٹریٹ پر چھوڑ دیا تھا۔

ان سب کی رائے پڑھ کر مجسٹریٹ نے ریڈر سے پوچھا: تم بھی تو وہیں بیٹھے تھے۔ یہ ہر گے والے آپس میں راضی کیوں نہیں ہوئے؟ ریڈر نے چہرہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور کسی کو قریب نہ پا کر بولا: آج کل ہر طرف ایک ہی حال ہے صاحب۔ کہیں پارٹی بازی، کہیں پیسے اتنی کی بات کون کرتا ہے؟

مجسٹریٹ نے کہا کہ وہ ہر گز ممبروں سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ پچیس پچیس گز کی بھولی ہوئی گھیر دار شلواریں پہنے ہر گز ممبرانی اپنی گڑیاں سنبھال کر درمی پر بیٹھنے لگے۔ اُن کے پیچھے ان کے حوالی والی بھی لپکے آئے۔ مگر ریڈر نے نعرہ مارا، بھاگو، باقی سب یہاں سے۔

مجسٹریٹ پانچوں ہر گز ممبروں سے بحث کرنے لگا۔ چچا کدو نوں طرف دار یہ کہتے تھے، کہ چچا مہربان ہے، نیک آدمی ہے، اُسے لڑکی کی عزت اور قبیلے کے رواج کا لحاظ ہے۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ وہ ان کا جائز سر پرست ہے۔ لیہ وہ اگر اپنے بھانجے کی شادی لڑکی سے کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کو مان لینا

چاہیے۔ لڑکی بے وقوفی اور فساد کی وجہ سے ہٹ دھرمی کر رہی ہے۔ لیکن چچا پھر بھی سمجھ دیا ہے۔ اس نے اس کی ہٹ دھرمی کو ٹرنے کے لیے بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔ بلکہ اس کی خواہش کو قبول کرنے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ کوئی باہر تعلق ہو۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر وہ اس پنجابی سے شادی پر ہی مصر ہے۔ تو اس سے دُور لے لے اور بچے کو چچا کے پاس چھوڑ دے۔ اس طریق سے لڑکی کی اپنی مرضی کی شادی کی ضد بھی پوری ہو جاتی ہے۔ رواج کی دلدل والی بات بھی مانی جاتی ہے اور تچہ بھی خواری سے بچ جاتا ہے۔ اگر لڑکی کوئی بھی بات نہیں مانتی تو پھر چچا ساری عمر اس کو اپنے پاس اپنے گھر میں رکھنے کو تیار ہے۔ کیونکہ غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ چچا ساری عمر گھر بیٹھی رہے۔ مگر دُور کے بغیر شادی نہ کرے۔ مگر لڑکی کے حامی جرگہ والے کہتے تھے کہ ساری عمر کنواری رہ کر چچا کے پاس رہنا تو غلط ہے۔ آخر جوان لڑکی ہے۔ اس کو شادی کی ضرورت ہے۔ اُس کے بھی فطری تقاضے ہیں۔ بغیر شادی کے ان کو کیسے پورا کرے گی کل کلاں کو کہیں بھٹک جائے گی۔ تو پھر ادھر اپنی پیدا ہو گی۔ اب ایک نوجوان شادی کو بھی تیار ہے۔ اس کے بھائی کی مناسب تعلیم و تربیت کرنے کو بھی تیار ہے۔ اس طرح لڑکی اور بچے دونوں کی زندگی سنور جاتی ہے۔ چچا پر بھی بوجھ نہیں پڑتا۔ تو پھر چچا دُور پر کیوں اصرار کر کے روٹے اٹکاتا ہے۔ — ہم نے پوچھا تو لڑکا دُور دینے پر بھی رضامند ہو گیا تھا۔ مگر وہ دو چار سو روپے دیتا ہے اور چچا اصرار کرتا ہے کہ وہ تین ہزار سے کم نہ لے گا۔ آخر وہ کیسے اب تین ہزار روپے دے کر بعد میں بچے کی تعلیم پر بھی اخراجات کا

بوجھ اٹھا سکتا ہے۔

بحث جلتی رہی۔ بالآخر مجسٹریٹ نے سوچا کہ یہ رواج کا مسئلہ ہے قانون کی کوئی کتاب تو اسے حل نہیں کر سکتی۔ کیوں نہ دوسرے قبیلوں کے معتبر لوگوں سے بھی رائے لی جائے۔ شاید ان کے رواج کے حوالے سے کوئی حل نکل آئے چنانچہ اس نے اور لوگوں کو بھی بلوایا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ کیا قانونی سرپرست کی غیر موجودگی میں بالغ لڑکی کی رائے کوئی اہمیت رکھتی ہے یا نہیں؟

مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کیں۔ مگر کوئی فیصلہ کن بات نہ بن سکی بالآخر ایک بوڑھا قبائلی سردار اٹھا۔ وہ مقدمہ کے طرفین والے قبیلے کے مخالف قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ گڑی سر پر ٹھیک سے جھاتے ہوئے وہ بولا: صاحب کیوں اپنی جان ہکان کرتے ہو۔ اس میں لڑکی کا مسئلہ ہی نہیں، اصل قصہ تو سچے کا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کا باپ بہت امیر آدمی تھا اس کے پاس کافی جائیداد تھی۔ اس کی اراضی اب بھی پانچ چھ گادوں کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے۔ بانی بھی با اثر آدمی ہے۔ اور بلوچستان میں پانی تو سونے سے بھی مہنگا ہے۔ اس لیے سب لوگ اُسی جائیداد کے پیچھے ہیں۔ ان کے باپ کے مرنے پر چچا نے جائیداد پر قبضہ کرنا چاہا، تو ان کی ماں نے عیش نہ چلنے دی۔ پھر خد معلوم کس نے اس عورت کو قتل کر دیا۔ اب یہ لڑکی کچھ تیزی دکھا رہی ہے۔ خد معلوم اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ چھوٹا بچہ ہے، معصوم ہے، مگر ساری جائیداد کا تنہا وارث ہے اس

بیچارے کو تو توجہ بھی نہیں کہ اس کی فصلیں اتنے وسیع علاقے میں لہلہا رہی ہیں۔ اگر کسی نے بالغ ہونے دیا تو ٹراہو کر جائیداد سنبھال لے گا۔ مگر اس میں ابھی بارہ پندرہ سال ٹپڑے ہیں۔ اور اس عرصہ تک دوسرے ان زمینوں کے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور اس وقت کا حال کسے معلوم۔ یہ حال ابھی تو یہ لڑکی اس لیے قبیلے سے باہر جاتی ہے کہ بچے کو صاف نکال کر اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ پنجابی بھی محض جائیداد کے لیے شادی کر رہا ہے۔ ورنہ لڑکے کی تعلیم سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور چچا صرف اس لیے مخالفت کر رہا ہے کہ کسی طرح بچہ اس کے پاس رہ جائے۔ آپ نے کچھ کرنا ہے تو بچے کا سوچیں۔ لڑکی کو لگاؤ آگ۔“

... مجسٹریٹ کے دماغ سے جیسے پردہ ہٹ گیا۔ اس نے طرفین

سے پوچھا۔ مگر وہ تائید یا تردید کے بغیر اپنے پہلے دلائل دہرانے لگے۔ لڑکی بھائی کی محبت میں مری جا رہی تھی اور چچا غیرت پکار رہا تھا۔

مجسٹریٹ کافی دیر سوچتا رہا اور کہتا میں دیکھتا رہا۔ پھر اسے ایک تجویز سوجھی۔ اس نے خائف دوبارہ جہگے کے پاس بھیجی۔ اور حکم میں لکھا کہ جہگہ اس امکان پر غور کرے کہ اگر لڑکے کی جائیداد کا سرکاری سرپرست مقرر کر دیا جائے اور اس کی بلوغت تک جائیداد کی آمدنی جسک میں بچے کے نام جمع ہوتی رہے۔ دریں اثنا انھیں کچھ ماہانہ خرچ ملتا رہے۔ جہگہ غور کرے اور اپنی رپورٹ شوبیش کرے۔

مجسٹریٹ کی یہ تجویز سن کر لڑکی، چچا اور جہگہ غوروں کے منہ لٹک گئے

مگر کچھ کے بغیر واپس چلے گئے۔ اور غور کرنے لگے۔ معاملہ تین چار منہ تک جو کہ کے زیر غور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زیادہ ہی زیادہ الجھ رہا ہے مگر ایک دن صبح ہی صبح مجسٹریٹ کے سامنے فائل پیش کی گئی۔ جو کہ نمبروں کی رپورٹ متفقہ تھی کہ طرفین نے آپس میں بخیر و خوبی مصالحت کر لی ہے۔ اور راضی نامہ ہر سامنے کے بعد مزید کارروائی کی ضرورت نہیں۔ سائلہ اپنا استغاثہ واپس لیتی ہے۔ مسل جو کہ نمبر ان خود اٹھا کر لائے تھے۔

مجسٹریٹ نے رائے منظور کر لی۔ قلم سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگا۔ یہ کیا قصہ ہوا ہے؟

”خدا خبر صاحب، ایک عمر سوار بولا: اللہ نے ہدایت دے دی ہوگی۔ تو انہوں نے راضی نامہ کر لیا۔“

”پلیئے اچھا ہے صاحب“ بچا بولا، خدا بھی صلح صفائی کو پسند کرتا ہے۔ شہرے اُسے بھی نفرت ہے۔“

”تھیں راضی نامہ منظور ہے؟“ مجسٹریٹ نے لوگوں سے پوچھا۔

”ہو! سو آنے منظور ہے۔“

”شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے اس کی؟“ اس نے دستخط کرتے کرتے ویسے ہی ارد گرد والوں سے سوال پوچھا: میں شادی کروں گی ہی نہیں۔

— بس اپنے چچا کے پاس ہی رہوں گی۔ وہ لاڈ سے چچا کے قریب ہو گئی۔

دفتروالوں نے راضی نامہ منتفی کر کے ہیریں لگائیں اور مقدمہ خارج کر کے مسل ریکارڈ میں بھجوا دی۔

ایک دوام بعد بمبٹرٹ علاقے میں ایک متنازعہ موقع دیکھنے گیا وہاں پر شام کے وقت گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے اُسے ایک گاؤں میں پناہ لینا پڑی۔ رات ساری وہیں کاٹی۔ اگلے دن بہت سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی میں سے دیکھی دیکھی روشنی اندر چھن رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے بڑستی گئی۔ ایک دو ہوا کے جھونکے آئے۔ بمبٹرٹ کی طبیعت مہلی۔ اور وہ چٹری ہاتھ میں لے کر سیر کو چل دیا۔

گندم کی قدا و فصلیں ہلہل رہی تھیں، گندم پک رہی تھی۔ اور سبزنگ میں جیسے کسی نے کہیں کہیں سنہرے چھینٹے مار دیئے ہوں۔ خوشوں کی سہری مونچھیں جیسے تازہ کلف لگوا کر صبح کی تازگی میں ڈوبی تھیں اور جب ہوا کا جھونکا آتا، تو خوشوں کے بننے سے کھیت کی سطح پر خوشگوار لہریں دوڑنے لگتیں۔ ان کے درمیان پگڈنڈی پر درختوں کی قطاریں تھیں کہیں کہیں کار بڑکا شفاف پانی پتھروں کو کندھے مار کر ہلکی موسیقی پیدا کر رہا تھا بمبٹرٹ چٹری سے گندم کے پودوں کو پھیرتا ہوا ٹمے سرور میں آگے چل رہا تھا۔ اور صبح کی مفرح ہوا کے سانس لیتا ایک مکان کے قریب سے گزر رہا تھا۔

”کتنی اچھی فصل ہے۔“ اُس نے گندم کے بھرے بھرے خوشوں کو دیکھ کر کہا: کوئی قسمت والا کسان ہو گا۔ اتنے میں اسے ایک درخت کے پاس پگڈنڈی کے قریب ایک بچے کا پاؤں نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو باقی دھڑ فصل میں چھپا تھا۔ اس کے دماغ میں شرارہ سا لپکا کہ شاید کوئی بچہ قتل کیا گیا ہو یا بیٹریئے وغیرہ نے مار پھینک دیا ہے۔ — جھک کر وہ دیکھنے

لگا..... بچے میں کوئی حرکت نہ تھی اس نے ہلکے سے پھڑکی تھپوئی۔ تو وہ
 ہلڑا کراٹھ کھڑا ہوا، مجسٹریٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران ہوا
 کہ یہ اسی مقدمے والا بچہ تھا، جو عدالت میں پیش ہوا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا؟“

بچہ گرد بھری مٹیوں سے آنکھیں ملتا رہا۔ کافی دیر ایک طرف سونے
 سے اس کے ایک رخسار پر مٹی لٹھری تھی۔ اور سر میں گھاس کے تنکے اٹکے تھے
 مجسٹریٹ نے چکار کر کئی دفعہ پوچھا تو بولا ”سورہا تھا۔“

”گھر میں کیوں نہیں سوتے؟“ مجسٹریٹ نے اس کے رخسار سے گرد
 جھاڑی، بچہ خاموش رہا۔

”گھر میں کس کے پاس سوتے تھے؟“ اس نے پھر پوچھا۔ بچے کے لب
 بسور نے کھانڈاز میں ذرا سے کانچے کا نیچے اور وہ بولا، ”آپا کے بستر میں۔“
 ”اور آج نہیں سوئے وہاں؟“ بچے نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟“

وہ چپ رہا۔

”کیوں مارا ہے آپا نے؟“

بچے نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں بیٹا اب نہیں سویا کرتے آپا کے پاس؟“

بچہ ٹھنکا۔ نہیں

”کیوں؟“

”اب وہاں چچا.....“

رتنے میں فصل کے خوشیوں میں کوئی شیر اچھڑکا۔ اور نتیجہ بات پوری کیے
بغیر اس کی طرف پکا۔

ادب الیٹ



سعادت حسن منٹو

”منٹو نہ تو کسی کو شرم دلانا ہے نہ کسی کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے ، وہ قریبی طنز پر مسکراہٹ کے ساتھ انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دُور نہیں جا سکتے۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔“ محمد حسن عسکری

”منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، جھپٹا ہے، چکھا ہے۔ ادراپ وہ ایک تیز نشتر بن کر سراج کے ناسد ماورے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ ریاض چیتا ہے، چلاتا ہے، بہن کرتا ہے۔ منٹو کو پروا نہیں۔ وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔“ کرشن چندر

”منٹو آدم کی جرات گناہ کا ناکل ہے۔ منٹو کا انسان فوری ہے نہ تاری۔ وہ آدم خاکی ہے۔ وہ وجود خاکی جس میں بنیادی گناہ، فساد، قتل، خونِ غیر کے امکان کے باوجود، خدا نے فوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔“ ممتاز شیریں

اردو کے عظیم ترین افسانہ نگار کے چند اہم مجلدات:

غالی ہوتیں غالی ڈبے	چند	یزید
۲۶۵۰	۲۶۵۰	۲۵۵۰

البيان ، چوک انارکلی ، لاہور

شفیق الرحمن

”سارے نئے ادب میں بے دے کے ایک شفیق الرحمن میں جنہوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لالہ لالی پن، یہ غلٹی ہوئی جگمگاہٹ فیس انہی کا حصہ ہے۔“ محمد حسن عسکری

”شفیق الرحمن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ سرخاسرخ، نارنجی، یاقوتی، زعفرانی۔“

کرشن چندر

”شفیق الرحمن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت منداوب کے بانی ہیں۔“

ماہ نامہ، ادب لطیف

”شفیق الرحمن کی کہانیوں میں تکلف اور عجید گیاں نہیں ہوتیں، ان کے رومانی اور شگفتہ افسانوں میں بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے۔“

حجاب اقیاز علی

شفیق الرحمن کے ہنستے مسکراتے رومانی افسانوں کے چار نمبر ہیں:

کریش	شگوفے	مرد و جزر
۲۶۵۰	۲۶۵۰	۲۶۰۰
پچھتاوے		
۳۶۵۰		

البيان، چوک نارکلی، لاہور

اشفاق احمد

اشفاق احمد اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے۔ عصمت کے کردار عام طور پر جارحانہ قسم کی منفی محبت میں مبتلا رہتے ہیں جس کا انجام بڑا ہی اندوہناک ہوتا ہے۔ اشفاق کے کردار بڑی ہی نرم و نازک محبت کرتے ہیں مگر انجام اس کا بھی بڑا دردناک ہوتا ہے۔ عصمت کے ہاں محبت کے نشان گھونسے، لالچیں، چنگیاں اور ٹیکھی ٹیکھی چھو جانے والی باتیں ہوتی ہیں اور اشفاق کے ہاں ہلکے ہلکے لمس اور چھوٹی موٹی سی ادائیں، ننھے ننھے بوسے اور بڑی مٹھی مٹھی باتیں جیسے برقی کی ڈیاں۔ دونوں کے ہاں یہاں محبت ایک ہی ہے مگر اس میں طراب اندیلنے کا طریقہ ہر اگانہ ہے۔ عصمت چھلکاتی ہے، اشفاق ایک ایک قطرہ ڈال کر اُسے لبالب بھرتا ہے۔ اس کھیل میں دونوں کے ہام ٹوٹ جاتے ہیں اور یہیں افسوس ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں عصمت کے کردار ایسے خطرناک کھیل میں محتاط نہ رہے؟ کیوں ایسے خطرناک کھیل میں اشفاق کے کردار اتنے محتاط رہے جب کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ زیادہ احتیاط ہی اکثر شکست و ریخت کا موجب ہوتی ہے۔“

سعادت حسن منٹر

ایک محبت سوا فسانے

۲۶۷۵

البیان ، چمک انارکلی ، لاہور